The Drinched Book

text fiy book





فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۴ء

تصویر:- تقدیر کا چکر

چندہ سالانہ ۵؎ - ششماہی ۳؎ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸؎

بزمِ ہمایوں

ہمیں مسرت ہے کہ بہرۂ "بزمِ ہمایوں" کے احیا سے ناظرینِ "ہمایوں" میں اپنے رسالے کی اصلاح وترقی کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ ہر تجویز جو پیش کی جاتی ہے ہم سراپا سپاس ہوکر اسے سنتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ "ہمایوں" کو روز بروز زیادہ مفید زیادہ دلچسپ اور زیادہ دیدہ افروز بناتے چلے جائیں۔ مضامین کے تنوع کے متعلق جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں ان پر "ہمایوں" پہلے سے زیادہ عمل کرنے کو تیار ہے لیکن اس کے لئے اہلِ قلم کی اعانت بھی درکار ہے۔ اس کے علاوہ اگر "ہمایوں" کا ہر خریدار کم از کم ایک خریدار اور پیدا کردے تو ہم "ہمایوں" پر نئے اور مفید مصارف کا بار ڈالنے کے قابل بھی ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ نہ بھی ہو تو ہم اس رسالے کی ترقی کے لئے جو پنجاب میں اُردو کی ناچیز خدمات انجام دے رہا ہے اپنی سی کرتے ہی رہیں گے۔

"ہمایوں" کے مضامین کا معیار اور تنوع ماہ بماہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس مہینے سے اس کی کتابت اور کاغذ پر مزید مصارف برداشت کرکے معنوی محاسن کے ساتھ ظاہری محاسن میں بھی اور اضافہ کردیا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ناظرینِ ہمایوں توسیعِ اشاعت کے ذریعے سے ہماری کوششوں کے اعتراف کا ثبوت بہم پہنچائیں گے۔

مسٹر ہارون خاں شروانی ایم اے (آکسن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے "ہمایوں" کی ترقی کے متعلق بعض مفید تجاویز پیش کی ہیں ہم انہیں شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"ابھی اس وقت پیارا "ہمایوں" آیا۔ فوراً ورق گردانی کی اور خصوصیت کے ساتھ بزمِ ہمایوں کو پڑھا جس میں ناظرین سے تعاون چاہا گیا ہے۔ آپ کو خود معلوم ہے کہ میں "ہمایوں" کا خریدار نہیں تو کم سے کم اس کے مستقل پڑھنے والوں میں سے تو ہوں اور فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر مکمل جلدیں اس رسالے کی میرے پاس ہیں اس سے زیادہ کسی کے پاس نہیں ہوسکتیں۔ مجھے اس کی تجلید میں جو دقت پیش آتی ہے وہ فہرستِ مضامین کی ہے۔ اگر فہرست کا ورق جداگانہ ہو یعنی اس کی دوسری جانب معرا ہو تو تجلید کے وقت تمام فہرستیں یکجا کرکے ابتدا میں لگائی جاسکتی ہیں لیکن موجودہ صورت میں یہ ممکن نہیں اور کسی مضمون کو دوبارہ دیکھنے کے لئے ۵۰۰، ۶۰۰ صفحے اُلٹنے پڑتے ہیں۔ اگر اس کا انتظام ہوجائے تو ہمایوں کے افادی پہلو میں چار چاند لگ جائیں۔ دوسرے مناسب ہے کہ معارف کی طرح ایک فہرستِ مضامین اور ایک فہرستِ معاونین ادبی سال بسال بقیدِ صفحات نکالا کرے اور سالنامے کے ساتھ

تقسیم کر دی جایا کرے۔ تیسرے باوجود دل افروزی "ہمایوں" اکثر حالیات یعنی زمانۂ حال کے کیفیاتِ مدنی سے معرّا ہوتا ہے۔ ادبی اعتبار سے تو یہ کیا ہے لیکن ضرورت اب اس کی ہے کہ اس کے ایک جزو کو اس نوع کا کر دیا جائے یا جیسا فرانس کا ریویو دو دمونڈ ہے اور اس میں بلند پایہ نقادانہ تحریریں مختلف موضوعات پر درج کی جائیں۔ میں جناب رفیقی ساکن جزائر مشرق الہند ولندیزی کی رائے سے ایک حد تک متفق ہوں کہ سیاسیات کو شجرِ ممنوعہ نہ سمجھنا چاہئے لیکن ساتھ ہی "ہمایوں" کو فرقی سیاسیات (Party Politics) سے بے تعلق رہنا چاہئے۔ ورنہ خدانخواستہ اس میں سوقیانہ پن آ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے برعکس اگر سیاست دانوں اور ریاستوں کے نقادانہ جذبات کی ترجمانی ہو جیسے "نائنٹینتھ سنچری" میں ہوتی ہے تو یقیناً اس کے افادی پہلو میں اضافہ ہو جائے گا۔" ہارون

ذیل میں ہم "ہمایوں" کے ایک اور کرمفرما حضرت دیوانہ مصطفٰے آبادی کا خط شائع کرتے ہیں۔ ہم ان سب حضرات کے شکرگزار ہیں اور ان کی تجاویز پر حتے الامکان عمل کرتے ہیں لیکن پورا عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ "ہمایوں" کی اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہو جائے۔

"اگر "ہمایوں" کے لئے ہر ماہ ہندوستان کے کسی ایک ادیب شاعر یا رہنما کے خیالات ایک موضوع پر حاصل کرنے کا انتظام ہو جائے تو یہ بہت جاذبِ توجہ ہوگا۔ مثلاً ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو کے خیالات محبت، شاعری اور اسی قسم کے دیگر حسین عنوانات کے متعلق چونکہ ہمایوں کا معیار کافی بلند ہے اور وہ ادب کی خدمت کر رہا ہے نہ کہ بازاری لٹریچر مہیا کرتا ہے۔ اس لئے یہ حضرات جہاں تک میرا خیال ہے، بڑی خوشی سے اس التجا کو قبول کر لیں گے۔ اس طرح یہ سلسلۂ رنگیں کئی سال تک باعثِ دلچسپی بنا رہے گا اور ان حضرات کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔ "ہمایوں" کی نظمیں اور بعض مضامین پڑھتے وقت اس قدر متأثر ہو جاتا ہوں کہ شاید اتنا ان کے لکھنے والے بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ آپ نے خود ہی اسے ترقی دینے کے نہ معلوم کتنے منصوبے باندھ رکھے ہیں۔ اس حالت میں ناظرین کی رائے معلوم کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہی۔"

"افسانہ نمبر" کے لئے افسانے اس کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر فیصلہ کرنا ایک طویل کام ہے۔ اس لئے ہمارا خیال تھا کہ ستمبر میں "افسانہ نمبر" شائع ہو، تاکہ غور کے بعد انعام کا اعلان بھی اسی پرچے میں ہو جائے۔ لیکن چونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے اس لئے ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ آئندہ پرچہ ہی "افسانہ نمبر" ہو۔

جہاں نُما

کیڑے مکوڑے

(از برٹرینڈ رسل)

حشرات الارض کو تعداد کے لحاظ سے انسان پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک اور فوقیت اُنہیں یہ حاصل ہے کہ وہ ہماری خوراک اس سے قبل کہ وہ پک کر ہمارے کھانے کے قابل ہو ہڑپ کر سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جانبین کے سائنسدانوں نے اگر حشرات الارض اور جراثیم سے مدد لی تو بہت ممکن ہے کہ آخرکار واحد فاتح کیڑے مکوڑے اور جراثیم ہی رہ جائیں۔ برٹرینڈ رسل نے "ماڈرن تھنکر" میں حشرات الارض کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا ہے:۔

"جنگ اور جنگ کی افواہوں کے اس دور میں جب تحدید اسلحہ کی انجمنوں کی تند تقریریں نوع انسان کو بیش از بیش تباہیوں کی دھمکیاں دے رہی ہیں ہم ایک اور جنگ کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ میری مراد انسان اور حشرات الارض کی جنگ سے ہے۔

ہم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے کے خوگر ہیں۔ ہم اپنے وحشی آباؤ اجداد کی طرح اب جنگلی سؤر، ارنے بھینسے، چیتے یا شیر سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ اپنے ہم جنسوں کے سوا ہم ہر طرف سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اگر اب بڑے حیوانوں سے ہمیں خطرہ نہیں رہا تو چھوٹے حیوان ہمارے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن رہے ہیں۔

اس سے قبل بھی اسی زمین پر ایک دفعہ بڑے حیوانوں نے چھوٹے حیوانوں کے لئے جگہ خالی کی تھی۔ ہزارہا سال تک ڈونسر (ایک فیل نما حیوان جو اب مفقود ہے) اپنے ہمجنسوں کے سوا اور ہر خطرے سے آزاد نہایت اطمینان سے دلدل اور جنگل میں پڑا چرتا رہا لیکن آخر یہ حیوان فنا ہو گیا اور اس کی جگہ چھوٹی چوہیوں جنگلی چوہوں اور ننھے گھوڑوں وغیرہ نے لے لی جو قد میں چوہے سے کچھ ہی بڑے تھے۔ جب ان جانوروں کو غلبہ حاصل ہوا تو اُنھوں نے تن و توش میں بھی بڑھنا شروع کیا۔ ان حیوانوں میں سب سے بڑا میمث (اب مفقود ہو چکا ہے) اور باقی میں سے بھی صرف انسان اور اس کے پالتو جانور رہ گئے ہیں۔ انسان نے اپنی عقل سے باوجود بڑے قد و قامت کے اپنی ایک کثیر تعداد کے لئے خوراک بہم پہنچانے کا انتظام کر لیا ہے۔ انسان کیڑوں مکوڑوں اور جرثوموں کے علاوہ اور ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہے

تعداد کے لحاظ سے حشرات الارض کو ایک نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ایک چھوٹے سے جنگل ہی میں اتنی چیونٹیاں موجود ہو سکتی ہیں جتنی دُنیا میں انسانوں کی کل آبادی ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کو ایک اور فوقیت یہ حاصل ہے کہ وہ ہماری خوراک اس سے قبل کہ وہ پک کر ہمارے کھانے کے قابل ہو کھا لیتے ہیں۔ کئی موذی کیڑے جو پہلے بعض چھوٹے چھوٹے رقبوں تک محدود تھے انسان نے غیر ارادی طور پر دوسرے علاقوں میں پہنچا دیئے ہیں جہاں اُنہوں نے شدید تباہ کاری کا آغاز کر دیا ہے۔

خوش قسمتی سے سائنس نے اب ایسے طریقے دریافت کر لئے ہیں جن سے کیڑوں کی تباہ کاری کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض ایسے کرم دریافت ہو چکے ہیں جو دوسرے کیڑوں کا خون چُوس کر پلتے ہیں اور اُن کی تعداد کو اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ پھر اُن سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ علم الحشرات کے ماہر اس قسم کے کرموں کی نگہداشت اور پرورش کی کوشش میں مصروف ہیں۔

بدقسمتی سے جب تک نوع انسان میں باہمی جنگ کا سلسلہ جاری ہے ہر علمی انکشاف دو رُخی حیثیت رکھتا ہے۔ آئندہ جنگ عظیم میں فریقین کے سائینسدان ایک دوسرے کی فصلوں پر تباہ کار کیڑے چھوڑیں گے اور بہت ممکن ہے کہ صلح ہونے تک ان کیڑوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ پھر ان کا تباہ کرنا ناممکن ہو جائے۔ ہمارا علم ہمیں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے قابل بنا رہا ہے۔ اگر انسان نے باہمی غیظ و غضب کے اظہار کے لئے کیڑوں مکوڑوں سے مدد لینی شروع کی جیسا کہ آئندہ جنگ عظیم میں ضرور ہو گا تو گمان غالب ہے کہ آخری اور قطعی فتح صرف کیڑوں مکوڑوں کو حاصل ہو گی۔ وسیع کائناتی نقطۂ نظر سے تو شاید یہ معمولی بات ہو لیکن بحیثیت انسان کے میں اپنی جنس کی تباہی پر آہ بھرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مغربی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان

ایک معزز معاصر نے ذیل کے مقالے میں ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ متعلقہ ادارے اس کی آواز پر ضرور متوجہ ہوں گے:-

"آکسفورڈ، لنڈن اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے اور بڑے بڑے فاضل پروفیسر مقرر ہیں۔ برلن یونیورسٹی میں بھی اردو زبان نصاب میں داخل ہے لیکن وہاں اردو فارسی کی تعلیم کے لئے ایک ہی پروفیسر مقرر ہے۔ پہلے ایک پارسی پروفیسر مسٹر واچاریا کام کرتے تھے لیکن اب اُن کی جگہ پنڈت تاراچند رائے اُردو فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے ہیں لا اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والے حضرات کے لئے یہ بات قابل غور ہے" ہمایوں" ہمیں افسوس سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہاں اب تک "باغ و بہار" پڑھائی جاتی ہے اور ٹنڈل صاحب کی گرامر نصاب میں داخل ہے۔ بہتر ہو کہ انجمن ترقی اردو" اورنگ آباد۔ "دار المصنفین" اعظم گڈھ اور "جامعہ ملیہ" دہلی اپنی کتابوں اور مطبوعات کی ایک ایک جلد

مغربی یونیورسٹیوں کو بھیج دیں "باغ و بہار کی اُردو اب پُرانی ہو چکی ہے۔ متروک محاورات اور الفاظ کی تعلیم سے سلیس زبان حاصل نہیں ہو سکتی۔ توبتہ النصوح، آبِ حیات، نیرنگِ خیال اور مرأۃ العروس شُستہ زبان میں لکھی گئی ہیں اِن کو داخلِ نصاب کرکے مغربی یونیورسٹیاں ایک علمی زبان کی ترقی میں مدد دے سکتی ہیں"۔

اگر برلن وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں صرف باغ و بہار یا محض اس قسم کی اور پُرانی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو واقعی معاصر موصوف کی رائے بہت زیادہ توجہ کی محتاج ہے لیکن اگر نئی کتابوں کے ساتھ اس قسم کی پُرانی کتابیں نصاب میں داخل ہیں تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں بلکہ قدیم و جدید زبان و ادب کے مقابلے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ بہر حال ہمیں اُمید ہے کہ متعلقہ ادارے اس طرف متوجہ ہو کر مغربی یونیورسٹیوں کو اُردو کا نصاب تعلیم مقرر کرنے میں ہر طرح کی ضروری امداد بہم پہنچائیں گے۔

سینما کے ایکٹروں کی تنخواہیں

سینما کے پندرہ مشہور ایکٹروں کی تنخواہوں کے متعلق پہلی مرتبہ مسٹر سیموئل گولڈن نے صحیح اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ پڑھکر تعجب ہو لیکن میں نے اکثر چیکوں پر خود دستخط کئے ہیں۔ ذیل میں ہم چودہ مشہور ایکٹروں کے نام اور ان کی ہفتہ وار تنخواہیں درج کرتے ہیں جو امریکا کے ایک رسالے میں شائع ہوئی ہیں۔ سال چالیس ہفتوں کا شمار کیا جاتا ہے:۔

ولیم راجرز	۱۵۰۰ پونڈ	والس بیری	۱۰۰۰ پونڈ
مارس کیوبلیر	۱۵۰۰ پونڈ	ولیم پاول	۹۰۰ پونڈ
کانسٹینس بینیٹ	۱۵۰۰ پونڈ	جون کرافرڈ	۸۰۰ پونڈ
جان بیری مور	۱۳۰۰ پونڈ	جینٹ گینر	۷۵۰ پونڈ
نارما شیرر	۱۲۰۰ پونڈ	ایڈورڈ جی رابنسن	۶۰۰ پونڈ
رچرڈ بارتھلمس	۱۲۰۰ پونڈ	جیمز کیگنی	۵۶۰ پونڈ
این ہارڈنگ	۱۲۰۰ پونڈ	کلارک گیبل	۵۰۰ پونڈ

چہرے کے دو رُخوں میں اختلاف کی وجہ

ڈاکٹر وزروالف جرمن ماہر نفسیات نے انسانی چہرے کے متعلق بعض اہم انکشافات کئے ہیں۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کے لئے ہزارہا تصاویر کا مشاہدہ کیا ہے کہ انسان کے چہرے کے دو رُخ کیوں کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ اُن کا قول ہے کہ چہرے

کا ایک رُخ انسان کی موروثی سیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ اگر انسان کو اس کے حسب مرضی قدرتی نشوونما کا موقع دیا جائے تو اس کا چہرہ بیشتر اسی رُخ کا ہم شکل ہو۔

دوسرا رُخ انسان کی سیرت کے نشوونما پر تعلیم، آداب، کاروبار اور معاشری زندگی کے اثرات دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر والف نے انسان کی سیرت کے دونوں حصوں کے تجزیہ کا ایک آسان طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے چہرے کی پوری جسامت کی تصویر ناک کے وسطی خط سے نیچے کی طرف دو برابر حصّوں میں کاٹ لی جاتی ہے۔ بائیں رُخ کی دوبارہ اُلٹی تصویر لی جاتی ہے اور تصویر کے اصلی بائیں رُخ کے ساتھ ملا کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہ ایک پورے چہرے کی تصویر بن جاتی ہے جو یہ دکھاتی ہے کہ اگر اس چہرے کا دایاں رُخ بھی بائیں کا ہم شکل ہوتا تو چہرے کی صُورت کیا ہوتی۔

اسی طرح دائیں رُخ کی ایک ایسی ہی مرکب تصویر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اس چہرے کا بایاں رُخ دائیں رُخ کا ہم شکل ہوتا تو چہرے کی صُورت کس قدر نمایاں طور پر مختلف ہوتی۔

پی کے گھوش

(بنگال کا مشہور تیراک)

مسٹر پی کے گھوش نے تیراکی کے فن میں عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ حال میں انہوں نے کارنوالس سکیئر کے تالاب میں ہتھکڑی کے ساتھ مسلسل ۴۸ گھنٹے تک تیر کر اپنی شہرت میں اور اضافہ کر لیا ہے۔ جب مسٹر گھوش ۴۸ گھنٹے کے بعد پانی سے باہر نکلے تو وہ بالکل چاق و چوبند معلوم ہوتے تھے۔ اِن کے کمالِ فن نے انہیں اسقدر ہر دلعزیز بنا دیا ہے کہ جب وہ تالاب سے نکلے اس وقت تالاب کے چاروں کناروں کے گرد کم از کم بیس ہزار اشخاص کا ہجوم تھا۔

مسٹر گھوش کے لئے ۴۸ گھنٹہ تک تیرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ اس سے قبل رنگون کی جھیل کے ٹھنڈے پانی میں متواتر اسّی گھنٹے تک تیر چکے ہیں۔ ۴۸ گھنٹے کی میعاد محض تجربے کے طور پر مقرر کی گئی تھی۔ قیاس ہے کہ گھوش صاحب مستقبلِ قریب میں ہتھکڑی لگا کر پچاس گھنٹے یا اس سے زائد مُدت کے لئے تیر سکیں گے۔ ذیل میں ہم مختلف موقعوں پر مسٹر گھوش کے کارناموں کا ایک نقشہ درج کرتے ہیں:۔

سنہ ۱۹۲۱	۱۳ میل تیرے	(۲ گھنٹے ۱۰ منٹ)
سنہ ۱۹۲۸	۸۰ ۴ گز تیرے	(۴ منٹ ۴۹ سیکنڈ)
سنہ ۱۹۲۴	۱۳ میل تیرے	(۲ گھنٹے ۱۹ منٹ)



تقدیر کا چکر

سنہ ۱۹۲۴ء	۱۱۰ گز تیرے	(۱ منٹ ۹ سیکنڈ)
سنہ ۱۹۲۸ء	چٹاگانگ میں ۱۵ میل تیرے۔	
سنہ ۱۹۲۹ء	کلکتہ میں ۲۸ گھنٹے تک مسلسل تیرتے رہے۔	
سنہ ۱۹۳۰ء	کلکتہ میں ۴۶ گھنٹے ۱۰ منٹ تک مسلسل تیرتے رہے۔	
سنہ ۱۹۳۱ء	۶۶ گھنٹے ۱۸ منٹ	
سنہ ۱۹۳۳ء	۷۲ " ۱۸ منٹ	(کلکتہ)
سنہ ۱۹۳۳ء	۷۹ " ۲۴ منٹ	(رنگون)

تصویر

تقدیر کا چکر ۔ "تقدیر خدا کا قانون ہے اور اس کا نفاذ خدا ہی کی مرضی کے ماتحت ہوتا ہے۔"

اس گرانمایہ تصویر میں برن جونز نے فلسفۂ عامہ کے ایک قدیم ترین مقولے کو مصوّر کیا ہے۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو ایک پہیئے کی گردش سے تشبیہ دینے کا خیال نامعلوم زمانے سے مقبول چلا آتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے قدیم یونانی فلسفی (Phocylides ۵۵۰ سنہ قبل مسیح) نے اس تشبیہ کا آغاز اس وقت کیا جب اس نے ذیل کے الفاظ لکھے "دُکھ ہر شخص کیلئے مقدر ہے۔ زندگی ایک چکر ہے اور اچھے دن ہمیشہ قائم نہیں رہتے" اچھے دنوں کے بعد بُرے دن اور بُرے دنوں کے بعد اچھے دن آتے ہیں۔ قسمت کا یہ چکر ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کم از کم ایک آدھ مختصر لمحہ کے لئے اپنی زندگی کی معراج پر پہنچاتا ہے۔ تصویر میں تقدیر کی دیوی آہستہ آہستہ چکر گھما رہی ہے اور اس کے بے بس شکار تن بتقدیر پست و بلند دیکھ رہے ہیں۔ غلام اپنی "ساعتِ زرّیں" میں تاجدار بادشاہ کو پاؤں تلے روند رہا ہے۔ سب سے نیچے شاعر ہے اس کی آنکھوں میں چمک ہے اور دل میں بہتر زمانے کی اُمید۔ مبیح فرد اکے اس اولوالعزم پیغامبر کی تصویر مصوّر نے ایسی بدحال کیوں بنائی؛ یہ بات قابلِ غور ہے۔ برن جونز کی تصاویر میں تقدیر کا خاموش، اُداس لیکن باوقار پیکر ہمیشہ ہماری توجہ کو جذب کرتا ہے۔ یہی حال موجودہ تصویر کا ہے۔

اُردو ڈراما

(۲)

شیکسپیئر کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ وہ آسمانِ ڈرامہ کا آفتاب عالمتاب سمجھا جاتا ہے جس کی ضیا باریوں سے انگریزی ادب وشاعری کی زمین جگمگا اُٹھی ہے۔ اس کے روشن کارنامے ادب وشاعری کی دنیا میں بقائے دوام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ ہر شخص عزت واحترام کے ساتھ اس کا نام لیتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ اس کی ڈرامائی پیداوار پر اُردو مصنفین کی للچائی نگاہیں نہ پڑتیں۔ چنانچہ شیکسپیئر کے اکثر مشہور ومعروف ڈراموں مثلاً رومیو جولیٹ۔ ہملٹ۔ اوتھیلو۔ مرچنٹ آف وینس۔ کمیڈی آف ایررس۔ مڈسمر نائٹ ڈریم۔ ایز یو لائک اِٹ۔ ونٹرز ٹیل۔ لوز لیبرز لاسٹ اور ٹمپسٹ کو علی الترتیب گلنار فیروز۔ خونِ ناحق۔ جعفر۔ وینس کا سوداگر۔ بھول بھلیاں۔ جامِ اُلفت۔ دلپذیر۔ مرید شک۔ "یاروں کی محنت برباد" اور "تیر نگاہ" کے نام سے اُردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کے یہ ڈرامے شیکسپیئر کے شاہکار کے ترجمے ہیں جس زبان میں شیکسپیئر جیسے باکمال اور یگانۂ روزگار ڈرامہ نویس کے ادبی جواہر پارے اس کثرت سے منتقل ہوچکے ہوں اس کے ڈرامائی لٹریچر کو کون شخص پست وحقیر قرار دے سکتا ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گھٹیا مال کو ترجمہ کہنا لفظ ترجمہ کی توہین ہے۔ پروفیسر آر۔ کے۔ یاجنک کا خیال بہت صحیح ہے کہ اُردو کے کوی (شاعر) انگریزی زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے۔ شیکسپیئر کی ادبی خوبیوں اور فنی باریکیوں تک ان کی ذہنی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ شیکسپیئر کے ڈرامائی قصہ کو کسی سے پڑھوا کر سُن لیتے ہیں۔ پھر اشخاصِ قصہ اور مقامات کے نام بدل کر اور واقعات، حادثات، معاملات اور مواقع میں حسب مرضی ردّوبدل، ترمیم واضافہ، کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرکے اسے اپنے پست مذاق کے مطابق بنا لیتے ہیں اور تیسرے درجہ کے تماشائیوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی گھٹیا ڈرامائی پیداوار میں جابجا بے معنی گانے داخل کردیتے ہیں۔ جو بالعموم محض تک بندی پر مبنی ہوتے ہیں اور مخش کامک (مزاحیہ) کا اضافہ بھی کردیتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا اردو ڈرامے اسی قسم کے ناجائز تصرفات کا نتیجہ ہیں۔ ان پر نہ ترجمہ کا اطلاق ہوسکتا ہے نہ آزادانہ تالیف وتصنیف کا۔ شیکسپیئر سے ان کا تعلق صرف اس قدر ہے کہ ان کے قصے شیکسپیئر کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ ورنہ شیکسپیئر کے ڈراموں میں فطرت بشری کی شناسی ودیر شناسی کے جو شواہد پائے جاتے ہیں ان کا اردو ڈراموں میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ ادبی لطافتوں اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے

انگریزی اور اُردو ڈراموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکسپیر۔ مارلو۔ بیومونٹ اور فلچر کے ڈراموں کو دُنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں بی۔اے اور ایم اے کے نصاب میں شریک کرتی ہیں لیکن اردو ڈراموں کا داخل نصاب ہونا تو ایک طرف کوئی سنجیدہ شخص ان کے مطالعہ کی بھی زحمت برداشت نہیں کرتا اور نہ وہ کسی کتب خانہ کی زینت بنتی ہیں۔

بہرحال تھئیٹریکل کمپنیاں اُردو کے جونام نہاد ڈرامے تمثیل کرتی ہیں وہ ماہرین فن کے نزدیک نہ ادبی لحاظ سے اور نہ فنی اعتبار سے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں بے شمار نحوی و عروضی اسقام پائے جاتے ہیں۔ ان کے گانے بالکل مہمل اور تک بندی پر مبنی ہوتے ہیں۔ سُریلی دُھنوں پر معنی کو قُربان کر دیا جاتا ہے۔ اُردو کے ڈرامہ نویس بالعموم فن ڈراما کے اصول و نکات سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ان کے ڈراموں میں پلاٹ کی پیچیدگی، اُلجھاؤ اور دلچسپی مفقود ہوتی ہے۔ کردار نگاری کا عنصر معدوم ہوتا ہے۔ مکالمے بالعموم بیت بازی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ظرافت اور شوخی کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے جا ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے نہ معاملات زندگی نہ مسائل حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ کھیل دیکھتے چلے جائیے۔ ایک منظر سے دوسرا منظر دلفریب معلوم ہوگا لیکن آخر میں سوچیے کہ کیا دیکھا تو مقصد کا کچھ پتہ معلوم نہ ہوگا۔ غرضکہ اردو ڈرامے محض تفریح و تفنن کی چیزیں ہیں۔ ان کی گرم بازاری کا مدار زیادہ تر زرق برق لباس، مناظر کی دلکشی، ڈوم ڈھاڑیوں کے ناچ گانے اور مخش و سوقیانہ مذاق پر ہوتا ہے۔ اُردو کا ایک ڈراما بھی ایسا نہ ملے گا جسے ناٹکی دُنیا نے مستند تسلیم کیا ہو۔

اُردو ڈراموں کی یہ دُرگت دیکھکر بعض مسلم الثبوت ادیبوں اور اعلےٰ تعلیم یافتہ مصنفوں کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور اُنھوں نے کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد پیش نظر رکھکر ناٹک نگاری کی طرف توجہ فرمائی۔ اردو کے مشہور عالموں اور کہنہ مشق ادیبوں کے لکھے ہوئے ڈراموں میں سے حسب ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :۔

نام تصنیف یا ترجمہ	نام مصنف یا مترجم
۱۔ شہیدِ وفا	مولانا عبدالحلیم صاحب شرر
۲۔ رشید اور مبینہ	منشی احمد علی صاحب شوق
۳۔ معشوقۂ فرنگ	منشی جوالا پرشاد صاحب برق بی۔اے
۴۔ زود پشیماں	مولوی عبدالماجد صاحب بی۔اے
۵۔ ترجمہ وکرم اروسی	مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔اے
۶۔ جنگ روس و جاپان	مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔اے
۷۔ برہمانڈ	جسٹس کنور سین صاحب ایم۔اے

۸۔ راج دُلاری — پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب

۹۔ ترجمہ جولیس سیزر — منشی تفضل حسین صاحب

۱۰۔ انارکلی — میر امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے

۱۱۔ جانِ ظرافت (ترجمہ مولیئر لینگ)
۱۲۔ قزاق (ترجمہ شلر)
۱۳۔ ظفر کی موت (ترجمہ میٹرلنک)
} محمد عمر و نور الٰہی صاحبان

۱۴۔ نرگس جمال (ترجمہ میٹرلنک) — مولوی شاہد احمد صاحب بی۔اے

ان تصنیفات وتراجم کی ادبی خوبیوں کے کیا کہنے۔ خلوت میں بیٹھکر ان کا مطالعہ کیجئے صفحے صفحے پر معجز بیانی کے نمونے اور جملے جملے میں قادر الکلامی کے کرشمے نظر آئیں گے۔ زبان کی صحت وسلاست، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی، اندازِ بیان کی دلکشی، مقصد کی بلندی، لب ولہجہ کی متانت، مذاق کی شائستگی قدم قدم پر آپ سے باجِ تحسین وصول کرلے گی۔ شاید ہی کوئی قصہ، کوئی تاریخ، کوئی افسانہ لطف ودلکشی میں ان تصنیفات کی ہمسری کا دعوےٰ کرسکے۔ غرضکہ ہر تصنیف دستارِ ادب کا طرّہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عروسِ اسٹیج کا گیسو ان شانوں کا منت پذیر ہؤا ہے یا ہوسکتا ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ ان میں سے اکثر ڈرامے تو ایسے ہیں جو اپنی طوالت، نثریت، سکون وجمود اور فلسفیانہ مسائل کی وجہ سے کبھی اسٹیج کے شرمندۂ احسان ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ بعض صرف امچیور (شوقیہ) کلبوں میں تمثیل کئے جاسکتے ہیں لیکن عام تماشاگاہ میں ان کی نمائش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی سبب ہے کہ آج تک کسی تجارتی کمپنی نے ان کی طرف رُخ نہیں کیا ہے۔
دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ادبی پیداوار تنہائی میں خاموش مطالعہ کی چیز ہو اور پبلک میں اداکاری کے ذریعے جس کی تمثیل ونمائش ممکن نہ ہو اسے ڈراما کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ آج کل مغربی ممالک میں یہ ایک متنازع فیہ مسئلہ بن گیا ہے لیکن دُنیا کی قدیم وجدید تاریخ ادبیات شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں ڈراما اور اسٹیج کے مابین چولی دامن کا ساتھ رہا کیا ہے۔ فنِ ڈراما کے موجدوں نے خواہ ان کا تعلق سنسکرت لٹریچر سے ہو یا یونانی ولاطینی ادبیات سے ناٹک کو اسٹیج پر دکھانے کا یہ مدعا قرار دیا ہے کہ تفریح انگیز ہنسی کھیل کے پردے میں لوگوں کو تلقین کی جائے اور تماشائیوں کے جذبات کو متاثر کرکے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح کا کام لیا جائے۔ غرضکہ ایکٹر، اسٹیج اور تماشائی کا تصور ڈراما کے تصور کا جزو لاینفک ہے جو ادبی پیداوار مثل تماشاگاہ اور عوام سے بے نیاز ہوکر محض خاموش خلوتی مطالعہ کی متقاضی ہو اس کا شمار ڈرامے میں نہیں بلکہ ناول، تاریخ، افسانہ یا کسی اور ادبی صنف میں ہونا چاہئے۔ ناول کا طرزِ بیان متکلمانہ بھی ہوتا ہے اور راویانہ بھی۔ لیکن ناٹک کا اندازِ بیان سربسر مکالمے کے

رنگ میں ہوتا ہے پس جس ناٹکی تصنیف کی اسٹیج پر نمائش نہ ہو سکے وہ ایک قسم کا ناول ہے جسے ہم راویانہ ناول کے بجائے متکلمانہ ناول کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی ماہیت و نوعیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

دُنیا میں جتنے نامور اور باکمال ڈرامہ نویس گذرے ہیں مثلاً کالیداس۔ بھاوبھوتی۔ ایسی کائی لس۔ سوفاکلیز۔ سینیکا ارسطو۔ شکسپیئر۔ ملٹن۔ ریسائن۔ مولیئر سب نے ڈرامے اسی غرض سے لکھے تھے کہ پبلک کے سامنے اسٹیج پر ان کی نمائش کی جائے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کی ڈرامائی تصنیف کا محض ادبی حیثیت سے ناول یا شاعری کی طرح گوشۂ عزلت میں بیٹھکر خاموشی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔ البتہ مغربی ممالک میں آج کل نقادوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جس میں سر انڈنبرگ، مٹر گیک میٹرلنک۔ ڈاکٹر اسپنگارن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ چونکہ ڈراما ادبیات کی ایک اہم شاخ ہے اس لئے کسی ناٹکی تصنیف پر تنقید کرتے وقت ہمیں تماشائیوں کے ہجوم، تھئیٹر کی عالیشان عمارت، مناظر کی دلفریبی، پردوں کی رنگینی، ایکٹروں کی اداکاری، سنگت کی سامعہ نوازی، رقص و سرود کی اثر آفرینی اور دوسرے تمام خارجی امُور سے بےتعلق ہوکر محض ادبی اصُول پر اس کے معائب و محاسن جانچنے چاہئیں۔ اسٹیج کا مقصد نظر فریبی (ایلیوژن) پیدا کرنا ہے تاکہ نقل پر اصل کا گمان ہو۔ قدیم زمانہ میں یہ کام تماشائیوں کا تخیّل انجام دیتا تھا۔ سنسکرت کے ناٹک ایک معمولی تمبو تان کر دکھائے جاتے تھے۔ گھنے جنگل کے تصوّر کے لئے اسٹیج پر چند سبز ٹہنیاں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ جب تخیّل کی مدد سے چند سادہ وسائل کے ذریعے مقصد پورا ہو جائے تو بیش بہا اور بھاری بھرکم سازوسامان کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرامے بغیر تھئیٹر کی تعمیر کے کھُلے میدان میں کیوں نہ دکھائے جائیں؛ یا تماشا گاہ کو تمام تکلفات و تصنّعات سے کیوں نہ آزاد کر دیا جائے؛ لیکن مخالف جماعت کا قول ہے کہ تہذیب و تمدّن کی ترقی کا اقتضا ہے کہ ہم دورِ حاضرہ کی ایجادات و اختراعات سے استفادہ کریں۔ تن پوشی کے لئے کمل، شدایدِ موسمی سے محفوظ رہنے کے لئے جھونپڑا۔ پیٹ بھرنے کے لئے کند مُول اور سواری کے لئے بیل گاڑی کافی ہے تو کیا ہمیں نفیس کپڑے پہننا، خوشنما بنگلہ میں رہنا۔ لذیذ غذا کھانا اور موٹر پر سوار ہونا ترک کر دینا چاہیئے؛ اسٹیج کا مقصد نظر فریبی پیدا کرنا ہے۔ مانا کہ تخیّل کی مدد سے بھی یہ مقصد کسی حد تک پُورا ہو سکتا ہے لیکن نقل میں اصل کی پُوری شان پیدا کرنے اور نظر فریبی کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لئے اگر موجُودہ دَور کی ترقی یافتہ صناعی کے بہترین نتائج سے کام لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؛ فرض کرو کہ سین سینری کی حیثیت محض ایک خادم کی سی ہے اور ڈرامہ بمنزلہ آقا کے ہے لیکن کیا خادم سے کام لینا مالک کے اپاہج ہونے کی دلیل ہے؛ ڈراما نہ کبھی اسٹیج سے بےنیاز ہُوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے میں ڈرامے کی خصوصیات اسٹیج کے حالات و ضروریات کی تابع رہا کی ہیں۔ ایتھنیہ کے وسیع تھئیٹر کا یونانی ٹریجیڈی (المیہ) پر اور عہدِ الزبتھ کے اسٹیج کا شکسپیئر کے ڈراموں پر جو اثر پڑا وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

بہرحال بحث صرف اسٹیج کی سادگی یا تکلف کے متعلق ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ اسٹیج کا مخالف ہو یا مؤید اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ ڈراما عوام یا خواص کی جماعت کے سامنے ایکٹ کرنے کی چیز ہے۔ کوئی ناٹکی تصنیف ادبی نقطۂ نظر سے کتنی ہی گرانمایہ کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ اسٹیج کو پس پشت ڈال کر لکھی گئی ہو اور اس میں پبلک کے سامنے تمثیل کئے جانے کی صلاحیت نہ پائی جائے تو اس کا شمار ڈراموں میں نہیں بلکہ ناول، افسانہ یا کسی دوسری صنف ادب میں ہونا چاہئے۔ اسے اردو زبان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بے شمار ڈرامے جو اسٹیج پر نہایت کامیاب ثابت ہوئے اور جن کے ذریعہ سے تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں نے لاکھوں روپے کمائے وہ ادبی اور فنی لحاظ سے بالکل ناقص ہیں اور ملک کے بہترین ادیبوں نے تالیف و ترجمہ کے ذریعے ڈرامے کے رنگ میں جو کتابیں پیش کی ہیں وہ اپنی ادبی و لسانی خوبیوں کے باوجود عروس اسٹیج کی تزئین کا کام نہیں دے سکتیں اس لئے وہ ڈرامے کی فہرست ہی سے خارج کردیئے جانے کے لائق سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ڈرامے مثلاً روح سیاست۔ جان ظرافت، قزاق، بگڑے دل، ظفر کی موت وغیرہ اسکولوں، کالجوں اور امیچور (شوقیہ) کلبوں میں ایکٹ کئے جاسکتے ہیں لیکن ملک کے عام و وسیع تھیئٹروں میں ان کی تمثیل نگاری کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ غرضکہ اردو میں ایک ڈرامہ بھی ایسا نہیں ہے جو ادبی و فنی خوبیوں کا بھی حامل ہو اور پبلک اسٹیج پر بھی کامیاب ثابت ہوا ہو۔ جسے دُنیائے ڈراما نے مستند تسلیم کیا ہو اور جسے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں جو باکمال ڈراما نویس گزرے ہیں وہ نامور ایکٹر بھی تھے۔ کون نہیں جانتا کہ شیکسپیئر اگر آسمان ڈراما کا آفتاب تھا تو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ایکٹر بھی تھا۔ ممالک متمدنہ میں موسیقی۔ رقص اور اداکاری کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں مہارت پیدا کرنا معیوب نہیں بلکہ موجب فخر خیال کیا جاتا ہے۔ ہندی روایات بھی ان فنون کی قدردانی کی مؤید ہیں۔ قدیم تاریخ ہند کے مطالعہ سے واضح ہے کہ شاہی خاندان کی لڑکیوں کو بھی رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں اعلےٰ طبقہ کے مرد اور عورت آزادی سے اسٹیج پر آکر ایکٹ کرتے تھے۔ البتہ اسلامی حکومت کے زمانہ میں جب ہندی ڈرامے پر زوال آگیا تو شرفاء اور علماء نے ناٹکوں میں حصہ لینا ترک کردیا اور رذیلوں نے ایکٹری کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اور گاؤں گاؤں پھر کر یاترا۔ رس دھاری۔ رام لیلا۔ رہس۔ بھان وغیرہ کے معمولی تماشے دکھانے لگے۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی تسلط کے بعد جب انگریز عہدہ داروں۔ تاجروں اور پادریوں نے تفریح طبع کے لئے یوروپی وضع کا شوقیہ تھیئٹر قائم کیا اور بنگالی زمینداروں اور امیروں کو شرکت کی دعوت دی تو لوگوں کو کالیداس اور بھاؤبھوتی کے زمانہ کی بھولی بسری باتیں یاد آگئیں اور رفتہ رفتہ بنگالی تھیئٹر بھی قائم ہوگئے۔ اسی طرح بمبئی کے انگریزوں کے اثر سے مغربی ہند میں مرہٹی اسٹیج معرض وجود میں آئے۔ بنگال اور مہاراشٹر کے اعلےٰ تعلیم یافتہ حضرات جن میں جج، بیرسٹر، ڈپٹی کلکٹر، پروفیسر شامل تھے، بڑے شوق سے تماشوں میں عملی حصہ لینے

لگے۔ بڑے بڑے نامور ادیب اور اہلِ قلم مثلاً دوجیندر لال رائے۔ مدھوسودن دت۔ شیشیر بہادر۔ بھزر چٹوپادھیا نے یورپ کا سفر
کرکے فن ڈراما کے اصول ونکات اسٹیج کے لوازم۔ اداکاری کے گُر اور سین سینری اور پردہ ہٹنے کی باریکیوں سے عملی طور
پر واقفیت حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اعلےٰ تعلیمیافتہ لوگ فنی تربیت پانے کے بعد ڈرامہ کی جو کتاب لکھیں گے وہ ہر لحاظ سے
قابلِ قدر ہوگی چنانچہ بنگالی اور مرہٹی زبان میں ایسے ناٹکوں کی کمی نہیں جو بہترین انگریزی ڈراموں کے پہلو بہ پہلو جگہ پاسکیں۔

لیکن ہماری سوسائٹی میں گانا بجانا۔ ناچنا۔ تھرکنا۔ بھاؤ بتانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ چیزیں ڈرامے کے
لوازم میں شامل ہیں۔ رقص وسرود کی محفل میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا اور پیشہ ور مغنیوں اور رقاصوں کے فنی کمالات سے لطف اندوز
ہونا اور بات ہے لیکن کوئی شریف آدمی پبلک کے سامنے ان فنونِ لطیفہ میں خود کوئی عملی حصّہ نہیں لے سکتا۔ ایکٹنگ یا اداکاری بھی
مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ ہمارے ہاں کے شرفا خود ایکٹ کرنا تو درکنار تھیٹر میں جانا اور ناٹک کے کھیل دیکھنا بھی اپنی
ثقاہت ومتانت کے منافی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے مصنفین کو اداکاری کے رموز ونکات، اسٹیج کی ضروریات اور ڈرامے
کی فنی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے کما حقہٗ ذاتی واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ڈراما خاموش مطالعہ کیلئے نہیں بلکہ پبلک کے
سامنے تمثیل کرنے کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔ ڈرامے کا نام سنتے ہی ایک کثیر مجمع کا تصوّر ذہن میں آجاتا ہے۔ کثیر مجمع کے سننے
کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایکٹر بلند آواز سے بولیں۔ لیکن معمولی نثری گفتگو کے موقع پر چیخ چیخ کر بولنا بالکل غیرفطری اور مضحکہ خیز
معلوم ہوگا۔ اسلئے ضروریات اسٹیج کو مدنظر رکھکر ہر ملک کے نامور ڈرامہ نویسوں نے اپنی ناٹکی تصنیفات میں جابجا نظم، اشعار اور گانے
کو جگہ دی ہے اور زوردار فصیح اور مقفّیٰ عبارتیں استعمال کی ہیں تاکہ ایکٹروں کو اپنی آواز کھینچنے اور بلند کرنے کا موقع ملے اور وہ
بے محل اور مصنوعی بھی معلوم نہ ہو۔ ڈرامے میں اشعار کا ادخال محض لطف ودلچسپی پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ تماشا گاہ کی وسعت
اور مجمع کی کثرت کا بھی مقتضا ہے۔ چونکہ مجمع میں خواص کی تعداد قلیل اور عوام کی تعداد کثیر ہوتی ہے اسلئے ڈرامہ نویس کو فلسفیانہ
وحکیمانہ مضامین پر بحث نہیں کرنی نہیں چاہئے۔ میٹرلنک اور برنارڈ شا کے متعدد ڈرامے اپنے باریک ودقیق نفسیاتی مباحث
کی وجہ سے اسٹیج پر بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور کے بعض ناٹک بھی اپنی ادبی خوبیوں کے باوجود اسٹیج ہونے کی اہلیت
نہیں رکھتے۔ لہٰذا ڈراما نویس کو خصوصی مباحث ترک کرکے عوام کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھنا اور انسان کے سادہ وبسیط جذبات کو برانگیختہ
کرنا چاہئے۔ چونکہ ایکٹروں کو ایک تنگ ومحدود چبوترہ پر کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں جنگ و جدال۔ فساد وہنگامہ۔ بلوہ اور گولہ وغیرہ
کی ٹھیک طور پر نمائش نہیں ہوسکتی۔ اسلئے اسٹیج پر ان کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ قدیم ہندی اور یونانی ڈرامہ نویس ان باتوں
کو کسی ایکٹر سے زبانی بیان کرادیتے تھے۔ کبھی کبھی اُردو اسٹیج پر متحاربین کے صرف تین تین یا چار چار آدمی تلوار ہلاتے اور
طبلہ کی تھاپ پر تھرکتے اور پینترے بدلتے نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کاٹھ کی پُتلیاں ہندی گتوں پر ناچ رہی ہیں۔ ان کی ہر

حرکت سے تصنع کا اظہار ہوتا ہے اور اسٹیج کی نظر فریبی (الیوژن) کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ ایکٹروں سے ایسی چیز کی نقل کرانا جس میں اصل کی ذراسی جھلک بھی نظر نہ آئے فنِ ڈراما کے سخت منافی ہے۔ جب ڈراما اور مجمع لازم و ملزوم ہیں تو ڈراما نویس کو تماشائیوں کی جسمانی سہولتوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ تماشا کیسا ہی دلچسپ ہو لیکن انسان بہت دیر تک ایک ہی کل بیٹھے بیٹھے ضرور اکتا جائیگا۔ ناول کی طرح ڈراما کو بہت ضخیم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسکی تمثیل و نمائش دو تین گھنٹے میں ختم ہو جانی چاہیے۔

افسوس ہے کہ ہمارے باکمال ادیبوں نے اپنے ڈراموں کی تصنیف میں ان امور کا لحاظ نہیں رکھا ہے بلکہ ضروریاتِ اسٹیج کو پس پشت ڈال کر ڈرامے کے نام سے اپنے ادبی کارنامے پیش کئے ہیں۔ جب انہوں نے پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے ملازم منشیوں کو اردو زبان کے گلے پر کند چھری پھیرتے دیکھا تو ان کی غیرت و حمیت جوش میں آئی اور محض ادب و زبان کی اصلاح کیلئے انہوں نے اسٹیج نہ ہونے والے ڈرامے لکھ دیئے۔ لیلائے ادب کا گیسو تو سنور گیا لیکن عروس اسٹیج کی زلف بکھری کی بکھری رہ گئی۔ ڈرامے کے لئے اسٹیج ہونے کی اہلیت لازمی شرط ہے۔ بعض امریکی نقاد تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ڈراما ادبیات کی ایک شاخ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف فنون مثلاً موسیقی، رقص، رنگ کاری، نطقیات (ایلوکیوشن)، انتظام لباس و پوشاک (کسٹیومنگ)، اہتمام روشنی وغیرہ کی آمیزش سے ڈراما وجود پذیر ہوتا ہے۔ جبتک کوئی شخص ان فنون میں مہارت حاصل نہ کرلے اس وقت تک وہ کوئی اچھا ڈراما تیار نہیں کر سکتا۔ ان نقادوں نے ڈرامے کی ادبی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا ہے لیکن ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے غلو سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے انہیں چند ڈراموں کو عظمت، شہرت، شاہکارانہ حیثیت اور بقائے دوام حاصل ہے جو اعلےٰ ادبی محاسن کے حامل ہیں۔ تاہم ہمارے باکمال اہل قلم کو جاننا چاہیے کہ ڈرامانویسی میں محض ادب، شاعری اور فضیلت و تخیل سے کام نہیں چل سکتا۔ فن ڈراما کے خاص اصول و ضوابط ہیں جن پر عبور حاصل کرنے کیلئے بھرت کی "نٹ شاستر" سے لے کر موجودہ زمانہ کے مغربی ڈرامائی لٹریچر تک کے بالاستیعاب مطالعہ کی ضرورت ہے۔ تخیل سے زیادہ حقیقت پر زور دینا چاہیے اگر قصہ کے واقعات تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہوں تو ڈرامے میں حقیقت کی پوری شان پیدا ہو سکتی ہے۔ شاعر اور ناول نویس کی طرح ڈرامانگار کا "الہام" (انسپیریشن) بھی انسان کی حقیقی زندگی سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فطرتِ بشری کا نباض و رمز شناس نہ ہو وہ کبھی کامیاب ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ علاوہ بریں ڈرامہ نویس کو تجسس، حیرت انگیز انتظار، کشمکش، حرکت و دلچسپی اور انتہائی سنسنی پیدا کرنے کے گر، اداکاری کے نکات، اسٹیج کی اصطلاحات و ضروریات اور تھیٹر کے دوسرے خارجی لوازم سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے باکمال ادیبوں کے لکھے ہوئے ڈراموں کی ناکامی کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ ایکٹنگ اور سٹیجنگ سے ناواقف ہیں اور ان کی ناٹکی تصنیفات میں ڈرامیت کا عنصر مفقود یا پست ہے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آخر اردو ڈرامے کی اصلاح و ترقی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور اُن کی اُلش خوار مقامی کمپنیوں کو صرف روپیہ پیدا کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ وہ صرف ایسے ڈرامے اسٹیج کرتی یا اپنے منشیوں سے لکھواتی ہیں جن میں عوام کے پست اور سوقیانہ مذاق و پسند کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب کمال اصولِ فن اور اعلےٰ مذاق کے مطابق خاصہ کی چیز تیار بھی کرے تو تجارتی کمپنیوں کو اس کی قدر نہ ہوگی اور خسارہ کے خوف سے وہ اسکو اسٹیج کرنے سے انکار کردیں گی۔ اصلاحی تدابیر پر غور کرنے سے قبل بلادِ مغرب کے تھیٹر پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں مغربی ممالک کے تھیٹر کی حالت بہت گر گئی تھی۔ تھیٹر کے مالک کاروباری آدمی تھے جن کو صرف مالی منافع کی فکر تھی۔ وہ عوام کے پست مذاق سے واقف تھے اور انہیں کے پسند کے مطابق تماشے دکھاتے تھے۔ پبلک زرق برق لباس۔ نظر فریب مناظر۔ دلکش گانوں۔ بازاری مسخرے پن۔ فحش نقالی۔ ظاہری طمطراق اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کی دلدادہ تھی۔ مالکانِ تھیٹر انہیں چیزوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور ان کو اچھے ڈراموں کی کوئی قدر نہ تھی۔ حقیقت کی جگہ تصنّع اور سیمیا نے لے لی تھی۔ اشخاصِ ڈراما کو حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ ان کا ہر قول، فعل اور ہنسنا بولنا، رونا دھونا، چلنا پھرنا مصنوعی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ اور بہت سی بُرائیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں انگلستان میں باکمال ڈراما نویسوں کا کوئی سرپرست یا قدردان نہ تھا۔ اس لئے اچھے ڈراموں کی پیدائش ہی رک گئی تھی۔ دولتمند تھیٹر کے منیجر بالعموم نیویارک کا سفر اختیار کرتے تھے اور وہاں جن چیزوں کو مقبول اور کامیاب پاتے تھے اُنہیں کی انگلستان واپس آکر اپنے اسٹیج پر نمائش کرتے تھے۔ ان منیجروں کو اچھے اور بُرے ڈراموں میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت نہ تھی۔ جو چیزیں وہ امریکہ سے لاتے تھے وہ ادنیٰ درجہ کے فرانسیسی کھیل کے ترجمے۔ مبتذل مزاحیہ۔ سنسنی پیدا کرنیوالے میلوڈرامے یا جرائم کے متعلق تفتیشی قصے یا انگوٹھی کا راز یا پوشیدہ خزانہ کی قسم سے ہوتی تھیں۔ بعض نئے ڈرامے لکھے بھی جاتے تھے تو "ایکٹر منیجر سسٹم" یا "اسٹار سسٹم" پر یعنی بعض تھیٹر کمپنیوں کے مہتمم ڈرامے میں خاص پارٹ لینے کے شائق تھے۔ بیچارے اُجرت یاب ڈراما نویس کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ وہ مہتمم کے مذاق و دلچسپی کے مطابق ڈرامے میں کوئی خاص کردار پیدا کرے اور اس کے پارٹ کو دوسرے کرداروں کے مقابلہ میں زیادہ زوردار بنائے تاکہ تماشائیوں کی نگاہ میں مہتمم کی شخصیت وقیع و ممتاز ثابت ہو۔ تماشا گویا فٹ بال کا کھیل تھا جس میں ایک بظاہر چست و چالاک سنٹر فارورڈ (مرکزی پیش دوندہ) دوسرے دس کم حیثیت کھلاڑیوں کے ساتھ گیند لئے آگے بڑھ رہا ہو۔ اسٹار سسٹم نے ڈراما نویس کے موقف (پوزیشن) کو اور بھی حقیر بنا دیا تھا۔ کوئی پیشہ ور حسین و جمیل رقاصہ ایکٹرس کی حیثیت سے اسٹیج پر نمودار ہوتی اور اپنے ناز و غمزہ کے کرشمے سے پبلک کا دل موہ لیتی تھی ۔ عوام یہ جاننے کی پروا نہیں کرتے کہ ڈراما کسی باکمال شاعر کا لکھا ہوا ہے یا ادنیٰ درجہ کے منشی کا، جہاں اشتہار نکلا کہ پبلک کی منظورِ نظر مس گلاب یا مس زہرہ ناچ گانے کا کمال دکھانے والی ہیں، شام ہی سے تماشا گاہ میں خلقت ٹوٹی پڑتی ہے اور ٹکٹ گھر روپیہ کی جھنکار سے گونج اُٹھتا ہے۔ مختلف کمپنیاں

اس "ستارہ" کو بڑی سے بڑی تنخواہ پر اپنے ہاں بُلانے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ پھر مِس صاحبہ کی نازک دماغی کے کیا کہنے۔ جو کھیل اُن کو پسند نہیں آتا اس میں حصّہ لینے سے وہ صاف انکار کردیتی ہیں۔ بیچارے ڈراما نویس کو کوڑ مغز لیکن پبلک کی منظورِ نظر رقاصہ کے رُجحانِ طبیعت کا پاس رکھنا اور اس کی مرضی کے مطابق ڈراما لکھنا پڑتا تھا۔ یہ ہے اُنیسویں صدی کے انگلستان کی ڈرامائی پستی کا دردانگیز نقشہ۔ کیا ٹھیک یہی حالت آج اُردو اسٹیج کی نہیں ہے؛ بلکہ سینما کی ترویج نے تھیئٹریکل کمپنیوں کو اور قلاّش بنا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ عوام کی بدمذاقی کی پیروی کرنے پر پہلے سے بھی زیادہ مجبور ہیں۔

بہر حال ایک مدت تک یورپ کے ڈرامائی مطلع پر انحطاط و زوال کی گھٹا چھائی رہی۔ بالآخر ایک غیر معروف اُفق سے آفتابِ اصلاح طلوع ہُوا جس کی ضیا باریوں نے دنیائے ڈراما کو منوّر کر دیا۔ ناروے کا ملک ادب و شاعری کے لحاظ سے بلادِ مغرب میں صفر کا درجہ رکھتا تھا لیکن وہاں ہنری اِبسن نامی ایک زبردست مصلح پیدا ہُوا جس نے اُنیسویں صدی کے اواخر میں دُنیائے ڈراما میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ تمام یورپ نے اس کے کمال کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا۔ سب سے پہلے اِبسن نے رسمیات، روایات، تصنعات و تکلفات کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے ڈراموں کیلئے روزمرہ کی معمولی زندگی سے مواد حاصل کرنا شروع کیا۔ وہ اپنے زمانے کے معاشری مسائل میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ قدیم رسم و رواج کی قوتوں کے خلاف افراد کی جدوجہد میں اُس کو طربیہ اور المیہ دونوں کیلئے دلچسپ مضمون ہاتھ آتے تھے۔ وہ اپنے ڈراموں میں اکثر ایسے موضوع پر بحث کرتا تھا جو پہلے نہایت حقیر و پست اور اسٹیج کی شان کے منافی سمجھے جاتے تھے۔ اسکے ڈرامائی کردار اسٹیج پر اسی سادگی اور آزادی سے گفتگو کرتے ہیں جیسے حقیقی انسان گھروں میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس نے خود کو خطاب کرنے یا پرے ہٹکر بولنے کے رسمی طریقہ کو جسے اصطلاحًا "سالولیکوئی" اور "الیسائڈ" کہتے ہیں خیرباد کہی۔ وہ دلفریب بصری مناظر کو زیادہ اہمیّت نہیں دیتا اور نہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کی ضرورت تسلیم کرتا ہے۔ وہ سادہ گفتگو کے ذریعے سے ہر قسم کا اثر پیدا کر لیتا ہے۔ وہ ڈرامے میں مافوق البشر مخلوق، خلاف عادت واقعات، معجزانہ طلسمی اور غیر فطری عناصر کو جگہ دینا حقیقت اور واقعیت کے منافی خیال کرتا ہے۔ وہ ڈرامے میں فلسفیانہ مسائل اور حکیمانہ نکات بیان کرنے یا اخلاقی درس دینے کا سخت مخالف تھا۔ البتہ زندگی کے معمولی معمولی واقعات پر متانت و سنجیدگی کا رنگ چڑھانے میں اسے یدِطولیٰ حاصل تھا۔ ابتداءً ڈرامے بالکل نظم میں یا بلینک ورس (نثر مرجز) میں یا نظم و نثر کی آمیزش سے لکھے جاتے تھے۔ جتنے نامور ڈراما نویس دُنیا میں گزرے ہیں سب کے سب زبردست شاعر بھی تھے۔ اِبسن نے بھی اپنے دو ابتدائی ڈرامے سر بسر نظم میں لکھے تھے لیکن پچاس سال کی عمر کے بعد جب اس کے اصلاحی خیالات میں پختگی و استواری پیدا ہوگئی تو اس نے کُلّیتہً نثر میں ڈرامہ لکھنے کی بدعت جاری کی جس کی اب ہر ملک میں پیروی ہونے لگی

ہے۔ اُردو میں بھی خشک نثری ڈرامے لکھنے کا عام رواج ہو گیا ہے۔

یوروپی ممالک میں ڈرامہ نویسی پر ابسن کا جو اثر پڑا ہے اس کو مسٹر ماریوٹ مختصر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔ "ہر جگہ تھیٹر نے قدیم روایات کا طوق اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور مادہ اور اسلوب دونوں میں آزادی کی روش اختیار کر لی گئی۔ نثر نے نظم کی جگہ لے لی۔ ڈرامانویسوں نے جرأت سے کام لے کر عصری مسائل اور روزمرّہ کے معاملات پر بحث شروع کر دی۔ حقیقت اور واقعیت نے توہم و تخیل کو اسٹیج سے بیدخل کر دیا۔ تھیٹر پہلے صرف ناسمجھ عوام کی تفریح و دلبستگی کی جگہ تھا لیکن اب سمجھدار اور شائستہ لوگ بھی کھنچ کر آنے لگے۔ نئی وضع کی اداکاری، شستہ مذاق اور فطرت و حقیقت کی طرف عام رجحان کے مدّنظر نئے نمونے کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ پہلے اسٹیج کی حیثیت پلیٹ فارم و منبر کی سی تھی جس پر ایکٹر خطیبانہ پیرایہ میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ اندازِ تکلم صریحًا تصنّع و تکلّف کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اب اسٹیج بمنزلہ ایک کمرے کے بن گیا جس کی چوتھی دیوار مفقود ہے اور جہاں لوگ ویسی ہی بے تکلفی اور سادگی سے آپس میں بات چیت کرتے نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھروں میں"۔

ڈرامائی دُنیا میں ایسے انقلاب کا پیدا ہونا معمولی بات نہ تھی۔ ابسن کے اصلاحی خیالات کیا تھے قیصر روم کے تربیت یافتہ فوجی سپاہی تھے، ان کا لشکر جرار جدھر گیا جس ملک میں داخل ہوا فتحمند و ظفریاب رہا۔ اقلیم سخن کے فرمانرواؤں نے اس کا لوہا مان لیا اور اس کی سیادت و اطاعت قبول کر لی۔ مسٹر برنارڈ شا کا قول ہے کہ "ابسن کا جو زبردست اثر انگلستان پر پڑا۔ وہ تین عظیم الشان انقلابوں، چھ خطرناک صلیبی جنگوں، دو زبردست بیرونی حملوں اور ایک قیامت خیز بھونچال سے بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا"۔ ہر ملک کے نامور ڈرامانگار ابسن کے خیالات کے علمبردار بن گئے۔ انگلستان میں ولیم آرچر، برنارڈ شا، گالزوردی، گرینول بارکر اور سمرسٹ ماہم جیسے یگانۂ روزگار ادیب ڈرامانویسی میں مسٹر ابسن کا تتبع اپنے لئے باعثِ فخر خیال کرتے ہیں۔

قدیم تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ مالی ایثار و قربانی سے کام لے کر جدید اصلاحی ڈراموں کو ترقی دینگی اس لئے لوگوں کو طرز جدید کا خوگر بنانے کے لئے نئے نئے تھیئٹر قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ فرانس میں لبری تھیئٹر (Theatre Libre)، جرمنی میں فری برن تھیئٹر (Freie Buhne) اور انگلستان میں ری پرٹری تھیئٹر اسی مقصد سے کھولے گئے۔ اس کے بعد تو ری پرٹری (Repertory) نے ایک علیحدہ تحریک ہی کی شکل اختیار کر لی اور ملک میں بیسیوں ری پرٹری تھیئٹر قایم ہو گئے۔ قدیم پیشہ ورانہ تھیئٹر اور جدید ری پرٹری تھیئٹر میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر ڈرامے کو صرف حصولِ زر کا آلہ تصور کرتا ہے لیکن ثانی الذکر اچھے ڈرامہ کی تصنیف و تدوین کو مقدم سمجھتا ہے اور ضرورت کے وقت مالی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ چنانچہ ری پرٹری تحریک کی بدولت نہ صرف پبلک کے مذاق کی اصلاح ہوئی ہے بلکہ بیسیوں اعلےٰ درجہ کے ڈراموں کی تصنیف سے ادبیات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ ورنہ پرانی پیشہ ور کمپنیوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی وجہ سے یہ ادبی جواہر پارے

تعرِ گمنامی میں پڑے رہتے۔ غرض کہ اُنیسویں صدی میں انگلستان کے تھئیٹر کو جو عوارض لاحق تھے ان کے علاج کے لئے ری پرٹری تحریک نہایت کارگر ثابت ہوئی بیسویں صدی میں انگریزی ڈراما نہ صرف اس مفید علاج سے بھلا چنگا ہوگیا بلکہ اس کی قوت اور اثر میں دس گنا اضافہ ہوگیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اُردو ڈراما اور اسٹیج کا جسم زار بھی انہیں اسقام و عوارض کا شکار ہے جو انگلستان کے تھیئٹر کو اُنیسویں صدی میں لاحق تھے تو کیا اس کے علاج و تجدید شباب کے لئے بھی ری پرٹری کا مجرب و آزمودہ نسخہ مفید ثابت نہیں ہوسکتا؟ اس کا جواب غالباً نفی میں ملیگا۔ اگر ایک امیر اور ایک غریب آدمی ایک ہی مرض میں مبتلا ہو تو جن قیمتی دواسے امیر کو فائدہ ہوگا اس کے خریدنے ہی کی غریب کو استطاعت نہ ہوگی۔ اگر دوا قیمتی اجزا پر مشتمل نہ ہو اور دونوں کو ہمدست ہو جائے تو بھی دونوں آدمیوں کے مزاج و طبیعت اور ماحول و فضا میں اختلاف ہونے کی وجہ سے وہ دونوں کے لئے یکساں مفید ثابت نہ ہوگی۔ انگلستان نہایت دولتمند ملک ہے اور وہاں تعلیم کا بھی اس قدر رچا ہے کہ جاہل اور ان پڑھ آدمی مشکل سے ملے گا۔ تعلیم سے انسان کی سیرت ضرور متاثر ہوتی ہے۔ ان کے مذاق شستہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ وہاں اعلےٰ درجہ کے ڈراموں کے قدر دانوں کی کمی نہیں اس لئے وہاں ری پرٹری تھئیٹروں کو بھی پیشہ ور بڑی تھئیٹریکل کمپنیوں کے مقابلے میں ہیچ ہونے کے باوجود اتنی آمدنی ضرور حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے مفید وجود کو قائم رکھ سکیں لیکن ہندوستان جیسے قلاش ملک میں بڑی بڑی تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں کا شہر بشہر دورہ کرتے رہنے کے باوجود تھوڑے دنوں پر دیوالہ نکلتا رہتا ہے کتنی تھئیٹریکل کمپنیاں حشرات الارض کی طرح معرض وجود میں آئیں لیکن زندگی کی دو چار ہی بہاریں دیکھنے کے بعد فنا سے ہم آغوش ہوگئیں۔ آج کل تو سستے سینما کی کثرت اور گرم بازاری نے خاص تجارتی ذہنیت رکھنے والے پارسی سیٹھوں کی بھی کمر ہمت توڑ دی ہے۔ بعض سینماؤں میں آخری درجہ کا ٹکٹ صرف ایک آنہ کو فروخت ہوتا ہے۔ اب کونسا تھئیٹر ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ایسی حالت میں ری پرٹری تھئیٹر کا کھلنا اور اپنے بل بوتے پر قائم رہنا محال ہے۔ البتہ والیان ریاست کی حمایت و سرپرستی ری پرٹری تھئیٹر کیلئے مسیحا نفسی کا کام دے سکتی ہے۔

ہندوستان ہی پر کیا موقوف سارے ایشیا میں علوم و فنون کی ترقی شاہی درباروں کے زیر سایہ ہوا کی ہے۔ اکبر جیسے ان پڑھ بادشاہ کا دربار سینکڑوں علما، فضلا اور ماہرین فن کا ماویٰ و ملجا تھا۔ ایک ایک شعر پر شاعروں کے مُنہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے اور بعض سونے میں تولے جاتے تھے۔ بالکل گئے گذرے زمانے میں بھی شاہانِ اودھ اور والیانِ رامپور کی داد و دہش کے قصے آجتک زبان زد خلائق ہیں۔ آج بھی ملک میں بڑے بڑے اُمرا اور والیانِ ریاست کی کمی نہیں لیکن اس زمانہ میں کمال کی قدر کہاں؟ جن اعلےٰ خدمات کے اعتراف میں پہلے جاگیریں عطا ہوتی تھیں اب اُنکا صلہ حروف تہجی کے ہیر پھیر سے خالی خولی خطاب کی شکل میں ملتا ہے۔ سر اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہوگئے   لے کے اب تُو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے — ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی — پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا — اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

بہرحال اگر اُمرا و رؤسا کی جانب سے یا ملک میں اردو کی اصلاح و ترقی کیلئے جو مالدار انجمنیں قائم ہیں ان کی طرف سے ڈرامانویسی کے لئے بیش قرار انعامات مقرر کئے جائیں تو ممکن ہے کہ مشاہیر اہلِ قلم کو اچھے ڈرامے لکھنے کی ترغیب ہو۔ آج کل ایسی انجمنیں کسی خاص شخص کا انتخاب کر کے اس سے کسی انگریزی ڈرامے کا ترجمہ کراتی ہیں۔ اس سے مقابلہ و مسابقت کی روح مُردہ ہو جاتی ہے اور کسی کو طبعزاد ادبی کارنامہ پیش کرنے کی تحریک نہیں ہوتی لیکن ری پرٹری تھیٹر کے قیام کے لئے تو والیانِ ریاست کی مربیانہ توجہ ضروری امر ہے۔ جس طرح فرزندانِ قوم کی تعلیم و تربیت کیلئے اسکول اور کالج قائم کئے جاتے ہیں جہاں فیس کی آمدنی کسی شمار میں نہیں ہوتی اسی طرح فنِ ڈراما کی ترقی اور عوام کے مذاق کی اصلاح کیلئے ری پرٹری تھیٹر کھولنے کی ضرورت ہے۔ جب پبلک میں بااصول و بلند پایہ ڈرامے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو ریپرٹری تھیٹر خود کفالتی بن جائیں گے۔ اور جب اعلیٰ درجہ کے ڈراموں کی مانگ ہو گی تو رسد کا انتظام بھی ہو جائیگا اور مصنفین بھی پیدا ہونے لگیں گے۔ ریپرٹری تھیٹروں کی تعداد بڑھنے اور عوام کا مذاق سُدھرنے پر بڑی بڑی تجارتی تھیٹریکل کمپنیوں کو بھی لامحالہ اپنی روش بدلنی اور اپنا معیار بلند کرنا پڑیگا۔ اور اُن کی موجودہ بدعنوانیاں اور بے اعتدالیاں رفتہ رفتہ دُور ہو جائیں گی۔ جب ڈراما ادبیات کی اہم شاخ ہے اور اُردو زبان میں اس کا سرمایہ اس قدر حقیر ہے تو اردو کی اصلاحی انجمنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ری پرٹری تھیٹر کے قیام اور بلند پایہ ڈرامے کی تصنیف کے لئے والیانِ ریاست سے امداد کی مناسب پیرایہ میں اپیل کریں۔ انفرادی درخواست سے اجتماعی اپیل زیادہ وزن رکھتی ہے۔

لیکن جس کام کے ساتھ روپیہ پیسہ کی حرص وابستہ ہو اس میں وہ جوش وہ گرمی وہ خلوص کہاں جو اس کام میں پایا جاتا ہے جسے انسان بلامعاوضہ محض رضاکارانہ حیثیت سے شوقیہ انجام دے۔ مانا کہ ری پرٹری تھیٹروں کی توجہ حصولِ زر کی طرف کم اور اصلاح کی جانب زیادہ مبذول ہے تاہم کچھ نہ کچھ حرص و آز تو وہ ضرور رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بزودی بادیہ پیشہ ور بڑی کمپنیوں کے ہم پایہ بن جائیں لیکن امیچیور ڈرامائی کلبوں کے قیام کا محرک محض فنِ ڈراما کا پاکیزہ ذوق ہے۔ انگلستان میں امیچیور سوسائٹیوں کا ہر طرف جال پھیلا ہوا ہے جس میں بچے اور جوان سب شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ یہ تمام سوسائٹیاں ایک اعلیٰ تنظیم کے تحت کام کر رہی ہیں۔ سب کا تعلق ایک مرکزی ڈرامہ لیگ سے ہے۔ اور اس مرکزی لیگ کے تحت مقامی انجمنیں قائم ہیں جو اپنی ملحقہ امیچیور کلبوں کو ہدایت و مشورہ دیتی اور مقابلہ کیلئے سالانہ انعامات عطا کرتی ہیں۔ دیہاتوں میں بھی شوقیہ ڈرامائی سوسائٹیاں نہایت مفید کام انجام دے رہی ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں سات ہزار مواضع کے امیچیور کلبوں نے اپنے اپنے ضلع کی انجمنوں سے

لباس، پردہ اور ڈراما کی کتابوں کی فراہمی کے لئے درخواستیں پیش کی تھیں۔ اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو خاص ڈراما سے کتنا شوق ہے۔ وہاں کے بورڈ آف ایجوکیشن (مجلس تعلیمات) نے ایمیچیور ڈرامائی کلبوں کو تعلیم بالغان کا اہم ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ جو ڈرامے ایمیچیور کلبوں میں ایکٹ کئے جاتے ہیں وہ تجارتی تھیٹروں کے ڈراموں سے کہیں اعلےٰ، پاکیزہ اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایمیچیور کلب کے نوعمر ممبروں کو پیشہ ور ایکٹروں کا سا تجربہ اور فنی مہارت حاصل نہ ہو لیکن اس کمی کی تلافی ان کے سچے شوق اور خلوص سے ہو جاتی ہے نقادانِ فن کی رائے ہے کہ انگلستان میں ڈرامے کی نجات کا باعث نوجوانوں کے شوقیہ کلب ہیں۔

اُردو ڈراما کی اصلاح و ترقی بھی نوجوانوں ہی کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ ریپرٹری تھیٹر قائم بھی ہو تو اسے امرا و رؤسا کا دست نگر ہونا پڑے گا لیکن جوشیلے نوجوانوں کی غیرت کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان کو صرف اپنی ہمت اور ذوقِ عمل پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان کی طرح ہندوستان کے قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں تو ایمیچیور سوسائٹیوں کا قائم ہونا مشکل ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں میں ڈرامے کا صحیح مذاق پیدا ہونے لگا ہے۔ مدرسہ میں مختلف جلسوں کے موقعوں پر لڑکے ڈرامے کی نمائش کرتے ہیں اور بعض کالجوں میں تو مستقل طور پر ڈرامائی کلب قائم ہو چکے ہیں۔ بعض مشاہیر اہلِ قلم نے طالب علموں کے مذاق و دلچسپی کے مطابق چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی تصنیف کئے ہیں۔ جن سے اُردو ادبیات میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے لیکن اسکولوں اور کالجوں کے ڈرامائی کلب سے کہیں زیادہ اہم اور ٹھوس کام وہ ایمیچیور ڈرامائی سوسائٹیاں انجام دے رہی ہیں جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، لاہور، حیدرآباد وغیرہ میں قائم ہو چکی ہیں اور جن میں کالج کے طلبہ کے علاوہ نوجوان جوشیلے گریجویٹ، پروفیسر، ایڈیٹر، ڈاکٹر، انجنیئر وغیرہ بھی بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں۔

ان اعلےٰ تعلیم یافتہ حضرات کی حمایت ڈرامے کیلئے آیۂ رحمت ہے۔ ہمارے ثقاہت پسند اصحاب جو ایکٹنگ کو ڈوم ڈھاڑیوں سے منسوب کر کے ڈرامے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اب اُن کی ذہنیت بدل گئی ہے۔ اداکاری اور ڈرامہ نویسی دونوں فنونِ لطیفہ میں شامل ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ملک کے مؤقر رسائل و جرائد بھی جو پہلے ڈرامے کے متعلق مضمون شائع کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اب صفحے کے صفحے ناٹکی مسائل پر بحث کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ بعض تو خاص ڈراما نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سب باتیں ڈرامے کی آئندہ ترقی کیلئے نیک فال ہیں۔ لیکن ابھی ایمیچیور (شوقیہ) ڈرامائی سوسائٹیوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ شہر اور قصبہ میں ایمیچیور کلب قائم کئے جائیں۔ ان کی وسیع پیمانہ پر تنظیم ہو اور وہ کسی مرکزی ڈرامائی لیگ سے ملحق یا منسلک کر دیئے جائیں جہاں سے عام ہدایتیں اور مشورے حاصل کئے جا سکیں۔ اب تک جو ایمیچیور ڈرامائی سوسائٹیاں معرضِ وجود میں آئی ہیں وہ صرف اعلےٰ تعلیم یافتہ طبقہ پر مشتمل ہیں اسلئے ان کو صرف خاصہ کی چیزیں مرغوب ہیں۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ انگلستان کے دیہات میں بھی بیشمار شوقیہ ڈرامائی سوسائٹیاں قائم ہو چکی ہیں جن میں عوام کے سادہ جذبات اور معصومانہ دلچسپیوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے

ہمارے ہاں کے اعلےٰ تعلیمیافتہ حضرات کو بھی اپنی اشرافیہ (ارسٹو کریٹک) تحریک کو عمومیہ (ڈیمو کریٹک) تحریک میں تبدیل کرنا چاہیئے اور ایسی روش اختیار کرنی چاہیئے کہ ڈرامے کے ذریعے پبلک کی تلقین و تبلیغ اور ان کے مذاق و اخلاق کی اصلاح کا مقصد فوت نہ ہونے پائے۔

ہمارے ہاں کی امیچیور ڈرامائی سوسائٹیوں کے قیام سے فنِ ڈراما اور اداکاری کی قدر و منزلت تو ضرور بڑھی لیکن اُردو میں کسی بلند پایہ ناٹکی تصنیف کا اضافہ نہیں ہُوا، جو کلاسیکل ڈراموں کی ٹکر کی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ امیچیور ڈرامائی کلبوں یا سوسائٹیوں کے گریجوئیٹ اور پوسٹ گریجوئیٹ (طیلسانی و مافوق طیلسانی) اراکین کے سر میں یورپ کی کورانہ تقلید کا سودا سمایا ہُوا ہے۔ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی دو قسم کے امیچیور کلب ہیں۔ ایک وہ جن کا مقصد محض تفریح و تفنّن کا سامان پیدا کرنا ہے۔ یہ مقصد تو انگریزی زبان کے ڈراموں کی تمثیل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض اسکولوں، کالجوں اور امیچیور کلبوں میں صرف انگریزی ڈرامے یا اُنکے بعض سین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ اِن سے کوئی ادبی مقصد پُورا نہیں ہو سکتا۔ دوسری قسم کے وہ امیچیور کلب ہیں جو اصلاحی مقصد پیشِ نظر رکھتے ہیں اور بلند پایہ تصانیف و تراجم کے ذریعے اُردو ادبیات کا دامن وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب تک ان کلبوں کے مشاہیر اہلِ قلم نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے چند مشہور مغربی ڈراموں کے لفظی ترجمے پیش کیے ہیں یا جن تصنیفات کو طبعزاد بتایا جاتا ہے اِن میں اِبسن اور اس کے نامور پیروؤں کے ڈراموں کا چربہ اُتارا گیا ہے۔ لیکن خشک نثری ترجموں یا چربوں سے اُردو ڈرامے کی اصلاح و ترقی کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ نظمی ڈراما یا نثری ڈراما زیادہ مؤثر و کامیاب ہو سکتا ہے۔ دُنیا کے وہ تمام ڈرامے جن کا شمار کلاسکس (ادب العالیہ) میں ہوتا ہے اور جن کو گرم و سرد زمانہ دیکھنے کے بعد اب تک شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ یا تو سر بسر نظم میں لکھے گئے ہیں یا ان میں نظم و نثر کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ بالکل نثری ڈرامائی پیداوار ہنرک اِبسن اور اس کے پیروؤں کی بدعت اور قدیم روایات سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز بلادِ مغرب میں کامیاب ہوا سے ہندوستان کی فضا بھی راس آئے۔

مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ مذہبی خیالات، سیاسی واقعات، معاشرتی رسوم، مجلسی آداب، اقتصادی حالات، قومی روایات کے لحاظ سے مغرب اور مشرق کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ یورپی ڈراموں کا ہو بہو ترجمہ یا ان کا چربہ صرف انہیں چند اعلےٰ انگریزی تعلیمیافتہ حضرات کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے جنہوں نے اپنے مشرقی شعار ترک کر کے بالکل مغربی وضع کی پابندی اختیار کر لی ہے۔ ورنہ ایک ملک کا ادبی شاہکار بغیر مناسب ترمیم و تصرف کے اجنبی ملک میں جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب لندن کے لیرک تھیئٹر میں سنسکرت کے مشہور ناٹک "مرچھ کٹک" کا ترجمہ اسٹیج کیا گیا تو وہ بالکل ناکام اور بے لطف ثابت ہُوا۔ اسی طرح ہندوستانی اسٹیج پر ہنرک اِبسن یا برنارڈ شا یا میٹرلنک یا گالزوردی کے ترجموں کی نمائش یقیناً بالکل بے لطف اور بے مزہ معلوم ہو گی۔ آغا حشر، مرزا نظیر بیگ اور احسن وغیرہ نے مشرقی حالات اور مذاق کو پیشِ نظر رکھ کر شیکسپیئر کے ڈراموں میں جو ردّ و بدل، ترمیم و تبدیلی، کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت سے کام لیا ہے وہ بالکل درست عمل ہے۔ اِن پر اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کیوں تصرفات سے کام لیا بلکہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں اتنی قابلیت اور اہلیت نہ تھی کہ وہ شیکسپیئر کی ادبی

خوبیوں، فنی باریکیوں، خیالات کی نزاکتوں، جذبات کی لطافتوں، فلسفۂ حیات کے رموز، معاملاتِ زندگی کے نکات اور کردار نگاری کے کمالات کو اُردو میں نباہ سکتے۔ علاوہ بریں انہوں نے عوام کے پست مذاق کی رعایت سے اپنی تالیفات میں ایسی مبتذل اور سوقیانہ مسخرگی کو راہ دی جس کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے جا ملے۔ اور جس نے شکسپیر کے ڈرامے کی وقعت کھو دی۔ ہمارے اعلیٰ تعلیمیافتہ حامیانِ ڈراما کو چاہیئے کہ وہ یورپ کے باکمال ادیبوں کے اصلاحی خیالات سے استفادہ ضرور کریں لیکن ان کے ڈراموں کا خشک نثری ترجمہ پیش کرنے یا ان کا چربہ اُتارنے کے بجائے مشرقی خیالات و رجحانات کے تحت ان میں مناسب ترمیم و اضافہ کریں۔ حسب موقع تصرفات سے کام لیں اور ان کو ایسا اپنائیں کہ مغائرت و اجنبیت کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔

بعض حضرات ڈرامے میں اشعار، نظم، گانے، زوردار مقفیٰ عبارت اور مبالغہ کے استعمال کو غیر فطری اور خلاف حقیقت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی ملک کے لوگ نظم یا مقفیٰ عبارت میں گفتگو نہیں کرتے۔ ڈراما مکالمہ پر مبنی ہوتا ہے اور مکالمہ کا فطری ذریعہ نثر ہے۔ اس لئے ڈرامے نثر میں لکھے جانے چاہئیں۔ یہ محض صدائے بازگشت ہے ابسن کے قول کی جو حقیقت و واقعیت کا حامی اور نثری ڈرامے کا موجد تھا۔ آج تمام مغربی ممالک میں ابسن کی پیروی کی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں کے بعض اہلِ قلم بھی اپنے ملکی حالات اور قومی خصائص کو پس پُشت ڈال کر یورپ کی کورانہ تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جس پر تفصیلی بحث ایک علیحدہ بسیط مضمون کی متقاضی ہے انشاءاللہ کسی دوسری صحبت میں اس پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف چند باتیں مختصراً بیان کر دی جاتی ہیں۔

ڈراما آرٹ ہے لیکن محض قدرتی اشیاء کی نقالی یا عکسی تصویر کا نام آرٹ نہیں ہے۔ خود محسوس کرنا اور بات ہے اور دوسروں کو محسوس کرانا اور بات۔ نجی معاملات میں ہم خوشی کے موقع پر ہنستے اور غم کے موقع پر روتے ہیں۔ اس وقت یہ خیال نہیں آتا کہ ہمیں اس سے زیادہ ہنسنا یا رونا چاہیئے تھا۔ لیکن جب دوسروں کو اپنا سُکھ یا دُکھ دکھانا اور اس میں ان کو بھی شریک کرنا مقصود ہو تو جذبات کے معمولی طرز اظہار سے کام نہیں چل سکتا اور مبالغہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو چیز دُور سے دکھائی ہو اسے بڑا کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ اسکو سچائی ہی کی وجہ سے بڑا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ جس پیمانہ پر جو چیز چھوٹی نظر آتی ہے اسی قدر وہ اصلیت اور واقعیت سے دُور ہو جاتی ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان صرف فاصلہ کی دوری نہیں بلکہ معنوی دُوری بھی ہوتی ہے۔ ایک شخص کا دُکھ سُکھ اس کے لئے بے پردہ ہے لیکن اوروں کے لئے نہیں۔ دوسرے اس سے دُور ہیں۔ اس دُوری کے تناسب سے اپنے خیالات و جذبات کو دوسروں کے آگے بڑھا کر بیان کرنا پڑتا ہے۔ یہ بناوٹ نہیں بلکہ تکمیلِ حقیقت کا تقاضا ہے۔ خانگی معاملات پر گفتگو کرتے وقت نہ چیخنے چلّانے کی اور نہ بھاؤ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسٹیج پر ایکٹر وہی بولی اسی انداز سے بولیں جیسے گھر پر بولتے ہیں تو ساری ڈرامائیت خاک میں مل جائے گی۔ مجمع کو متاثر کرنے کیلئے ڈراما نویس کو نہ صرف مبالغہ سے کام لینا پڑتا ہے بلکہ موزوں و مقفیٰ زبان کی مختلف نزاکتوں اور ہم آہنگیوں کا بھی سہارا لینے کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں نظم میں نثر سے کہیں زیادہ لطف و دلکشی پائی جاتی ہے۔ ایکٹروں کو اپنا پارٹ

یاد کرنے میں سہولت ہوتی ہے اور اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اگرچہ معمولی خیالات نثر میں عمدگی کے ساتھ ظاہر کئے جاسکتے ہیں لیکن عمیق الطیف وشدید جذبات کی ترجمانی کا بہترین ذریعہ نظم ہے۔ "نٹ شاستر" کے مصنف بھرت منی نے ناٹک کو شاعری وموسیقی کی اہم صنف قرار دیا ہے۔ شاعری کی دو قسمیں ہیں درسیا سنگیت یعنی بصری نغمہ اور سرویا سنگیت یعنی سمعی نغمہ۔ چونکہ ڈرامے کا کھیل یا نمائش آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے اسلئے اس فن کا شمار درسیا سنگیت یعنی بصری شاعری میں ہوتا ہے۔ غرضکہ ڈرامے کا تعلق نثر سے نہیں بلکہ نظم یا شاعری سے ہے۔ نثری ڈرامہ بیسویں صدی کی بدعت ہے۔ جب لذائذ ونعائم کی کثرت سے طبیعت سیر ہوجاتی ہے تو سادہ غذا مرغوب خاطر ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُبالی کھچڑی کو پلاؤ وقلیہ پر تفوق حاصل ہے۔ یورپ جدت اور تنوع کا دلدادہ ہے۔ وہاں قدیم روایات ومسلمات سے بغاوت کی ہوا چلی ہوئی ہے۔ اسی مخالفت کے جذبہ کے تحت وہاں خشک نثری ڈراموں کی آؤبھگت ہوئی لیکن اہل ہند کی قدامت پسندی اور اکابر پرستی ادبی بغاوت کی اجازت نہیں دیتی۔ اردو میں کلاسیکل (معیاری) ڈرامے ہیں کہاں کہ کلاسیت اور قدامت کے خلاف یہاں بھی رومانیت، فطریت اور واقعیت کی تحریکیں رائج کی جائیں۔

ممکن ہے کہ یورپ میں مادی انہماک اور کاروباری ممارست کی وجہ سے نغمہ کا ذوق کم ہوگیا ہو لیکن ہندی ذہنیت شاعری وموسیقی کی اس قدر دلدادہ ہے کہ وہ کبھی خشک نثری ڈرامے سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر ای۔ جے ڈنٹ اپنی عالمانہ کتاب "فاؤنڈیشن آف انگلش اوپیرا" (انگریزی اوپیرا کی بنیاد) میں شکسپیر کے گیتوں پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ کسی غیر ملک کے ڈرامے کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت اپنے قومی خصائص کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسٹیج پر کسی بدیسی ڈرامے کا محض ترجمہ خواہ وہ کیسا ہی سلیس اور بامحاورہ کیوں نہ ہو کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ عوام کے فطری رجحانات اور ذہنی خصوصیات کے مطابق اس میں تصرف کیا جائے۔ گیتوں کی مثال لے لو۔ ہر قوم کو نغمہ وموسیقی سے لطف حاصل ہوتا ہے اسلئے شکسپیر نے تماشائیوں کی دلچسپی کیلئے اپنے ڈراموں میں جابجا گیت استعمال کئے ہیں۔ لیکن ڈرامے کے ممتاز اشخاص گیت نہیں گاسکتے۔ اہل انگلستان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی متین اور سنجیدہ شخص گا گا کر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شریف آدمی بر ثبات ہوش اسٹیج پر گانے لگے تو یہ منظر بالکل غیر فطری اور مضحکہ خیز معلوم ہوگا لیکن پبلک کو محظوظ کرنے کے لئے گانے کے مواقع پیدا کرنا ڈرامہ نویس کے فرائض میں داخل تھا۔ لہذا شکسپیر کو محض عوام کے لطف ودلچسپی کی خاطر عجیب وغریب کردار پیدا کرنے پڑے۔ کوئی کردار دیوانگی کی حالت میں، کوئی نشہ کے عالم میں، کوئی مسخرگی سے گانے گاتا ہوا پایا جاتا ہے کبھی کوئی پری گانے کے لئے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے اور کبھی ایریل (Ariel) جیسی مافوق البشر مخلوق سے گانے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب کھٹراگ صرف اسلئے ہے کہ کسی ثقہ آدمی کا اسٹیج پر گانا انگریزی ذہنیت کے منافی ہے۔

لیکن نغمہ وموسیقی کے متعلق ہندی ذہنیت ٹھیک اسکے برعکس ہے۔ ہندوستانی اسٹیج پر اگر کوئی متین وشریف کردار مکالمہ کے ضمن میں یکایک گانے لگے تو اہل ہند کے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہندی ذہنیت اطالوی ذہنیت سے ملتی جلتی ہے۔ اہل ہند کی طرح اطالیہ کے لوگ بھی نغمہ وموسیقی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ دونوں

تو میں نظم یا شاعری کو نہ صرف اظہارِ خیال کا بلکہ اثر آفرینی کا فطری ذریعہ تصور کرتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نغمہ سے جذبات میں تیزی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک مجمع کو محظوظ و متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ نظم یا گانا ہے۔ الغرض مسٹر ڈنٹ کی رائے صحیح ہے کہ ہندوستانی اسٹیج پر گانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو ڈراما نظم سے معرا ہو وہ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

محض ہنرک ابسن اور اس کے پیروؤں کی کورانہ تقلید میں اپنے قومی شعائر، ملکی روایات اور معاشری رجحانات کو پس پشت ڈال کر وزن اور قافیہ کو بیکار سمجھنا، نظم اور گانے کو خیرباد کہنا اور روکھی پھیکی نثر میں ڈرامے لکھنا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ مسٹر ای۔ جے ڈنٹ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ نفسِ واقعہ یہ ہے کہ انگلستان میں مکالمی ڈراما اس قدر ترقی کر چکا تھا اور وہاں کے لوگ ڈرامائی کرداروں کو نثر میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ وہ نغمہ و موسیقی کو اظہارِ خیال اور اشتعالِ جذبات کا ضروری آلہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے لیکن قدیم سنسکرت ڈراموں میں نازک و لطیف جذبات کی ترجمانی ہمیشہ اشعار کے ذریعے کی جاتی تھی۔ جو لے کے ساتھ گائے جاتے تھے۔ موسیقی کی یہ رسم قرونِ وسطیٰ میں بھی قائم رہی۔ مغل دربار نے بھی نغمہ و شاعری کی خوب قدردانی کی۔ غرضکہ شاعری اور نغمہ کا ذوق اہلِ ہند کو ہزاروں سال سے نسلاً بعد نسل وراثتہً منتقل ہوتا رہا ہے۔ یہ لَے اب ان کے کانوں کو ایسی رچ گئی ہے کہ نثری ڈراما ہی جسے مغربی تحریک کی تقلید میں حقیقت و اصلیت پر مبنی تصور کیا جاتا ہے ان کو اجنبی، نامانوس، غیر فطری اور غیر حقیقی معلوم ہوگا۔ اسلئے ضرورت ہے کہ موجودہ ایچیور سوسائٹیاں جو ڈرامے تیار کرائیں ان میں اپنے قومی خصائص، ملکی روایات اور معاشری میلانات کا لحاظ رکھیں۔ ڈراما نویس کو فنی اصول و ضوابط اور اداکاری کے نکات اور اسٹیج کی اصلاحات و ضروریات سے واقف ہونے کے علاوہ ایک زبردست شاعر بھی ہونا چاہئے۔ دُنیا کے تمام نامور ڈراما نویس اعلےٰ درجے کے شاعر بھی ہوئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پورا ڈراما از بسم اللہ تا تائے تمت نظم میں ہو۔ معمولی خیالات کا اظہار نثر ہی میں ہونا چاہئے۔ نوکروں اور ماتحتوں کو حکم دینا ہو تو سادہ نثر ہی میں بولنا چاہئے۔ مکالمہ کو البتہ زوردار، فصیح اور متوازن ہونا چاہئے۔ اگر قافیہ پر معنی قربان نہ ہو تو مقفیٰ عبارت کا استعمال زیادہ پُرلطف، شاندار اور مؤثر ثابت ہوگا۔ گہرے، شدید یا نازک و لطیف جذبات کے اظہار کا تو بہترین ذریعہ نظم ہی ہے۔ اگر کہیں کہیں ہندی دُھنوں کے گانوں کو بھی جگہ دی جائے تو یہ مزید لطف و دلچسپی کا باعث ہوگا اور اردو شاعری کے دامن میں وسعت و کشادگی پیدا ہوگی۔ انگریزی کے بہتیرے ڈرامے بلینک ورس میں لکھے گئے ہیں۔ اُردو میں تقلیداً نظم معرا کا استعمال کبھی مفید و مؤثر ثابت نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے باکمال شعرا ڈراما نویسی کی طرف متوجہ ہوں۔ ادب و زبان کی یہ بہترین خدمت ہوگی۔ ہماری زبان کے مشاہیر نثر نگار اس میدان میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں لیکن اُردو ڈراما ان سے زیادہ اساتذہ سخن کی کرم فرمائیوں کا محتاج ہے۔

محمد حسین ادیب

ہم لوگ

(۱)

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ — مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش — مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

جلال چھو نہیں سکتا ہے باد و باراں کا — وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور — وہ کبر دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی — لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں — وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں — مثالِ جوئے رواں بیقرار ہیں ہم لوگ

جوانیوں کو ملی ہے ہمیں سے نعمتِ ناز — وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ

(۲)

فسردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب — بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام
امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک
وہ فاتحِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی
نہ پوچھ کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبرِ دوست جسے اختیار کہتے ہیں
اس "اختیار" سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکۂ مقلوب کے تلاطم میں
سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانے کے ہات سے ہر چند
مگر پیمبرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضور، اہلِ نظر
جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ روبرو اے روحِ نعمتِ دارین
بہ ہوش باش، کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

بس اس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات
شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

خزاں کی سرخ شعاعوں کے سیل پر اے جوش
نگاہِ خالقِ ابرِ بہار ہیں ہم لوگ

(جوش ملیح آبادی)

رشتہ دار

حاجی صاحب کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ مگر آج کل مجھ سے وہ کچھ ناراض ہیں۔ کسی کمبخت نے انہیں بہکا دیا ہے کہ میں اخباروں میں مضمون لکھتا ہوں۔ قسمیں کھائیں کہ جو کبھی کسی اخبار میں کوئی بات لکھی ہو تو مُنہ کالا ہو مگر حاجی صاحب کو یقین نہیں آتا۔ ڈرتے ڈرتے میری زبان سے یہ نکلا کہ حاجی صاحب کبھی کبھی کسی رسالے میں ایک آدھ چیز میری شائع ہو جاتی ہے لیکن وہ بھی مہینوں ایڈیٹر صاحب کی منّت خوشامد کرنے کے بعد۔ مگر حاجی صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ فرمانے لگے "اخبار اور رسالے میں کیا فرق ہے؟ اخبار روز کا روز جھوٹ بولتا ہے اور رسالہ مہینے بھر کا جھوٹ ایک ہی دفعہ لکھ ڈالتا ہے۔ اَلعنت اللہ علی الکاذبین۔" "لعنۃ اللہ" حاجی صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ ہاں مگر پہلے یہ تو بتا دوں کہ حاجی صاحب ہیں کون؟ ہماری گلی میں "حاجی جی" کی مسجد مشہور ہے اور حاجی صاحب کا گھر بھی مسجد کے پہلو میں ہے۔ سینکڑوں سال کی پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے اور اب حاجی صاحب ہی اس مسجد اور مکان کے مالک ہیں۔ نہایت با وضع ایماندار بزرگ ہیں۔ اہلِ محلّہ کو مسئلے مسائل نہایت شوق سے سکھاتے ہیں۔ مجھ سے اِک گونہ انس بھی ہے کیونکہ میری بسم اللہ انہیں نے کرائی اور والد مرحوم کی خاطر وہ اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کہتے کہ "انگریزی پڑھ کر کافر ہو گئے ہو۔" غالباً حاجی صاحب کے والد بزرگوار حاجی تھے مگر اہلِ محلّہ جس طرح نواب کے بیٹے کو بھی نواب کہتے ہیں اسی طرح تبرّکاً حاجی صاحب کے والد کا اعزاز ان کی طرف شروع سے منسوب ہے۔ ایک دن شرارت سے میں نے پوچھا کہ حاجی صاحب کیا یہ بزرگوں کا قول ہے یا یونہی غلط العام ہے۔ فرمانے لگے کونسی بات؟ میں نے عرض کیا

فاعتبرُوا یا اولی الاشکام

پہلے تو کچھ چکرائے پھر سمجھ گئے اور فرمانے لگے "مردود! تو تمسخر سے باز نہیں آتا۔" اس پر تو مجھے بھی غصّہ آیا۔

میں۔ حاجی صاحب آپ ہی نے پڑھایا تھا کہ صنم کی جمع اصنام۔ میں نے شکم کی جمع اشکام کر کے فاعتبروا یا اولی الابصار کی جگہ فاعتبروا یا اولی الاشکام کہہ دیا۔ آنکھوں والے کم ہیں موٹے پیٹ والے بہت ہیں۔ کیا بُری بات ہوئی اگر الغرض خواہ مخواہ معتبر کو اولوالاشکام کہہ دیا۔

حاجی صاحب۔ چُپ رہو مردُود۔ حیوان شیطان۔

میں۔ قبلہ میں تو مسئلہ پوچھنے آیا تھا اب آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔

حاجی صاحب۔ (ذرا رحمدل ہو کر) نہیں نہیں۔ تم مسئلہ ضرور پوچھو۔
میں۔ کیا گالی دینے سے زبان پلید ہوتی ہے؟
حاجی صاحب۔ زبان بھی پلید ہوتی ہے دل بھی پلید ہوتا ہے۔ یہ مشہور مسئلہ ہے تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں!
میں۔ اچھا تو مجھے سالے کی عربی بتا دیجئے!
حاجی صاحب۔ کیوں؟
میں۔ حاجی صاحب وہ جو چھوٹو کا بیٹا اب اپنے آپ کو ذوالقدر علی اندرابی کہتا ہے اسے کہنا چاہتا ہوں کہ تو کہاں کا بڑا رانی خاں کا سالا ہے مگر عربی میں کہنا چاہتا ہوں تاکہ زبان پلید ہو تو عربی میں ہو۔
حاجی صاحب۔ لعنۃ اللہ۔ تم عربی بھی سیکھتے ہو تو گالی دینے کے لئے۔ تم قطعی کافر ہو۔
میں۔ اچھا غلطی ہوئی معاف کیجئے۔ رشتہ داروں کے متعلق شرع شریف کا حکم مجھ پر واضح کر دیجئے۔

اس میری درخواست پر حاجی صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور نہایت وضاحت سے آدھ گھنٹہ اُنہوں نے وصیت اور ہبہ کے متعلق احکام کی تشریح کی۔ پھر جو میں نے عرض کیا کہ حضرت نہ میں مر رہا ہوں نہ جائداد بانٹ رہا ہوں۔ مجھے تو وہ احکام ذہن نشین کرا دیئے جو روزمرہ کی زندگی میں سود مند رہوں تو حاجی صاحب بگڑ کر بولے۔
حاجی صاحب۔ "سود مند" "سود مند"۔ تم سے سو دفعہ کہا ہے کہ سود کے لفظ سے بھی اجتناب کرو۔ "مفید" کہو۔
میں۔ بہت اچھا قبلہ مفید ہی سہی مگر . . . .
حاجی صاحب۔ اب بیچ میں مت بولو۔ پوری توجہ سے سنو۔

حاجی صاحب نے آدھ گھنٹہ میں اس مشکل مضمون پر وہ وہ روشنی ڈالی کہ میں نے عہد کیا کہ گھر پہنچتے ہی اپنی ڈائری میں اس تقریر کا لب لباب لکھ لونگا۔ چنانچہ جو کچھ اس دن کی ڈائری میں (اس کو عرصہ ہوا) لکھا تھا وہ نقل کرتا ہوں۔

شرع شریف میں رشتہ دار نہیں ہوتے۔ صرف اقربا و یتامے و مساکین ہوتے ہیں۔ اقربا وہ ہوتے ہیں جو دُور رہنے پر، دُور رکھے جانے پر بھی دُکھ دیتے ہیں اور توقعات رکھتے ہیں۔ یتامے وہ ہوتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا مگر بعض اقربا بھی یتامے کی مد میں گھس سکتے ہیں۔ مساکین وہ ہوتے ہیں جو چلتے پھرتے ہوں مگر جنہیں کوئی نہ جانے۔ مساکین کو روٹی دینا فرض اولیٰ ہے۔ یتامے کو کپڑا دینا کارِ ثواب ہے۔ اقربا صرف شادی بیاہ یا دُکھ درد کے موقع پر یا کسی مقدمے کے دوران میں حملہ کر سکتے ہیں۔ مساکین و یتامیٰ کا حملہ عام ہے۔ اقربا کو اپنے جنازے کے وقت کی اطلاع دینی چاہئے۔ یتامیٰ و مساکین

کو نذر نیاز کے وقت سے باخبر رکھا جائے۔ زکوٰۃ میں اول حق یتامے کا ہے، پھر مسجد کا یا مسجد کے مساکین کا۔ اگر اقربا میں سے کوئی یتامے ہو تو اس کا حق ہر یتیم انجمن سے فائق ہے۔ عید قرباں پر اقربا کا حق بقدر یک ثلث سب سے فائق ہے۔ کھال مسجد میں جانی چاہئے انجمنیں سب غاصب ہیں۔ جو انجمن کرائے پر واعظ لاسکتی ہے اور ان کی چرب زبانی سے یا شاعروں کی شعر خوانی سے چندہ جمع کر سکتی ہے وہ انجمن ہرگز یتیم کہلانے کی مستحق نہیں۔ کسی مسلمان کا حق نہیں کہ وہ اپنے بھتیجے یا داماد کو متبنےٰ بنا لے۔ یہ مشرکوں کی رسم ہے۔ اسی طرح کسی انجمن یا یونیورسٹی یا کالج کو متبنےٰ بنانا بھی بدعت ہے۔ جائز وارثوں کے حق کا غصب ہے۔ اقربا میں سے قیامت کے دن کوئی کام نہیں آئے گا۔ قیامت سے پہلے بھی کام نہیں آئے گا البتہ خاندانی قبرستان میں ان کے ساتھ رہنا ہوگا اسلئے مروت اور خلوص کا سلوک ہونا چاہیئے۔

....

حاجی صاحب کی ہزاروں باتیں اور یاد ہیں مگر یہ آخری بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اقربا آگے پیچھے قریب ہوں کہ نہ ہوں قبروں میں بہت قریب ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ مر کر ہی گذارہ ہوتا ہے۔

"فلک پیما"

چار شعر

مری حسرتوں کو نہ پامال کرنا — گلستانِ دل میں گزر کرنے والے

گزر گاہ تیری مری سجدہ گہ ہے — صنم خانۂ دل میں گھر کرنے والے

کرم ہے، کرم ہے، کرم ہے یہ تیرا — ستم مجھ پہ شام و سحر کرنے والے

تری بخششوں پر بھروسا ہے مجھکو

مری لغزشوں پر نظر کرنے والے

اعجاز سکندر تاثیر جاویدی

غزل

یہ مانا، دم بخود ہوں خوفِ جاں سے
مگر واقف ہوں ہر رازِ نہاں سے

طلب بر حق، مگر لاؤں کہاں سے
کہ باہر ہو حدِ وہم و گماں سے

بہت جائے اماں ڈھونڈی، نہ پائی
ترے تیرِ نگاہِ بے اماں سے

نہ دُنیا کا مجھے رکھا نہ دِیں کا
گِلہ ہے تیرے لُطفِ بیکراں سے

ہماری زندگی رنگیں بنی ہے
تو عشقِ گلعذارانِ جہاں سے

جہانِ پیر ابتک نوجواں ہے
تمہارے فیضِ حُسنِ نوجواں سے

ترا داغِ الم دے گا دِل کو زینت
مِرا باغ اور پھولے گا خزاں سے

ہمیں اب درد پہنچاتا ہے راحت
ہمیں اب نفع ہوتا ہے زیاں سے

اب او صبر و سکوں لے جانے والے!
بتا صبر و سکوں لاؤں کہاں سے

بجا ہے، کمترینِ بندگاں ہوں
مگر نسبت ہے کس کے آستاں سے؟

تعجب ہے، نشانِ راہِ منزل
مِلا بھی تو بچھڑ کر کارواں سے

نہ پوچھو، کیوں وفا سے توبہ کر لی
بتنگ آ کر وفائے دوستاں سے

جو اکسیرِ شباب آور مِلے گی،
تو خدّامِ درِ پیرِ مُغاں سے

علاجِ گردشِ قسمت ہے ممکن
تو پیہم گردشِ رطلِ گراں سے

خوشا وہ دِن! کہ آزاد آپ چھوٹیں
گرفتِ دامِ افکارِ جہاں سے

(حکیم آزاد انصاری)

لوسی

بیرن دو ترولی نے مجھ سے کہا اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم بیرن ویلی کے علاقے میں شکار کو چلیں ۔ میں تو کہتا ہوں ضرور چلو۔ خوب لطف ہوگا۔

میں نے دریافت کیا۔ کون کون چلے گا۔

بیرن نے کہا بس میں اور تم کیونکہ آج کل میں تنہا ہوں اور وہاں کا مکان بھی پرانی طرز کا ہے۔ تمہارے سوا میں اور کسی کو مدعو نہیں کر سکتا۔

میں نے دعوت قبول کر لی۔

سنیچر کے دن ہم ریل گاڑی سے نارمنڈی روانہ ہو گئے اور جونہی المیرے کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترے میری نظر سامنے کھڑی ہوئی چھکڑے کی وضع کی ایک دیہاتی گاڑی پر پڑی۔ اس میں ایک بہت تیز اور شریر گھوڑا جوتا ہوا تھا اور ایک دراز قد بوڑھا سائیس اس کے قریب کھڑا تھا۔ بیرن نے چھکڑے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا "دیکھو یہ اپنی دیہاتی گاڑی ہے"۔ سائیس نے جلدی سے اپنا ہاتھ بیرن کی طرف بڑھایا جس کو اس نے محبت سے اپنے ہاتھ میں لیکر مصافحہ کیا اور پوچھا "کہو اچھے تو رہے"۔

سائیس نے کہا "سب اچھا ہے سرکار"۔

ہم اس بڑے پہیوں والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گھوڑے نے کچھ دیر تو شرارت کی۔ پھر جب سرپٹ بھاگا تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے یہ معلوم ہوتا تھا گویا ہم ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ کنکریلی سڑک پر گاڑی خوب اُچھل رہی تھی۔ تختوں پر اُچھلتے اُچھلتے میں تو پریشان ہو گیا سائیس بار بار گھوڑے کو چمکارتا جاتا تھا لیکن وہ اپنی دُھن میں بھاگا جا رہا تھا۔ ہمارے کُتے بھی گاڑی میں پیچھے کھڑے ہوا کو سُونگھ سُونگھ کر شکار کی ٹوہ لگا رہے تھے۔

بیرن نارمنڈی کے نشیب و فراز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت نظر آتے تھے کہیں ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے تو کہیں سیب کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اپنی آڑ میں مکانات کو چھپائے ہوئے تھے۔ جدھر نظر اُٹھ جاتی تھی ایک سہانا منظر نظر آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بیرن یکبارگی بول اُٹھا "مجھے یہ منظر بہت ہی دلکش معلوم ہوتا ہے"۔

اُس کی رگوں میں نارمن خون بہہ رہا تھا۔ یہ کشیدہ قامت اور تندرست جوان اُس خاندان سے تھا جس کے اکثر آدمی سمندر

پار سلطنت قائم کرنے جایا کرتے تھے۔ اُس کی عمر پچاس سال تھی اور وہ اُس دیہاتی سائیس سے تقریباً دس برس چھوٹا تھا۔ سائیس بہت دُبلا تھا۔ اس قدر دُبلا کہ اُس کی ہڈی ہڈی نظر آتی تھی عموماً دیہاتی دُبلے پتلے ہی ہُوا کرتے ہیں۔

اُس پتھریلی اور ناہموار سڑک پر متواتر دو گھنٹے دوڑتے دوڑتے ہم ایک سبزہ زار کو طے کر کے مِیسر دوترولی کے قدیم مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک بوڑھی ملازمہ کام کر رہی تھی۔ ایک لڑکے نے دوڑ کر گھوڑے کو تھام لیا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے۔ اُس کا وسیع باورچی خانہ دھوئیں سے بالکل کالا ہو رہا تھا۔ چولہے پر پیتل اور چینی کے برتن چمک رہے تھے۔ ایک بلی کُرسی پر سو رہی تھی۔ کتا میز کے نیچے بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے دودھ اور سیب کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہیں زمین پر شوربا گرا تھا۔ کسی طرف سے زمین اور دھوئیں کی سوندھی خوشبو چل رہی تھی۔

میں وہاں سے اُٹھ کر کھلیان کی طرف چلا گیا۔ سیب کے گھنے درخت پھلوں سے بالکل لدے ہوئے تھے اور پھول چُپ چاپ گھاس پر گر رہے تھے۔

تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ میں بھی گھر لوٹ آیا۔ بیرن بیٹھا اپنے پاؤں سینک رہا تھا اور بوڑھا سائیس دیہات کی کل کیفیت سُنا رہا تھا کہ کہاں بیاہ ہُوا ہے۔ کِس کے گھر لڑکا ہُوا۔ کون مرا۔ کونسی گائے نے بچہ دیا ہے۔ گیہوں کی قیمت کتنی کم ہو گئی ہے۔ جَو کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ناشپاتی کی فصل خراب ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ دیہاتی کھانا بہت لذیذ تھا۔ ہم نے خُوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھاتے کھاتے میری توجہ بیرن اور اُس سائیس کی محبت بھری باتوں کی طرف مبذول ہوئی۔

باہر ہوا کے جھونکوں سے درخت جھوم رہے تھے۔ ہمارے کتوں نے اصطبل میں غُل مچا رکھا تھا۔ بوڑھی ملازمہ سو گئی تھی۔ اتنے میں سائیس نے دریافت کیا اگر اجازت ہو تو میں جا کر سو رہوں کیونکہ رات کے وقت میں دیر تک نہیں جاگ سکتا۔ بیرن نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر کہا "ہاں ضرور سو جاؤ" لیکن بیرن کا اس قدر نرمی سے جواب دینا میرے دل میں کھٹکنے لگا۔ سائیس کے جاتے ہی میں اُس سے بغیر پوچھے نہ رہ سکا کہ اس سائیس کا تم پر کوئی بڑا احسان ہے؟

بیرن نے کہا یار اس سے بھی کہیں زیادہ اُس کا احسان ہے جس کے باعث میں اُس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ اگرچہ بات معمولی ہے لیکن رنجدہ بہت ہے۔ تم تو جانتے ہو والد سٹینا میں کرنل تھے۔ یہ اُس زمانے میں اُن کا اردلی تھا جب وہ ملازمت سے دستکش ہو گئے تو اُس کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئے۔ اُس کی عمر چالیس سال کی تھی اور ہم اُس وقت اپنے دیہات کے بنگلے میں رہتے تھے۔

میری اماں کے پاس لُوسی نام کی ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ اتنی خوبصورت لڑکی اب مجھے نظر نہیں آتی۔ جسم ایسا سڈول کہ کیا بیان کیا جائے ویسی لڑکیاں اب کہاں۔ اگر ہوں بھی تو بُری صحبت میں بیٹھ کر جلد خراب ہو جاتی ہیں، اور پھر ریل گاڑیوں کے چل جانے

کی وجہ سے تو اور خرابی ہو گئی ہے کیونکہ اب لڑکیاں ذرا سیانی ہوئیں اور شہر کی ہوا کھانے چلی گئیں۔ لہذا اب گھروں کے کام کاج کیلئے وہی بدصورت لڑکیاں رہ گئی ہیں جن کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ دوست وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی اور مجھے اس سے محبت تھی۔ اگرچہ میں نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔

کچھ ایسا ہوا کہ ہمارا یہ نوکر اُس پر بُری طرح لٹو ہو گیا۔ ہم نے بھی دیکھا کہ یہ ہمیشہ کچھ کھویا ہوا سا رہتا ہے اور دل ہی دل میں کچھ سوچتا رہتا ہے۔ والد ہمیشہ اُس سے پوچھا کرتے تھے کیوں زین کیا حال ہے طبیعت تو اچھی ہے؟ یہ کہدیا کرتا تھا سرکار کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔

رفتہ رفتہ وہ کمزور ہوتا گیا بعض دفعہ کھانا کھلاتے وقت اُس کے ہاتھ سے گلاس گر کر چُور چُور ہو جاتے تھے کبھی طشتریاں پھوٹ جاتی تھیں۔ ہمارا خیال تھا اُس کو کمزوری کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ والد صاحب نے ڈاکٹر کو بتایا۔ اُس نے ریڑھ کی بیماری تشخیص کی۔ والد نے اُس کو شفاخانہ بھیج دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

چنانچہ ایک دِن اُس نے کہا۔

حضور!

ہاں زین۔

سرکار میں دوا کھانا نہیں چاہتا۔

ہاں تو پھر؟

میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

والد کو بہت حیرانی ہوئی اور وہ اُس کی طرف پلٹ گئے۔

تم نے کیا کہا؟ کیا؟

مَیں شادی کرنا چاہتا ہوں سرکار۔

شادی! تو تم ——— تم کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ کیوں؟

بس سرکار بات تو یہی ہے۔

یہ سنتے ہی والد اس قدر زور سے ہنسنے لگے کہ والدہ بغیر دریافت کئے نہ رہ سکیں کہ اسقدر ہنستے کیوں ہو؟

اُنہوں نے کہا ذرا یہاں آؤ کوثرن۔ جب وہ اندر آئیں تو اُنہوں نے زین کی محبت کا ذکر کیا۔ والدہ کو ہنسی نہ آئی بلکہ اُس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اُنہوں نے دریافت کیا زین تم کس سے محبت کرتے ہو؟

اُس نے بیدھڑک کہدیا سرکار میں لُوسی سے محبت کرتا ہوں۔

والدہ نے کہا تم اطمینان رکھو میں تمہاری شادی کر دوں گی۔

اُنھوں نے لُوسی سے دریافت کیا تو اُس نے کہا مجھے زین کی اِس سنک کا پتہ چل چکا ہے اور وہ کئی دفعہ مجھ سے بھی کہہ چکا ہے لیکن کسی وجہ سے میں اُس کو ناپسند کرتی ہوں۔

اِس طرح دو مہینے گذر گئے والد لُوسی پر زور دیتے رہے کہ وہ زین سے شادی کر لے لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ اُس نے قسم کھا کر کہا کہ میں کسی سے محبت نہیں کرتی لیکن شادی نہ کرنے کی وجہ میں نہیں بتانا چاہتی۔ آخر والد کے زیادہ زور دینے سے وہ رضامند ہو گئی اور یہ لوگ اسی مکان میں جہاں ہم بیٹھے ہیں آباد کر دیئے گئے۔

کچھ عرصہ بعد یہ میاں بیوی یہاں سے اور کسی جگہ چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ ہُوا یہ کہاں رہے۔ کامل تین سال بعد اطلاع ملی کہ لُوسی قضا کر گئی۔ اس اثنا میں میرے والدین بھی رحلت کر چکے تھے۔ پھر اور دو برس تک میری زین سے ملاقات نہ ہو سکی۔

آخر ایک دن میں نے سوچا کہ اس علاقے میں شکار کھیلنے جانا چاہئے کیونکہ میرے نوکر کہا کرتے تھے کہ یہاں وافر شکار ہے۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی کہ میں اسی مکان میں آپہنچا۔ یہاں والد مرحوم کے اس پُرانے اردلی کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب اور رنج ہُوا۔ اُس وقت اُسکی عمر ۴۵ یا ۴۶ سال کی تھی۔

اِس وقت جہاں ہم بیٹھے ہیں میں نے اُسکے ساتھ کھانا کھایا۔ پانی مُوسلادھار برس رہا تھا چھت دیواروں اور کھڑکیوں پر بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔ اصطبل میں میرا کُتا اسی طرح بھونک رہا تھا جیسے اس وقت ہمارے کُتوں نے آفت مچا رکھی ہے اور جُونہی بوڑھی ملازمہ سونے کے لئے گئی اس نے مجھ سے کہا۔

سرکار

کہو زین

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

کہو ـــــ کہو کیا کہتے ہو؟

کیا کہوں بہت رنج ہوتا ہے۔

آپ کو میری بیوی لُوسی یاد ہے؟

ہاں مجھے یاد ہے۔

اُس نے آپ سے کچھ کہنے کو کہا ہے۔

کیا ـــــ!

آ ـــــ آپ اس کو ایک قسم کا اقبالِ جُرم ہی سمجھئے۔

تو کیا بات ہے ؟

میں ـــ میں ـــــ تو چاہتا ہوں کہ نہ کہوں لیکن کہنا ہی پڑے گا۔

سرکار وہ کسی بیماری سے نہیں مری بلکہ "بیرن مرض" نے اُس کو قبر کی آغوش میں سُلا دیا۔ مجھے بھی یہ بعد میں معلوم ہُوا۔ وہ جیسے ہی یہاں آئی، دُبلی ہوتی گئی۔ چھ مہینے میں تو یہ حالت ہوگئی کہ بالکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اتنا فرق ہوگیا تھا کہ میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ اُس نے دِل کی بیماری تشخیص کی۔ سینکڑوں روپے دوا درمن پر خرچ کئے۔ لیکن وہ دوا کھاتا ہی نہ چاہتی تھی۔ اُس نے کہا پیارے تم روپیہ فضول خرچ کر رہے ہو۔ اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

میں نے بھی دیکھا کہ ضرور کوئی اندرونی مرض اُس کو گھُن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ وہ اکثر پڑے پڑے رویا کرتی تھی۔ مجھے سُوجھتا ہی نہ تھا۔ کیا کروں۔ میں نے اُس کے لئے عمدہ عمدہ کپڑے اور رنگا رنگ کی اچھی اچھی چیزیں خریدیں کہ کسی طرح تو اس کا دِل بہل جائے لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں۔ آخر میں نے سمجھ لیا کہ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتی۔

ایک دِن کا ذکر ہے نومبر کی رات تھی اور خوب برفباری ہو رہی تھی۔ تمام دِن وہ بستر پر ہی پڑی رہی۔ اُس نے مجھے اپنے قریب بُلا کر کہا ایک پادری کو بلا لاؤ۔ میں جا کر بُلا لایا۔ جیسے ہی وہ آیا اُس نے کہا "دیکھو زین میں نے تم کو کبھی دھوکا نہیں دیا۔ نہ شادی سے پہلے اور نہ بعد۔ پادری صاحب اس بات سے واقف ہیں اور یہ میرے گواہ ہیں۔ میری موت کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں اُس بنگلے سے دُور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ مجھے بیرن دو ترولی سے بہت محبت تھی ـــــ بیحد محبت اگرچہ انہیں معلوم نہ تھا ـــ بس یہی مرض مجھے مُوت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔ جب سے میں اُن کے دیدار سے محروم ہوئی اُسی وقت سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب زندگی دشوار ہے۔ اگر اُن کا دیدار ہو جاتا تو ممکن تھا بچ جاتی۔ بس ایک بار اُن کو نظر بھر کر دیکھنے کی تمنا باقی ہے۔ میرے بعد تم اُن سے کہدینا۔ دیکھو ضرور کہنا۔ میری قسم کھاؤ کہ کہہ دو گے۔ اچھا تو پادری صاحب کے سامنے قسم کھاؤ۔ اگر اُن کو اس کا علم ہو جائے کہ کُوسی اُن پر سے قربان ہوگئی تو میری رُوح مطمئن ہو جائے گی۔ اب قسم کھاؤ۔

پھر تو سرکار میں نے قسم کھالی اور صداقتِ قلب سے یہ بات آپ پر ظاہر کرنے کے لئے ابھی تک اپنے دِل میں چھپائے رکھی۔

یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُس شبِ تاریک میں یہ جگر پاش کہانی سُن کر میرے دِل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ میں دیوانہ وار چیخ اُٹھا "زین زین"! اُس نے دھیمی آواز میں کہا "اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم مجبور ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔" اُس کا ہاتھ پکڑ کر میں رونے لگا۔

اُس نے دریافت کیا اُس کی قبر کو دیکھئے گا ؟

مَیں نے سر کی جُنبش سے جواب دیا۔ مُنہ سے تو کچھ کہہ ہی نہ سکتا تھا۔

اُس نے اُٹھ کر بتّی روشن کی اور اُس خوفناک اندھیری رات میں جب کہ آسمان سے بڑی بڑی بُوندیں گر رہی تھیں ہم اُس ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں چل پڑے۔ اُس نے پھاٹک کھول دیا مجھے سامنے سیاہ لکڑی کی صلیب نظر آئی۔ اُس نے کہا "بس یہی ہے"۔ قبر پر سنگِ مرمر کا کتبہ لگا تھا۔ اُس نے اُس پر قندیل رکھدی تاکہ میں کھُدے ہوئے الفاظ پڑھ سکوں۔

"لُوسی ہارٹینسی میریڈینٹ زین فرانسس کی بیوی تھی۔ وہ بہت وفاشعار عورت تھی۔ خدا اُس کی رُوح کو خوش رکھے"

قندیل کے دونوں طرف ہم گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں کھڑے تھے۔ میری آنکھیں سنگِ مرمر کے تعویذ پر بکھرتی ہوئی بوندوں کو دیکھ رہی تھیں اور دِل میں مرحومہ کی پاک محبت کا تصوّر تھا۔

اُسی وقت سے میں یہاں ہر سال آتا ہُوں اور نہ معلوم کیوں اپنے کو بوڑھے سائیس کا احسان مند سمجھتا ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں بھی ہمیشہ آنسو بھرے رہتے ہیں۔

(فرانسیسی) (تقی علی یاسمی)

عیادت

بیماری کا حال کیا پُوچھتے ہو۔ تمہارے آنے کی خوشی کی وجہ سے میرے دِل کی تکلیف کم ہوگئی ہے۔ کاش تم مجھے مل جاؤ تو کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ اگر جُدائی رہی تو سمجھ لو کہ دوا بھی فائدہ نہیں کر سکتی۔ پھر وہی بُرا حال ہوجائے گا لیکن میں چاہتی ہوں کہ اب اسی طرح بیمار رہوں۔ یہ نہ پُوچھو کیوں ؟

جمیل

پپیہے سے

جی بیکل، سینے میں دھڑکن، اُلجھے سر کے کیس[1]
پتہ نہیں، شیشے میں دِل کے، لگی کدھر سے ٹھیس
سُن رے پپیہے، پریم کے پالک، پریمی کا سندیس

آپ ہی آپ یہ جی گھبراوے، کہیں نہ آنا جانا
اپنے کو بھی بھُول گئے ہم جب سے اُنہیں پہچانا
ہاں رے پپیہے، پریم کے پالک، گادے پریم کا گانا

پھُول کھِلے، فوّارے چھُوٹے، رنگ برنگی کیاری
پھرتی ہے آنکھوں میں جیسے کسی کی صُورت پیاری
سنبھل پپیہے، پریم کے پالک، اب ہے تیری باری

جب سے دِل کی دُنیا سُونی، سُونا سارا دیس
خبر نہیں، کیوں دل نے آخر لیا بروگ کا بھیس
سُن لے پپیہے، پریم کے پالک، پریمی کا سندیس!

(مقبُول)

[1] کیس یعنی بال

مسولینی کا جانشین

کیا گرانڈی، بالبو، اسٹریلیس، یا ان میں سے کوئی ایک مسولینی کا صحیح جانشین متصوّر ہو سکتا ہے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس پر دُنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نپولین بُونا پارٹ کی مَوت کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ دُنیا اٹلی کے اس مدبرِ اعظم کی موت کے بعد کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ فسطائیت کا بانی مستقل مزاج ہے۔ اس کے ارادے کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ اولوالعزمیاں اور کامیابیاں ہر قدم پر اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ اس کی مثال آپ یوں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ فسطائیت کی ہوا ۱۹۱۹ء میں مائلن سے چلی اور ۱۹۲۳ء میں سارے اٹلی پر اس کی کامل فتح تسلیم کر لی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ یورپ کے اکثر شہروں میں فسطائیت کا اثر اور خیر مقدم دیکھا جا سکتا ہے۔

فسطائیت اور مسولینی کی مَوت، یہی وہ دو اُمور ہیں جن پر عوام و خواص غور و خوض کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ مسولینی کی موت کے ساتھ ہی فسطائیت کی بھی مَوت واقع ہو جائیگی کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مسولینی جیسے مصلح قوم کی شخصیت ہی اس پُرجوش و عظیم جذبہ (فسطائیت) کے قیام کی کفیل ہو سکتی ہے۔ انہیں یہاں تک اس خیال کی صحت پر یقین ہے کہ وہ علی الاعلان اپنے مخالفوں کے مُنہ پر کہتے ہیں کہ کون ہے جو مسولینی سے ٹکر کھا سکتا ہے؟ اٹلی بھر میں کون ایسا شخص ہے جو اس کا حقیقی معنوں میں جانشین ثابت ہو سکے گا اور اس کے پھیلائے ہوئے کارخانہ کو سنبھالنے کی اہلیت پیدا کر سکے گا؟ ان کی نظریں مسولینی کے ہم پلّہ شخص کی تلاش میں ناکام رہتی ہیں۔

اس کے ساتھ ایک دُوسرا گروہ موجود ہے جس کا خیال ہے کہ فسطائیت کی گرانڈ کونسل اور اٹیلین کیبنٹ ضرور ایسے اشخاص کے انتخاب میں کامیاب ہو سکے گی جو بین الاقوامی شہرت و عزّت و اثر کے حامل ہوں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ کوئی شخص فسطائی پارٹی کا صدر بھی بن سکتا ہے، وزیرِ اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز ہو سکتا ہے، اٹلی کا مختارِ مطلق بھی ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں مسولینی کی رُوح کہاں موجُود ہو گی؟

برسرِ اقتدار ہونے کے بعد مسولینی نے پہلا کام یہ کیا کہ ملک کے اعلیٰ خزانوں کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں یعنی نہ صرف وہ وزیرِ اعظم و مختارِ عام بنا بلکہ اس نے وزارتِ خارجہ اور برّی و بحری قوّتوں کو بھی اپنے قبضہ میں رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ مسولینی حکمتِ عملی اور سیاسی چالوں میں بہت زیادہ طاق نہیں ہے لیکن فوجی اثر و اقتدار امنِ عامّہ اور قوانین کے قائم رکھنے میں اس سے زیادہ موزوں شخصیت دوسری نظر نہیں آتی۔ اُسے اپنے احکام کی تعمیل کرانے میں یدطُولیٰ حاصل ہے۔

گرانڈی یہ تو ظاہر ہو گیا کہ اٹلی کو مسولینی سا شخص مشکل سے میسّر ہو گا۔ قرینہ سے یہ پایا جاتا ہے کہ امورِ ملکی مختلف وزارتوں میں منقسم ہو جائینگے اور یہ وُزراء کافی مقتدر اور ہر دلعزیز ہونگے۔ رائے عامہ ان کی تائید میں رہیگی۔ ان سب میں مشہور دِسنیو گرانڈی ہے

جو آج کل سفیر اٹلی کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم ہے۔ گرانڈی نے شہرت کے زینے بتدریج طے کئے ہیں۔ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہے۔ وزیر خارجہ اٹلی ہونے کی حیثیت میں اس نے اپنی سیاسی چالوں سے مختلف کامیابیاں حاصل کیں۔ اب سے دو سال پہلے سولینی نے جب وزارتِ خارجہ کا عہدہ اسکے ہاتھوں سے لے لیا تو عام طور پر یہ خیال کیا گیا کہ اس کا درجہ گھٹا دیا گیا ہے اور وہ معرضِ تنزل میں ہے۔ لیکن در حقیقت ایسا نہ ہوا بلکہ وہ فسطائی گرانڈ کونسل میں نمایاں اثر رکھتا ہے اور اس وقت جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے سفیر کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم ہے۔ گرانڈی کی شہرت مسلم تو ہے لیکن یہ شہرت غیر ملکی معاملات میں کامیابیوں کے حصول کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ممالک میں اس کی شخصیت کافی راسخ ہے لیکن اس کے ساتھ اسی نسبت سے وہ اپنے ہم وطنوں میں کم مقبول ہے۔ سیاسی تدبر میں اس کا درجہ بہت بلند ہے لیکن فسطائی سلطنت کے صدر کو سخت گیر اور تسلط پسند شخصیت کا حامل ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی قوت سے ہمیشہ باخبر رہے اور اپنی طاقت کا اندازہ دوسروں کو بھی کراتا رہے۔ یہ خصوصیات گرانڈی میں مفقود ہیں۔

مارشل اٹالو بالبو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بالبو مسولینی کا جانشین ہو سکتا ہے۔ اس کی غیر معمولی شہرت اسکے کمالِ فن کی رہینِ منت ہے۔ دُنیا کا سب سے کمسن ہواباز ہونے کے باوجود اس نے غیر معمولی پروازیں کیں اور دُنیا کو اٹلی کی ہوائی قوت سے آگاہ کیا۔ اس سے نہ صرف اٹلی کو شہرت حاصل ہوئی بلکہ بالبو بھی دُنیا کے سامنے آ گیا۔ بالبو ایک فوجی آدمی ہے اور بہترین خوبیوں کا مالک لیکن سیاست داں نہ ہونے کی وجہ سے کیا پبلک اس کی عزت کریگی؟ یہ سوال زیرِ غور ہے۔ بالبو میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو گرانڈی میں مفقود ہیں۔ موجودہ حالت میں اس کا منصب لیبیا کی گورنری ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ وزیر افواج ہو جائے۔ لیکن وہ جس قدر فوجی چالوں سے واقف ہے اسی قدر سیاسی چالوں سے ناواقف ہے۔

اسٹریلس اٹلی کا ایک اور اہم ترین آدمی باقی رہ گیا ہے۔ یہ قومی فسطائی پارٹی کا سکرٹری ہے اور کیبنٹ اور گرینڈ کونسل کا ممبر بھی ہے۔ پارٹی کے احکام جاری کرنا اور پارٹی کے انتظام پر قابو رکھنا بھی اس کے اہم کام ہیں۔

مسولینی کے بعد اس کا جانشین فسطائی گرانڈ کونسل کے ذریعہ سے منتخب ہوگا۔ یہ یقینی ہے کہ کونسل ایک تجربہ کار اور قابل آدمی کا انتخاب کرے گی۔ صرف وہی شخص مسولینی کا جانشین ہو سکتا ہے جو نوجوان ہو اور بین الاقوامی شہرت، عزت، اثر اور سیاسی و فوجی اقتدار کا حامل بھی ہو اور اٹلی کی معتدبہ قوت اس کی تائید میں ہو۔ اسٹریلس یعنی پارٹی کا موجودہ سیکرٹری ان خصوصیات کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اٹلی کے طول و عرض میں غیر معمولی شہرت کا مالک ہے۔ ملک کے ہر سرد و گرم سے اس کا تعلق ہے۔ تنومند ہونے کے علاوہ ذہین اور زبردست اہلِ قلم بھی ہے۔

شاید یہی شخص مسولینی کا جانشین ہو!

(ترجمہ) منیر الدین حیدرآبادی

بے وفائی

"بے وفائی" لارڈ بائرن کی مشہور نظم "When we two parted" کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ "Vers Libre" یا آزاد نظم میں ہے جو دورِ جدید کی انگریزی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، اردو میں ابھی اس کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ نظم بحرِ ہزج میں ہے اور ہر مصرعہ کو حسبِ ضرورت مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بعض مصرعے قدرتی طور پر سالم بھی آگئے ہیں۔ ایک آہنگی کو دور کرنے کے لئے ہر بند کے اخیر میں "مفاعیلن فعولن" کے وزن پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا دانستہ رکھا گیا ہے۔ (ح ۔ ط)

(۱)

شکستہ دل،
خموش، آنکھوں میں آنسو!
ہوئے اس طرح برسوں کیلئے ہم
جُدا۔
کملا گئے تھے
فرطِ غم سے
ترے گلہائے عارض
لمس جن کا
رواں کرتا تھا لہر افسردگی کی
رگ و پے میں۔
کھلی اب یہ حقیقت،
غمِ انجام کا اک آئینہ تھا
جُدائی کا وہ لمحہ!

(۲)

سحر کا وقت تھا،
مری جبیں پر
مگر،
پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔
نہ تھی شبنم،
حسیں فطرت،
ستمگر!

تری اُس بے وفائی پر تھی گریاں
مجھے احساس اب جس کا ہوا ہے۔
تیرے وعدے کہاں ہیں؟
تیری شہرت
فقط افسانہ بن کر رہ گئی ہے!
کسی سے نام سُنتا ہوں جو تیرا
جُھکا لیتا ہوں گردن!

(۳)

پیامِ مرگ ہے یہ نام مجھکو!
مرا دل
خوفِ رسوائی سے لرزاں!
تجھے چاہا تھا میں نے اس قدر
کیوں؟
وہ تیرے نوگرفتارانِ اُلفت،
جو کرتے ہیں ترا ذکر آ کے مجھ سے
انہیں معلوم ہو یہ راز
اے کاش!
مجھے بھی تجھ سے تھی اِک دِن محبّت!

جفاؤں کو تری کوسوں گا اکثر
زبانِ حال سے مَیں!

(۴)

مِلے تھے
ہم زمانے کی نظر سے
نہاں ہو کر،
یہی حالت ہے اب بھی:
تری بیداد کا کرتا ہُوں ماتم
مگر،
چُپ چاپ، تنہا!
کیا خبر تھی
فریبِ حُسن کی؛
گر اتفاقاً
مِری تقدیر میں ہو تجھ سے مِلنا،
پس از مدت جو تجھ کو دیکھ پاؤں،
مِلوں اس طرح سے اے بیوفا! میں:
خموش، آنکھوں میں آنسو!

(حفیظ ہوشیارپوری)

تصویر کی چوری

لیڈی ڈین نے کہا "اگر یہ تصویر کوئی دن اور یہاں لٹکی رہی تو مجھے پاگل خانے میں جانا پڑے گا!

"میں سچ کہتی ہوں میری بھوک زائل ہوگئی ہے اور دماغ چل گیا ہے اور اس کی وجہ محض یہی تصویر ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بڑی رنگین تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنہری چوکھٹے میں لگی ہوئی کھانے کے کمرے میں سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔

سرجمو شافیٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

لیڈی ڈین کے علاوہ قصبے کے سارے باشندے اس تصویر سے سخت متنفر تھے۔ اس پر ایک ہزار پونڈ صرف ہوئے تھے اس کو تیار ہوئے دو سال گذر چکے تھے اور اب بھی بازار میں آٹھ سو سے کچھ زیادہ پونڈ وصول ہو سکتے تھے کیونکہ یہ ملک کے مایۂ ناز مصور کریسیج کا مشہور شاہکار تھا۔ یہ سرجمو شافیٹ کے اس زمانہ کی یادگار تھی جب وہ شہرت و عزت کے بام رفیع پر متمکن تھے۔ ملک میں اُن جیسی کامیابی کبھی کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ ڈین اینڈ برادرز کمپنی میں جو مٹی کے برتنوں کی ساخت کا سب سے بڑا کارخانہ تھا متعدد حصص کے مالک تھے۔

اوائل عمر میں سرجی کو حصول زر کے لئے سخت صبر آزما مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی بڑی کڑی تکلیفیں اُٹھائیں آخر آہستہ آہستہ اُن کی کاوشیں پھل لانے لگیں چنانچہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ ملک کا متمول ترین شخص ان سے لگا نہ کھا سکتا تھا۔ قصبے کے باشندے ان کی سادہ لوحی کو ہزار دفعہ کم عقلی سے تعبیر کریں اور اُن کی ہمہ گیر سخاوت و مروت پر لاکھ آوازے کسیں مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہ ملک کے معروف ترین امیر تھے۔ یہ ان کی سادہ لوحی و کشادہ دلی ہی کا فیضان تھا کہ اس وقت دولت اُن کے دروازے پر جھاڑو دیتی تھی اور شہرت قدموں میں لوٹتی تھی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تین دفعہ وہ کونسل کے اعلےٰ صدر منتخب ہوئے۔ ملک کے سارے یتیم خانے اور سکول ان کی جیب کے مرہون منت تھے۔

جب وہ تیسری دفعہ صدر اعلےٰ منتخب ہوئے تو عوام نے انہیں اس شاندار کامیابی پر ہدیہ تہنیت پیش کرنے کا مشورہ کیا۔ اس ہدیے کی نوعیت پر بڑی قیل و قال ہوئی۔ کئی تجاویز پیش کی گئیں مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکلا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد لوگوں نے سرجی کی ایک شاندار قلمی تصویر بنوانے پر زور دیا۔ یہ سُن کر سرجی نے اپنے آئینے سے مشورہ کیا۔ اس بیچارے نے از راہ ہمدردی بہت کچھ صدائے احتجاج بلند کی مگر لوگوں کے اصرار بلیغ کے سامنے ایک نہ چلی اور سرجی نے بادل ناخواستہ سر تسلیم خم کر دیا۔

ایک ہزار پونڈ کے عوض اعجاز نگاہ مصور کریسیج کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ حُسن کار رنگوں کے استعمال میں وحید النظیر تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اس کے مُوقلم نے دستِ مسیحائی سے اکتساب فیض کیا ہے کیونکہ وہ اپنی تصاویر میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ تصویر کے چہرے پر اندرونی جذبات واحساسات کو نمایاں کر دینا اس کا سب سے بڑا کمال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رائل اکیڈمی میں اس کی تصاویر نے کئی دفعہ اعلےٰ انعامات حاصل کئے تھے۔

کریسیج نے معمولی شرائط پر سرجی کی شبیہ کھینچنا منظور کر لیا۔ شرائط یہ تھیں کہ ایک تو سرجی کو تصویر بنوانے کے لئے کریسیج کے پاس ایک گاؤں میں جانا پڑے گا۔ دوسرے رائل اکیڈمی کی نمائش سے پہلے کوئی شخص تصویر دیکھنے کا مجاز نہ ہوگا۔ سرجی ہر روز بیڈ فورڈ شائر جانے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں تصویر تیار ہو گئی۔ اُنکے احباب کا چشم دید بیان ہے کہ آخری دن جب وہ گاؤں سے آئے تو بہت افسردہ خاطر تھے۔ اسی طرح جب کمیٹی کے ممبر شاداں وفرحاں تصویر دیکھنے گئے تو واپسی پر بہت ملول اور اُداس نظر آتے تھے۔ عوام نے تصویر کے متعلق بہت کچھ استفسار کیا مگر کسی کو شافی وتسلی بخش جواب نہ ملا۔

آخر نہایت اشتیاق آمیز انتظار کے بعد تصویر رائل اکیڈمی میں پیش ہوئی۔ سرجی لمبا ریشمی لبادہ پہنے تھے سینہ پر متعدد سنہری تمغے بہت خوشنما نظر آتے تھے مگر سب سے زیادہ جاذب نظر طلائی گھڑی کی مرصع زنجیر تھی۔ حاضرین کا خیال تھا کہ سرجی کی شبیہ عہدِ حاضر کا لاجواب شاہکار ہے اور ارتقائے مصوری کا بہترین نمونہ۔ سرجی اور نمائندوں کی کمیٹی پر تحسین وتوصیف کے پھول نچھاور کئے گئے مگر خدا معلوم تمام اراکین ان طویل ومسجع تعریفی فقروں کو کیوں طفل تسلیوں سے تعبیر کرتے تھے۔ خاصکر سرجی تو اپنے قدردانوں کی مبارکبادوں میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کرکے چونک چونک پڑتے اور کسی سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کرتے۔

ایک ماہرِ فن نقاد نے کہا "اس بار تو کریسیج نے تصویر کو فطری رازہائے سربستہ کا آئینہ دار بنا دیا ہے"

دوسرے کا خیال تھا "سرجی کے اندرونی جذبات تصویر کے چہرے پر صاف رقص کرتے نظر آتے ہیں"

تیسرے نے کہا "سرجی کی آنکھوں کے ایک ایک ڈورے میں انکی گذشتہ زندگی کے تاثرات منعکس ہو رہے ہیں"

جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ کیا کچھ نہ کہا گیا اور کیا کچھ نہ سُنا گیا۔

قصبے کے باشندے بھی تصویر دیکھنے لندن آئے۔ آخر بیچاروں نے چندہ جو دیا تھا۔ وہاں پہنچکر اُنہوں نے دیکھا کہ ایک بڈھا کھوسٹ جھریوں سے اٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ داڑھی پائپ کے دھوئیں سے بھوری ہو کر سخت بدنما ہو گئی ہے ہونٹوں کو کچھ اس طرح سے بند کر رکھا ہے جیسے مُنہ میں ایک دانت نہیں۔ رخسار پچکے ہوئے ہیں۔ ایک شریر لڑکے نے تو صاف کہہ دیا "شرط بدتا ہوں گالوں میں پُورے پاؤ بھر چنے سما جائیں" ماتھے پر لاتعداد شکنوں کا بنا ہوا جال لگا رکھا ہے جس میں دیکھنے والے کا طائرِ نظر پھڑپھڑا کر رہ جائے۔ کان دو مُونگے کی سیپیوں کی طرح ہیں اور ناک جُھک کر دہنِ مبارک میں جھانک رہی ہے

اور آنکھوں کا تو کہنا ہی کیا دُور تک دھنستی چلی گئی ہیں اور اس طرح چمکتی ہیں کہ بے اختیار یاد آتا ہے ؎
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہوگیا

یہ ہیں وہ آرا جو آرٹ سے بے بہرہ دیہاتیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق قائم کیں بعض ستم ظریف لڑکے تو مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔ کئی اُجڈ گنواروں نے اپنے لٹھوں کے سروں سے تصویر کا مُنہ چڑانا شروع کیا۔ قریب تھا کہ تصویر نیچے گر پڑے مگر خیریت ہوئی کہ پولیس نے انہیں گیاری کے پیچھے دھکیل دیا۔ یہ دیکھکر سرجی بہت جھلّائے۔ سنجیدہ مزاج بوڑھوں اور فہمیدہ اشخاص نے سرجی کے لئے نہیں بلکہ لیڈی ڈین کے لئے جو اپنی خوش خلقی، غریب پروری و نیک مزاجی کے باعث سرجی سے کہیں زیادہ مقبول تھیں دل ہی دل میں ہمدردی کا اظہار کیا۔

تصویر جب عوام کی طرف سے سرجی کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی گئی تو لیڈی ڈین بصد دقت ان کی تالیف قلوب کے لئے چہرے پر مصنوعی تبسّم و تشکّر کے آثار پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور طبیعت حاضر کر کے دو تین فقرے بھی فی البدیہہ بول کر ہی لئے۔ اس طرح پیش کش کی رسم ادا کی گئی +

اسے سینڈ کاسل میں آویزاں ہوئے سولہ مہینے گزر چکے تھے۔ جب لیڈی ڈین نے کہا کہ تصویر کی موجودگی سے میں عقل و حواس کھو بیٹھونگی تو سرجی نے جھلّا کر کہا" بیوی! تم تو بیوقوف گنواروں سے بھی گئی گذری ہو۔ کوئی مجھے لاگت سے دس گنی قیمت دے جب بھی میں اسے جُدا نہیں کرنے کا" مگر یہ سفید براق بنگلے کے پرسار دُھلا دُھلایا استری کیا ہُوا جھوٹ تھا۔ سرجی کو درحقیقت تصویر سے خدا واسطے کا بیر تھا مگر وہ اِس کا اظہار کس مُنہ سے کرتے۔ وہ تصویر کو جلانے کی خاطر سارے محل کو آگ لگانے پر آمادہ تھے، مگر کل ہی شام کو انہیں ایک کم خرچ و بالانشین تجویز سُوجھی تھی جسے عملی جامہ پہنانے پر وہ تُلے ہوئے تھے۔

لیڈی ڈین نے ایک سرد آہ بھری اور کہا" مگر آج تم خلاف معمول بہت سویرے شہر کو جا رہے ہو"

سرجی نے عالمِ محویت میں جواب دیا" ہاں آج میں کچہری کا اجلاس کروں گا"

وہ شہر کی عدالت عالیہ میں چیف جسٹس تھے۔ شہر جاتے ہوئے انہوں نے اپنی تجویز کے ہر پہلو پر خوب غور و خوض کیا۔ وہ انہیں غیر مانوس و وحشیانہ سی معلوم ہوئی مگر اس کے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔

آج صبح سرجی نے کرسی عدالت پر رونق افروز ہو کر مجسٹریٹ کے کلرک مسٹر شیرٹ کو بڑا صدمہ پہنچایا اور ساتھ ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر نوبران کی اُمیدوں اور تمنّاؤں پر بھی پانی پھیر دیا۔

ایک مہینہ سے شہر میں متواتر نقب زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں جن سے تمام شہر میں دہشت اور سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ نقب زنوں کے ہاتھوں سخت پریشان تھے۔ پولیس بھی باوجود انتہائی کوشش کے اس خطرناک گروہ کا سراغ لگانے میں بُری طرح ناکام رہی۔ محکمہ کے تمام افسر پبلک کے ہدفِ مطاعن بنے ہوئے تھے۔ آخر مسٹر لوبران کے ایک ماتحت نے بڑی جانبازی و بہادری سے ایک نقب زن کو اسیر کیا جو اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس پر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مسٹر لوبران پر تحسین و آفرین کے موتی نچھاور کئے۔ وفورِ مسرت سے وہ جامے میں پھولا نہ سماتا تھا غرور سے تن تن کر اپنے قیدی کو ہتھکڑیاں لگائے وہ شہر کے ہر گلی کوچے سے گزرا۔ ملزم نے اپنا نام ولیم سمتھ بتایا مگر اس کی حرکات و سکنات ایسی پُراسرار اور مشتبہ تھیں کہ کسی کو اس سے بات تک کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مسٹر لوبران اور مسٹر شیرٹ کو کتنی مایوسی ہوئی ہو گی جب سر جی نے اپنے تمام اختیارات بروئے کار لاکر ملزم کے خلاف ساری شہادتوں کو لغو و بے بنیاد قرار دے کر اسے صاف بری کر دیا۔ اس پر سارے شہر میں کہرام مچ گیا مگر سر جی کا فیصلہ اٹل تھا۔ جب اجلاس برخاست ہوا۔ تو سر جی نے ملزم کو از راہِ ہمدردی و دلجوئی اپنے پرائیوٹ کمرے میں بُلا بھیجا۔ عوام کا خیال تھا کہ وہ اپنی ناجائز مروّت سے اس بدمعاش کو اور زیادہ شہ دے گا۔

ایک سپاہی ولیم سمتھ کو سر جی کے کمرے میں لے آیا۔ جب وہ واپس ہونے لگا تو سمتھ نے اسے ایک فحش گالی دی سپاہی غیظ و غضب سے تلملا کر رہ گیا مگر چیف جسٹس کی پیشانی پر بل نہ پڑا۔

سر جی نے اپنی کہنی کا سہارا لے کر مرعوب کُن آواز میں کہا "مسٹر سمتھ تم جانتے ہو آج کی صبح تمہارے لئے کتنی مبارک تھی" اور اس کی طرف ادائے بے نیازی سے دیکھا۔

سمتھ دروازے کے پاس ہاتھ میں ٹوپی لئے کھڑا تھا۔ قرائن سے اسیر نقب زن کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ کسی دفتر کا کلرک معلوم ہوتا تھا جس نے مدت سے اپنا کام چھوڑ رکھا ہو۔ وہ ایک بوسیدہ سُوٹ میں ملبوس تھا۔ کلائی اور گلے پر سے کوٹ پھٹا ہوا تھا۔ ململ کا کالر مَیل سے بھورا ہو رہا تھا۔ اسکے بال چپکے ہوئے تھے اور ہاتھ بہت گندے تھے۔ ابھی وہ بالکل نوخیز تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔

اس نے بے پروائی سے کہا "ہاں گورنر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

سر جی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ چیف جسٹس کونسل کا صدرِ اعلےٰ ملک کا معروف ترین شخص اور اس سے یہ طریقۂ تخاطب۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے خود ہی اس کی بے گناہی کو ثابت کر دیا تھا اب مسٹر سمتھ بالکل آزاد تھا اور اپنی مرضی کے مطابق ہر ایک سے اپنے پسندیدہ لہجے میں کلام کر سکتا تھا۔ اس کے اندازِ تکلم سے لاابالیانہ پن ٹپکتا تھا مگر سر جی ذرا دب سے گئے کیونکہ انہیں اس سے ذاتی غرض تھی۔

سر جی نے کہا "کیا میں تمہاری کسی طرح مدد کر سکتا ہوں؟"

سمتھ نے کہا "تمہارا دامِ تزویر یہاں کام نہیں کر سکتا۔ میں کسی قیمت پر بھی اپنا شغل ترک نہیں کرنے کا۔ تمہیں معلوم

ہے کہ ہمارا پیشہ شراب کے نشہ کی طرح ہے۔ ہر قید کا حکم ہمارے لئے جرعۂ دو آتشہ ہوتا ہے۔ میں مالی امداد سے بے نیاز ہوں اور میرے پاس تمہارے ایسے خود نما لوگوں سے زیادہ روپیہ موجود ہے۔"

سرجی نے جرأت کر کے کہا "مجھے یقین ہے کہ نقب زنی کچھ زرخیز پیشہ نہیں ہے"۔

اس پر سمتھ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا " او ہو نہایت زرخیز۔ میں تمہاری طرح روپیہ کندھے پر تھوڑا ہی اُٹھائے پھرتا ہوں۔ اِدھر نقدی آئی اُدھر جائداد کی صُورت میں تبدیل ہو گئی۔"

سرجی نے کہا "خیر ایسا ہی ہو گا۔ بہرحال یہ ذریعۂ معاش ایک امرِ معیوب ہے"۔

سمتھ نے چمک کر جواب دیا "کیا یہ سچ ہے، لوگ اسے کیا کیا نہیں کہتے۔ مجھے بھی ایک بھلے مانس دوست نے کہا تھا کہ چوری کی عادت ایک ناقابلِ علاج بیماری ہے۔ میں نے اسے بارہا لکھا کہ میرے لئے ایک درجن اعلےٰ شراب کی بوتلیں بھیج دو تاکہ اس کے استعمال سے جراثیم غلبہ نہ کرنے پائیں۔ مگر اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔"

"کیا کبھی جیل کی ہوا بھی کھائی؟"

"کبھی نہیں۔ مگر اس دفعہ نصیحت آگئی ہے۔ جو کہنا ہو جلدی کہہ دو۔ کیونکہ میں لایعنی گفتگو میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

"اس کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔

سمتھ سرجی کے بالمقابل ایک کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی کہنیاں بعینہٖ اسی کے مانند میز پر ٹکا دیں۔

سرجی نے کہا "کیا تم ایک چوری کرو گے جو قانون کے سراسر منافی نہیں"۔

سمتھ نے حیرت سے کہا" جسٹس ہوش کی باتیں کرو"۔

سرجی نے بے پروائی سے کہا "میرے سینا ڈ کاسل کے کھانے کے کمرے میں ایک تصویر لٹکی ہوئی ہے میں چاہتا ہوں وہ چرا لی جائے۔"

"چرا لی جائے؟"

"ہاں میں اسے اپنے پاس سے جُدا کرنا چاہتا ہوں مگر برملا ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تمام لوگوں کا ہدیہ ہے میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ وہ سچ مچ چرا لی گئی۔"

"او ہو! یہ تو دغا بازی ہوئی۔ اس طریقہ سے عوام کو بہکاؤ گے کیا! اچھا بالفرض میں یہ مان بھی لوں تو میرا عوضانہ کیا ٹھیرا؟"

"اے عقل کے دشمن یہ تصویر نہایت قیمتی ہے۔ایک ہزار پونڈ کے عوض بنوائی گئی تھی۔اگر آج تم اسے امریکہ لے جاؤ تو کم از کم آٹھ سو پونڈ وصول کر سکتے ہو۔" اس کے بعد سرجی نے شروع سے اخیر تک تصویر کی رام کہانی کہہ سنائی۔

"مگر تم اسے الگ کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"اس سے تمہارا کیا مطلب؟ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"اچھا اگر میں نے چرا بھی لی تو اسے بیچوں گا کہاں؟ کیا چھاتی سے لگائے ملکوں ملکوں لئے پھروں گا۔"

"ارے نادان ایک سال اپنے پاس رکھنا۔بات گئی گذری ہو گئی تو امریکہ جا کر بیچ دینا۔وہاں آرٹ کے قدردان اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

ولیم سمتھ یہ سن کر کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا۔یکلخت کسی خیال کے آنے سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔اندرونی مسرت کو بمشکل ضبط کر کے اس نے سرجی سے کہا۔

"گو میرے لئے یہ نفع بخش چوری نہیں مگر تمہارے احسان کا بدلہ اتارنے کے خیال سے کر گزروں گا۔"

سرجی نے خوش ہو کر جواب دیا "تم کب تک اس کام کو سرانجام دے سکو گے۔آج رات نہ آؤ گے؟"

سمتھ نے سوچتے ہوئے کہا "نہیں آج رات مجھے فرصت نہیں اور شاید کل رات بھی نہ ہو۔"

سرجی نے حیران ہو کر پوچھا "تم لوگ بھی اتنے معروف ہوتے ہو"؟

"تم عجیب خیال کے آدمی ہو۔کام کئے بغیر بھلا ملتی ہے۔پرسوں رات تمہارا کام کر دوں گا مگر وہ کرسمس کی رات ہو گی۔"

"کیا ہوا اگر سمس کاٹ کھائے گا کیا؟"

"اچھا جس طرح تمہاری مرضی۔"

سرجی نے مطمئن ہو کر کہا "مگر میرے مکان کا نقشہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔مجھ سے آنے جانے کے راستوں کے متعلق بھی استفسار کر سکتے ہو۔"

"تمہیں اس سے کیا غرض؟ میں جانوں اور میرا کام۔مگر سر جسٹس ایک بات میرے دل میں کھٹکتی ہے بعد میں مجھے الزام دو گے کہ محسن کے گھر نقب لگائی۔"

سرجی ہنس دیئے "بالکل نہیں اس قسم کی چوری تو قانوناً بھی جائز ہے میں اسے تمہارا احسان جانوں گا۔"

---

۲۴ دسمبر کی شام کو سرجی اپنے کاسل میں واپس آگئے۔ ان کی بیوی لیڈی ڈین سفر کے لئے اسباب وغیرہ بندھوا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کرسمس اس دفعہ اپنے بڑے بیٹے جان کے مکان پر جو قصبے کے شمالی حصے میں واقع تھا بسر کریں۔ سرجی نے اپنا راز بیوی سے محفوظ رکھا۔ وہ اس خیال سے اندر ہی اندر مسرور رہتے کہ کس طرح لیڈی ڈین تصویر کو کرے میں نہ پاکر مسرت انگیز تحیر سے اچھل پڑیں گی۔ جب سارا انتظام ہوچکا تو سرجی نے کہا۔

"میں اس شام کو جان کے ہاں نہیں جاسکتا۔ سارا دن کرسیٔ عدالت پر بیٹھے بیٹھے طبیعت مضمحل ہوگئی ہے اور تکان سے تمام اعضا شکستہ ہو رہے ہیں۔ مزید براں آج ہی شب چند ضروری فیصلے لکھنے ہیں۔"

لیڈی ڈین نے مایوسی کے انداز سے کہا "مگر کھانا کہاں کھاؤ گے۔ نوکر تو سب چھٹیوں پر گھر چلے گئے ہیں۔"

سرجی نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "تم اس کا کوئی اندیشہ نہ کرو۔ میں اپنا انتظام کرلوں گا۔"

لیڈی ڈین اسباب اٹھوا بیٹے کے پاس چلی گئیں۔ بوڑھے گاڑیبان کالیر کے پاس کچھ کھانا تھا وہی سرجی کے کام آیا جب وہ بھی چلا گیا تو تنہائی میں سرجی رہ گئے اور ان کی تصویر۔

وہ خیال کرنے لگے۔

"میں نے تمام معاملہ کس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔ یہ بھی اچھا ہؤا کہ گھر میں نوکر بھی موجود نہیں۔ شاید کھٹکے سے اُن کی آنکھ کھل جاتی اور وہ سمتھ کے کام میں مزاحم ہوتے۔ مگر گھر کو لٹیروں کے رحم پر چھوڑنا بھی خلافِ مصلحت ہے۔ خیر میں خود جو موجود ہوں۔ سمتھ کی ساری کارروائی کی نگرانی کروں گا کہ کہیں اِدھر اُدھر تو نہیں ہاتھ صاف کر رہا۔" وہ ان خیالات میں غرق تھے۔ تشویش کے ساتھ ہی دل میں خوشی بھی تھی۔ کبھی سوچتے "مکان کو اس طرح سمتھ پر چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ تجویز یقیناً نہایت کوتاہ اندیشی اور خوفناک عجلت پر مبنی ہے۔" پھر کہتے "بہر صورت بارہ گھنٹے کے بعد میں اس منحوس تصویر سے تو آزاد ہو جاؤں گا۔"

جب انہیں خیال آیا کہ اس کم بخت تصویر کی وجہ سے انہیں کتنی اہانت اور سُبکی برداشت کرنی پڑی تھی تو اُن کا خون کھول اُٹھا۔ لوگوں نے کس کس طرح میرا خاکا اُڑایا اور کیسے کیسے مضحکہ خیز فقرے چست کئے۔ خاصکر جان تو لندن کے رسائل سے مجھ کو ذلیل کرنے کے لئے خاص خاص فقرے ڈھونڈ لایا کرتا تھا۔ کوئی مہمان ایسا نہ تھا جو اپنی خوش طبعی و ظرافت کو تہذیب کے پردے میں چھپانے میں کامیاب ہؤا ہو۔ آخر اس ملعون تصویر کے دفیعے کی تدبیر ہو ہی گئی۔ اگرچہ یہ کسی قدر وحشیانہ ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر وہ اس کے جلانے کے لئے سارے محل کو بھی آگ لگا دیتے تو یقیناً اُن کا کوئی دوست نما دشمن چلا اُٹھتا "ارے سب سے پہلے اس تصویر کو بچانا" اور بے وقوف نالائق ہمسائے اسے ضرور بچا لیتے۔ اس صورت میں

محل سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے اور کام بھی نہ بنتا۔

انہوں نے آخری مرتبہ تصویر کی طرف نظرِ حقارت سے دیکھا اور کہا "اے منحوس شبیہ تو نے مجھے ستا لیا۔ لے اب الوداع"!

اس کے بعد انہوں نے حسبِ وعدہ پائیں باغ کی طرف کی کھڑکی کھول دی اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو کر بجلی بجھا دی جس سے چاروں طرف سخت تاریکی محیط ہوگئی۔ سرجی کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ وہ بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے اور سمتھ کی آمد کا بڑی بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ دو بجے کے قریب جس وقت کا سمتھ نے وعدہ کیا تھا وہ اونگھ سے گئے مگر اندر چلنے پھرنے کی آوازیں برابر سُنا کئے۔ کبھی آوازیں آنے لگتیں کبھی خاموشی چھا جاتی مگر انہیں کھٹکے کی آواز سننے کا یقین تھا۔

سرجی کا اشتیاق لحہ بہ لحہ تیز ہوتا گیا۔ آخر وہ جذبۂ کامیابی کو ضبط نہ کر سکے اور اُٹھ کر کھڑکی تک پہنچے۔ باغ سے ٹھنڈی اور فرحناک ہوا آرہی تھی۔ خوش قسمتی سے اُن کو چند سائے بھی نظر آئے جو جلدی ہی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اب سرجی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور واپس آکر میٹھی نیند سو رہے۔ مگر آنکھ لگنے سے ذرا پہلے وہ ایک بار ہنس لئے کہ اپنے احباب کے سامنے میں اِس چوری کے متعلق قطعی لاعلمی کا اظہار کروں گا۔

خلافِ معمول سرجی صبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھے اور پورا لباس پہنے بغیر ولیم سمتھ کے کارنمایاں کی داد دینے کھانے کے کمرے میں گئے۔

دیکھتے کیا ہیں کہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ اور طلائی چوکھٹا ندارد۔ اس پر چاک سے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"اس بیہودہ چیز کی ہمیں ضرورت نہیں"۔

بعد میں یہ بھی معلوم ہُوا کہ سارے محل میں جھاڑو پھری ہے۔ چائے کا ایک چمچہ بھی ڈھونڈے سے نہ مِلا۔

(بینیٹ) ـــــــــــــــ سیّد علی عباس

بابِ محبّت

جمال کو بے نقاب کر دے شباب کو بے حجاب کر دے
قسم ہے معصومیوں کی تجھکو، نظامِ فطرت خراب کر دے

وہ قیس ہی تھا جو جیب و داماں کی دھجیوں سے رہا اُلجھتا
میں اُس جنوں کی تلاش میں ہوں جو چاک تیرا نقاب کر دے

بہا دے رنگینیوں کے دریا۔ ڈبو دے رنگینیوں میں مجھ کو
تو ایک سیلِ شراب بن جا، مجھے غریقِ شراب کر دے

ترے محبّت فروز نغموں پہ عشرتِ کائنات قرباں
مری خموشی کو لوٹ بھی لے، مرے سکوں کو خراب کر دے

کہاں تک اب اِن پہاڑ راتوں کو تیشۂ بیکسی سے کاٹوں
مری محبّت کے خواب آجا! غمِ جدائی کو خواب کر دے

کہاں وہ سوز و گداز نغموں میں، جو ہے مضمر خموشیوں میں
رباب کو دُور پھینک بھی دے سکوت ہی کو رباب کر دے

روش کی دیوانگی تو دیکھو چلا ہے اس کا کلیم بنکر
اُٹھا کے جو اک حجابِ جلوہ، ہزار پیدا حجاب کر دے

(روش صدیقی)

سوویٹ رُوس میں جہالت کا دیوالہ

"ماڈرن ریویو میں روس کی تعلیمی ترقی کے متعلق مسٹر جی ایس خیر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ ناظرین ہمایوں کی دلچسپی کیلئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جدید روس نے اپنی مختصر زندگی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اگر ہمارا موجودہ طریق تعلیم جاری رہا تو ہندوستان کو اس درجے پر پہنچنے کے لئے صدیاں درکار ہونگی"۔

جب میں ماسکو کی "انجمن استیصال جہالت" کے مرکز میں پہنچا تو ڈائرکٹر ول نے مجھ سے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا۔ ایک دفتر کے گودام کے قریب ایک بوڑھی عورت رہا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس دفتر کے بورڈ کو بارہا دیکھا تھا لیکن اس کی عبارت کو پڑھنے سے قاصر تھی۔ یہ عورت ایک تعلیمی ادارہ میں شریک ہوگئی تین ہفتے بعد ایک روز شام کو جب وہ ادھر سے گذری تو خوشی سے اُس کے آنسو نکل پڑے۔ آج وہ یہ عبارت پڑھ سکتی تھی۔ اور یہ اس کی زندگی میں ایک غیر متوقع واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اس تغیر کی ایک نمایاں مثال ہے جو سوویٹ کی آبادی کے بالغ افراد میں پیدا ہو رہا ہے۔

روس نے بیسویں صدی کا حیرتناک انقلاب پیش کیا ہے۔ پندرہ سال کے اندر اس نے اپنی سوسائٹی سے جہالت کے شرمناک داغ کو دُور کر دیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں ملک کی ستر فیصدی آبادی نہ لکھ سکتی تھی نہ پڑھ سکتی تھی۔ پندرہ سال کی سرگرم کوشش سے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے ۱۰ فیصدی تک پہنچ چکی ہے۔ اس تعداد میں زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ اور ملک کے دُور دراز حصوں میں رہنے والے باشندے شامل ہیں لیکن اب مدارس ان کے قرب وجوار میں بھی کھولے جا رہے ہیں تاکہ تعلیم گاہ تک بآسانی ان کی رسائی ہو سکے۔ اگر تم کسی روسی شہر کے بازار میں گزرو تو بہت سے جوان آدمیوں کو چھوٹے چھوٹے بستے اپنے ہاتھوں میں لیے جاتے ہوئے دیکھو گے یہ مدرسے جا رہے ہیں۔ اگر تم سڑک کی جانب کھلے ہوئے روشن دریچوں میں جھانکو تو ہر ایک محلہ میں تم کو ایک یا دو مدرسے دکھائی دیں گے۔ عورتیں اور مرد اپنے لکھنے پڑھنے کے ضروری سامان کے ساتھ ان دریچوں کے سامنے بیٹھے نظر آئیں گے۔ اس قسم کے سینکڑوں شبینہ مدارس تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کارخانوں، فرموں اور سرخ فوج میں یا جہاں کہیں بھی تین آدمی بغرض تعلیم جمع ہو سکیں اس قسم کے مدارس قائم ہیں۔

آج روسی باشندے تعلیم کے بھوکے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ صدیوں تک زار اور اس کے ارباب حکومت ان کو جاہل اور ان پڑھ رکھ چکے ہیں۔ اتفاقاً ایک روشن خیال اور حامی تعلیم حکمران پیدا ہوا تھا جس نے چند مفت مدارس کو رواج دیا تھا لیکن مجموعی طور پر تعلیم کو مشتبہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حکمران ڈرتے تھے کہ تعلیم رعایا کے پوشیدہ جذبات آزادی کو اُبھاریگی۔ الگزینڈر اوّل کے وزیر تعلیم

ستشکو ([illegible]) کا یہ کہنا کہ رعایا کے گروہِ کثیر یا اکثریت کو تعلیم دینا منفعت کے بجائے مضرت پیدا کرے گا روسی فرمانرواؤں کے دلی عندیہ کا اظہار تھا۔ پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ روس کا معیارِ تعلیم مغربی اقوام میں سب سے پست تھا۔ ۱۹۰۴ء میں روس کی مدارس میں جانے والی آبادی کا اوسط تین فیصدی تھا اس کے مقابلہ میں ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۳، جرمنی میں ۱۹ اور فرانس و انگلستان میں ۱۶ فیصدی تھا۔ چند مفت مدارس مذہبی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند اور ریاضی کی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن حاضری مطلق لازمی نہ تھی۔ وقت کا بیشتر حصّہ دقیانوسی مذہبی تعلیم میں صرف ہوتا تھا۔ ہر مدرّس کے زیرِ نگرانی طلبہ کی تعداد پچاس سے نوّے تک ہوتی تھی۔ شکی عہدہ داروں کا معائنہ اور گرفت اس قدر سخت تھی کہ اس سے رعایا میں روشن خیالی پیدا ہونے کے تمام ممکنات ملیامیٹ ہو گئے تھے۔

علمی تغیرات سیاسی تغیرات کے تابع ہوتے ہیں۔ ممالکِ متحدہ امریکہ نے انگلستان سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد جمہوری تعلیم کا نیا تجربہ شروع کیا۔ جب قیصریت کا خاتمہ ہوا اور جرمنی میں نئے طرز کی حکومت قائم ہوئی تو قدیم نظامِ تعلیم پر بھی نظرثانی کی گئی۔ اب موجودہ قومی اشتراکی حکومت تعلیمی نظامِ عمل میں اہم تبدیلیاں کر رہی ہے۔ یہی حال فسطائی اٹلی میں ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے سیاسی تغیر سے تمام اہم شعبوں میں تغیر پیدا ہوا۔ تعلیم پر بھی اس کا اثر ہوا۔ چنانچہ کسی اور ملک میں تعلیمی تبدیلیاں اسقدر کامل طریقہ پر جاری نہیں ہیں جسقدر سوویٹ روس میں۔

روسی رہنماؤں کو اپنی قوم کے پندرہ کروڑ افراد کی حالت سُدھارنے میں جو صدیوں سے اَن پڑھ، جاہل اور مفلس رکھے گئے تھے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر فطری تعلیمی ارتقا جاری رہتا تو باشندوں کو صرف لکھنا پڑھنا سکھانے کیلئے ایک صدی اور درکار ہوتی مگر سوویٹ میں نظامِ تعلیم اور اس کے متعلقہ شعبوں کی ترقی تاریخِ تمدّن میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ روسی تعلیم کو اشتراکی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور سیاسی تغیرات نے نئے اشتراکی نظام کی بُنیاد ڈالی ہے۔

زار کے عہد میں مزدوروں اور کسانوں کو تعلیم پانے کے بہت کم مواقع حاصل تھے۔ جب عوام کے رہنماؤں نے اقتدار حاصل کیا تو مزدوروں اور کسانوں کے گروہِ کثیر کیلئے علم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ نئی حکومت کے نظام العمل میں سب سے اہم کام ملک سے جہالت دُور کرنا ہے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۱۹ء میں لینن نے اس قانون پر دستخط کئے جس کا مفاد یہ تھا کہ روس کی سرزمین سے جہالت کا کلیتہً استیصال کر دیا جائے۔ روس کی موجودہ تعلیمی جدوجہد جس کا مقصد تیس کروڑ افرادِ رعایا کی جہالت دُور کرنا ہے غائر مطالعہ کے قابل ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تحریک جس کا نام "تحریکِ استیصالِ جہالت" ہے بیشتر رضاکار انجمنوں کی نگرانی میں جاری ہے۔ اگرچہ ان کو حکومت کی حوصلہ افزائی اور اعانت حاصل ہے۔ ان تمام انجمنوں کی صدر ایک مجلسِ اعلےٰ ہے جو اصُول اور ہدایات مرتب کرتی ہے۔ مجلسِ اعلےٰ کے ماتحت صوبہ وار مجالس ہیں جو اس کے نظامِ عمل اور حکمتِ عملی کو بروئے کار لاتی ہیں۔ مجلسِ اعلےٰ پانچ شعبوں میں منقسم ہے (۱) شعبہ تنظیم مدارس۔ (۲) شعبہ نصاب و تعلیم (۳) شعبہ اشاعت برائے تعلیم (۴) شعبہ مالیہ (۵) شعبہ وضع تجاویز۔ تمام صوبہ وار مجالس میں اسی قسم کے شعبے ہیں۔ مقامی مجالس اپنے علاقہ کے غیر تعلیمیافتہ لوگوں کی تعداد معلوم کرنے کے بعد اشاعت تعلیم کی تائید میں رائے عامہ حاصل کرتی ہیں۔ خواندہ و ناخواندہ دونوں قسم کے

لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ کارخانوں، فرموں اور فوج میں یا جہاں کہیں بھی چند خواہشمندانِ تعلیم کا جمع ہونا ممکن ہو انجمن قائم کی جاتی ہے۔ قیامِ انجمن کیلئے کم از کم تین اراکین کا ہونا ضروری ہے۔

یہ پوری تحریک عوام کی امداد پر قائم ہے۔ تمام اراکین باقاعدہ چندوں کی مقررہ رقم ادا کرتے ہیں۔ سکار خانے اور منظم جماعتیں محاصل دیتی ہیں۔ اراکین کے عطا کردہ چندے اور محاصل تعلیمی اشیاء کے حصول اور مقامی ضروریات کی تکمیل کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ جد وجہد کی متقاضی تعلیمی قوت ان فوجی اصطلاحات سے ظاہر ہوتی ہے جو اس پُرامن پروپیگنڈے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں مثلاً مجالسِ اضلاع کے دفاتر رسالے اور رضاکار اساتذہ علمی فوج کہلاتے ہیں۔

مجھے چند اداروں کے دیکھنے کا موقع ملا جہاں ہر عمر کے مرد و عورت موجود تھے۔ بڑی عمر کے لوگ ہدایات اور تنظیم کا کام انجام دیتے ہیں اور تعلیم کی ذمہ داری کوملز قبول کر لیتے ہیں۔ یہ (Komsomol) تیرہ سے چوبیس سال کے نوجوانوں کی منظم جماعت ہے۔ یہ نوجوان دن کو مدارس اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں اور رات کا وقت سماجی خدمات میں صرف کرتے ہیں۔ اشاعتِ تعلیم روس میں موجودہ وقت کا سب سے اہم کام ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں دن کے وقت میں نے ماسکو کا ایک ثانوی مدرسہ دیکھا لیکن ان نوجوانوں کی سماجی خدمات کا حال معلوم کرنے کے شوق میں رات کو بھی گیا۔ عمارت کو لوگوں سے بھرا پایا۔ ایک جماعت میں چودہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں، ایک طالب علم صدر تھا اور دوسرے دو طلبا کچھ بحث کر رہے تھے۔ اُستاد ان سب طلبہ کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ رہبر نے مجھکو جلسہ کی روئداد سنائی۔ یہ طلبہ اپنے اضلاع میں اشاعتِ تعلیم کی کوشش کر رہے تھے لیکن کام کی رفتار اطمینان بخش نہ تھی اسلئے وہ اصول دریافت کرنا چاہتے تھے جو ان کی سماجی ذمہ داری کو بہ احسن الوجوہ پورا کر سکیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو پس ماندہ اور ان پڑھ گروہ سے جہالت دُور کرنے میں مدد دے رہے تھے۔

تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دینے والے رضاکار اساتذہ کے پاس چند ضروری اسناد ہونی چاہئیں۔ بالغ طلبہ کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کیلئے کم از کم چار سال اور ثانوی جماعتوں کیلئے ۷ سال کسی مدرسہ میں تعلیم پانا ضروری ہے ساتھ ہی ساتھ معلمی کے ابتدائی اصول سے واقف ہونا بھی بہتر ہے۔

ان اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد سولہ سے پچاس تک ہوتی ہے تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی اور کتابیں مفت دی جاتی ہیں چونکہ خواتین کی بہت بڑی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے اسلئے کام بھی اسی طبقہ میں نسبتہً زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ جب مائیں گھروں سے باہر نہیں جا سکتیں تو سماجی خدمات انجام دینے والی معلمات ان کے گھروں میں جا کر ضروری تعلیم دیتی ہیں۔ اگر فی ہفتہ نو سے گیارہ گھنٹہ تک کام کیا جائے تو ایک شخص کو حرف نوشت وخواند سکھانے کی قلیل ترین مدت اٹھارہ ماہ ہے۔ جدید روسی ہفتہ چھ دن کا ہوتا ہے۔

طلبہ کو تعلیمی سند حاصل کرنے کیلئے دو مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے درجہ میں بالغ طلبہ کو بچوں کا دو سالہ نصاب نو ماہ میں ختم کرنا ہوتا ہے اس کے بعد آسان عبارت خوانی اور حساب میں امتحان لیا جاتا ہے۔ دوسرے درجہ میں طالب علم کو مدرسہ تحتانیہ کے چار سال کا نصاب اٹھارہ ماہ میں ختم کرنا ہوتا ہے۔ امتحان میں تیز عبارت خوانی، قواعد، ریاضی، تاریخ وجغرافیہ سے متعلق سوالات دریافت کئے جاتے ہیں۔ روس میں محض نوشت وخواند اور حساب دانی کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ اسکے ساتھ اشتراکیت کی تعلیم نہ ہو۔ انجمن استیصالِ جہالت کے صدر ایم کالینینکی (M. Kalininsky)

نے تعلیم بالغاں کی تعریف یوں کی ہے۔

موجودہ حالات میں استیصالِ جہالت کے معنی عوام کو صرف نوشت وخواند سکھانا نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے کہ جو کچھ وہ پڑھیں اچھی طرح اُن کے ذہن نشین کرایا جائے اور ان کو سکھا دیا جائے کہ پڑھی ہوئی چیزوں کو اپنے دماغ میں کلیتہً محفوظ رکھیں۔ سیاسی حیثیت سے تعلیم یافتہ بنانے کے معنی نیا انسان پیدا کرنا ہے۔ نئے انسان پیدا کئے بغیر تعلیم دینا محض فضول ہے۔

اس بیان کی صداقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم تعلیم بالغاں کا نصاب دیکھتے ہیں جو عمرانی، سیاسی اور اشتراکی مسائل پر مشتمل ہے۔ ترغیب تعلیم کو تقویت دینے کیلئے باقاعدہ جماعتوں کے علاوہ مختلف پروگرام بھی ہیں مثلاً مقامی عجائب خانہ کا گشت، متحرک کتب خانے، تقاریر اور مشہور دیواری روسی اخبار جو عملاً ہر تنظیم کا خاکہ ہوتا ہے۔

بعض لوگ ایسی تنظیم کی کامیابی میں جو رضاکارانہ جدوجہد پر منحصر ہو شبہ کرسکتے ہیں لیکن پندرہ سال کے مندرجۂ ذیل اعداد و شمار جن میں جہالت کا سریع الزوال اوسط فیصدی دکھایا گیا ہے اِس شبہ کو دُور کردیں گے۔

سال	تعلیم کا اوسط فیصدی	سال	تعلیم کا اوسط فیصدی
۱۸۹۷	۲۸٫۹	۱۹۲۶	۵۲٫۸
۱۹۲۰	۴۴٫۴	۱۹۳۱	۷۳٫۶

استیصالِ جہالت کے خاص مدارس اسقدر روز بروز ثابت ہوئے ہیں کہ دس سال میں طلبہ کی تعداد تگنی ہوچکی ہے۔

سال	تعداد طلبہ
۲۲-۱۹۲۱	۴۵۶۰۰۰
۲۷-۱۹۲۶	۱۵۵۴۰۰۰
۳۲-۱۹۳۱	۱۳۶۳۱۰۰۰

جب کوئی شخص روس میں عوام کی ذہنی بیداری کا ذاتی مشاہدہ کرتا ہے تو تعلیم کے یہ اعداد و شمار کمزور معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ماسکو اور لینن گراڈ کے بازاروں میں کتب خانوں کی فراوانی دیکھکر مجھ کو سخت تعجب ہوا۔ یہاں جوانوں اور بڈھوں کا خاصا مجمع تھا تعلیمیافتہ لوگوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے لٹریچر کی اشاعت بھی نہایت تیزی سے جاری ہے۔ ذوقِ تعلیم کو تازہ رکھنے کے لئے مسائل حاضرہ کی خُوب اشاعت کی جاتی ہے۔ روسی دیواری اخبار بھی اشاعت تعلیم میں بہت معاون ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ روس میں تعلیم نہایت سرعت سے پھیل رہی ہے۔ روسی رہنماؤں کو توقع ہے کہ آئندہ چند سال میں ملک سے جہالت قطعاً دُور ہوجائیگی۔ روسی تعلیم کے ایک رہنما ڈاکٹر چٹلسکی (Dr. Chatskikh) نے اپنے تجربہ کی بناپر مجھ سے بیان کیا کہ "پانچ سال بعد ہمارا ملک سب سے زیادہ تعلیمیافتہ ملکوں میں شمار ہوگا۔"

(محمد نسیم)

چرنوں کی داسی

میں چرنوں کی داسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

مَیں چرنوں کی داسی اور تُو
من مندر کا باسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

درشن جل کو رو بیٹھی ہیں
میری اکھیاں پیاسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

تُو آئے تو شاید جائیں
چنتا، سوچ، اُداسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

(امرچند قیس جالندھری)

سلطان محمود غزنوی اور حکیم بوعلی سینا

ایک تاریخی غلط بیانی کا ازالہ

دُنیا کی نامور ہستیوں میں بہت کم ایسی خوش نصیب ہونگی جو مؤرخین کے ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے کم و بیش بدنام نہ ہوئی ہوں۔ اسی طرح نظامی اور محمد خاوند شاہ کی مفروضہ داستان طرازیوں کے طفیل سلطان محمود غزنوی کا نام بھی سیاہ کاران عالم کی فہرست میں شامل ہوگیا اور افسوس کہ زمانۂ مابعد اور دورِ موجودہ کے مورخین نے ان خود غرضانہ داستانوں کو تاریخی کسوٹی پر پرکھے بغیر صحیح تسلیم کرلیا۔ مگر حقیقت بین نظروں سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ ان داستانوں میں انتہائی مبالغے اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ نظر غائر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے مذہبی اختلافات اور ذاتی رنجشوں کی بنا پر سلطان کو متعصب، بے وفا، ظالم، سخت گیر اور غیر مسلموں کا دشمن ثابت کرنے کی بے حد جد و جہد کی ہے اور نہ صرف یہی بلکہ اسی نوع کے بیشمار مہمل افسانوں میں دو داستانیں سلطان کے حاسدوں اور مخالفین نے اس قدر دُہرائی ہیں کہ اکثر مؤرخین کو دھوکا ہوگیا ہے اور اُنہوں نے حقیقت واقعہ کی تحقیق کئے بغیر ہی ان فرضی داستانوں کو تاریخی واقعات تسلیم کرکے اپنی طرح دُنیا کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے جس طرح مذہبی روایات میں اکثر ایسے بھی امور ہوتے ہیں جو کثرتِ استعمال کے سبب سے قابلِ اعتماد مان لئے گئے ہیں ورنہ ان کو اصلیت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اور عوام جن میں قدرتِ کاملہ نے تحقیق و تجسس اور چھان بین کا مادہ ودیعت نہیں کیا۔ ان فرضی داستانوں کو احکام ربانی کی طرح صحیح مان لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال ان داستانوں کا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانے کے فتنہ پرداز مؤرخوں نے مذہبی اور سیاسی اختلافات کی بنا پر اس کی شہرت اور نیک نامی کو داغدار کرنے کے لئے تراشی ہیں۔

ان فتنہ پرداز مؤرخین نے سلطان محمود غزنوی کو خود غرض، متعصب اور لالچی تاجدار کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ سلطان نے بغیر کسی معقول وجہ کے غیر مسلموں کے ملکوں پر حملہ کیا اور نہ صرف ان کی دولت کو لوٹا اور ملک کو تاخت و تاراج کیا بلکہ ان کے دماغی و ادبی سرمایہ کو بھی برباد کردیا۔ اور وہاں کے ماہرین علم و فن کو غزنیں جاکر آباد ہونے پر مجبور کیا۔ اسی قسم کی ایک اور لغو اور مہمل داستان میں سلطان پر یہ تہمت تراشی گئی ہے کہ اس نے ایران کے زندۂ جاوید شاعر فردوسی کے ساتھ بدعہدی اور بدسلوکی کی۔ شاہنامہ کی تکمیل پر موعودہ انعام کے انکار نے فردوسی کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور اس نے عالمِ مایوسی میں سلطان کی ہجو کہی اور دربار سے فرار ہوگیا۔ لیکن سلطان کے سپاہیوں نے اسے امن و اطمینان کے

سلسلہ زندگی منقطع کر دی۔ ان تمام بدعہدیوں اور بدسلوکیوں کی وجہ صرف یہ بتائی گئی ہے کہ فردوسی کے بدخواہوں نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ وہ شیعی عقائد رکھتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مشہور ادیب و مؤرخ علامہ محمود شیرانی نے اپنے ایک عالمانہ مضمون میں (جو انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا) اس غلط بیانی کی پرزور دلائل و براہین سے تردید کر دی ہے۔

اسی طرح ایک دوسری داستان سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اپنے زمانہ کے مشہور حکیم بوعلی سینا کے ساتھ اس کے شیعی عقائد کی بنا پر بدسلوکی کی۔ اس داستان کو اس شد و مد سے ایک ایسے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھ کر یہ لغو اور مہمل قرار نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ مسلّمہ تاریخی واقعات کی روشنی میں "حقیقت واقعہ" معلوم کرنے کی سعی کی جائے۔

اس داستان کے مصنف نظامی اروضی سمرقندی مؤلف "چہار مقالہ" اور محمد خاوند شاہ مؤلف "روضۃ الصفا" ہیں۔ علامہ عبدالوہاب قزوینی ناشر و مرتب "چہار مقالہ" نے اپنے پر مغز دیباچہ میں بتفصیل بحث کر کے نظامی کی زبردست غلطیوں کا پردہ فاش کر دیا ہے جس کے مطالعہ کے بعد واضح ہو گا کہ نظامی کسی حیثیت سے بھی مؤرخ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ رہا محمد خاوند شاہ۔ اس کی تاریخی تالیفات کے متعلق مشہور جرمن ادیب و مؤرخ ہرمان ایتھ (Hermann Ethé) کی بے لاگ رائے یہ ہے کہ "محمد خاوند شاہ بن محمود (جسے عام طور پر میر خواند کہتے ہیں اور جس نے ۹۰۳ھ میں بمقام ہرات انتقال کیا) کی شہرت کا انحصار اس کی ضخیم تالیف "روضۃ الصفا" پر ہے۔ یہ کتاب سات جلدوں پر منقسم ہے لیکن مشرقی مذاق کے مطابق ہونے کی وجہ سے تنقید و تبصرہ سے خالی ہے۔ گو زبان بامحاورہ ضرور ہے لیکن استعارات اور تشبیہات کے بوجھ نے حلاوت زبان پر بھی ضرب کاری لگائی ہے۔ لیکن ان تمام عیوب کے باوجود اہل مشرق اور اکثر مسلمان اسے قابل قدر صحیفہ تاریخی مانتے ہیں"۔ نظامی نے "چہار مقالہ" محمد خاوند شاہ کی ولادت سے بھی قبل مکمل کر دیا تھا اور اسی لئے اس کے بیان کو محمد خاوند شاہ کے بیان پر فضیلت حاصل ہے۔ نظامی نے جو داستان بیان کی ہے اس کا لب لباب یہ ہے:-

"ابو عباس مامون خوارزم شاہ کے ایک وزیر کا نام ابوالحسین احمد بن سہیل تھا۔ اُسے علم و ادب اور حکمت سے فطری لگاؤ تھا نہ صرف اس کا مذاق عالمانہ تھا بلکہ وہ سخی اور فیاض بھی تھا۔ خوارزم شاہ بھی علماء و حکماء کا قدردان تھا۔ اسی سبب سے اس زمانہ کے اکثر نامور عالم و حکیم مثلاً حکیم بوعلی سینا۔ ابوسہیل مسیحی۔ ابوالخیر بن الخمار۔ ابونصر عراقی اور ابوریحان البیرونی وغیرہ اس کے دربار کے رکن تھے اور خوارزم شاہ کی قدردانی کے سبب سے دُنیاوی تفکرات سے آزاد تھے اور ان کے باہمی تعلقات بھی مخلصانہ تھے۔

لیکن فلک ستم شعار نے انہیں آرام سے رہنے نہ دیا۔ ان کی فارغ البالی کے ایام ختم ہو گئے۔ ان کی مسرت و شادمانی نصیب دشمناں ہو گئی۔ اور وہ دُنیاوی مصائب و آلام میں پھنس گئے۔ سلطان محمود یمین الدولہ کا قاصد خط لے کر آیا جس میں تحریر تھا کہ "میں نے سُنا ہے کہ تمہارے (خوارزم شاہ کے) دربار میں کئی مشہور زمانہ علماء و حکماء موجود ہیں۔ اب میری خواہش یہ ہے کہ تم انہیں میرے دربار میں بھیج دو تاکہ میں ان کی صحبت سے متمتع اور ان کے علمی و فنی کمال سے فیضیاب ہو سکوں اور یہ تمہارا مجھ پر ایک بڑا احسان ہو گا"۔

"قاصد کا نام خواجہ حسین بن علی بن مقال تھا۔ جسے خوارزم شاہ نے ایک عالیشان عمارت میں اُتروایا اور اس کی بے انتہا خاطر و تواضع کی۔ لیکن اسے دربار میں طلب کرنے سے قبل خوارزم شاہ نے اپنے درباری علما و حکما کو بُلا کر سلطان محمود کے خط کے مضمون سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ "سلطان محمود کا لشکر جری اور لاتعداد ہے۔ مجھ میں یہ طاقت کہاں کہ سلطان کی فرمایش پوری کرنے سے انکار کر دوں۔ اب آپ اپنی رائے سے مطلع کریں"۔

"حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی نے جواب دیا کہ "ہم ہرگز نہ جائیں گے"۔ لیکن ابوالنصر، ابوالخیر اور ابوریحان البیرونی نے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا کیونکہ اُنہوں نے سلطان یمین الدولہ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ سُنا تھا۔ خوارزم شاہ نے حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی سے کہا کہ "چونکہ تم دونوں کو جانا پسند نہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ قبل اس کے کہ میں قاصد کو طلب کروں تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ"۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی کو ایک معقول رقم بطور زادِ راہ دے کر ایک رہبر کے حوالہ کر دیا اور وہ خطرناک جنگلوں سے ہو کر گرگان چلے گئے"۔

"دوسرے دن خوارزم شاہ نے خواجہ حسین بن مقال کو دربار میں بُلا کر کہا کہ "بوعلی سینا اور ابوسہیل تو میرے شہر سے جا چکے ہیں لیکن ابوالنصر ابوالخیر اور ابوریحان سلطان کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد یہ تینوں بلخ پہنچ کر سلطان یمین الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے"۔

لیکن سلطان کی افضل ترین خواہش حکیم بوعلی سینا سے ملنے کی تھی چنانچہ اس نے ابوالنصر (جو ایک نامور مصور تھا) کو حکم دیا کہ حکیم بوعلی سینا کی تصویر تیار کرے۔ جس کی اس نے اپنے مصوروں سے چالیس کاپیاں تیار کرائیں اور انہیں ہر چہار سو حکمرانوں کے پاس اس اعلان کے ساتھ بھیج دیا کہ "اس شکل و صورت کے انسان کا نام حکیم بوعلی سینا ہے۔ اسے تلاش کرو اور گرفتار کر کے میرے دربار میں بھیج دو"۔

"بوعلی سینا کا بیان ہے کہ خوارزم شاہ کے دربار سے چلے آنے کے چوتھے دن ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ گرد و غبار نے فضا میں پھیل کر روزِ روشن کو اندھیرے سے تبدیل کر دیا۔ بدیں وجہ وہ راستہ بھول گئے۔ ابوسہیل صحرا کی سخت گرمی، پیاس کی شدت اور پانی کی قلت کی تاب نہ لا کر راہیِ مُلکِ عدم ہوا"۔ حکیم بوعلی سینا پہلے توس گیا اور وہاں سے نیشاپور آیا۔ جہاں اس نے اکثر آدمیوں کو اپنی تلاش میں پایا۔ جس سے وہ بے حد متفکر ہوا اور ایک غیر آباد جگہ پر ٹھہر گیا۔ جہاں وہ چند روز پوشیدہ رہ کر گرگان چلا گیا۔ (کہتے ہیں کہ گرگان میں حکیم بوعلی سینا نے ایک شخص کی صرف نبض دیکھ کر اس کے بیمارِ محبت ہونے کی تشخیص کر دی اور جب اس کی اطلاع اس ملک کے والی امیر قابوس کو ملی تو اُس نے حکیم بوعلی سینا کو اپنے پاس بُلا لیا۔ امیر قابوس کے پاس سلطان یمین الدولہ کی بھیجی ہوئی تصویر موجود تھی اس لئے اس نے بوعلی سینا کو فوراً پہچان لیا اور اسے اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔ امیر قابوس کے اصرار پر بوعلی سینا نے بیان کیا کہ اس نے کس طرح اس پُر اسرار بیماری کی تشخیص کی امیر قابوس بوعلی سینا سے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آیا۔ حکیم بوعلی سینا گرگان سے رُخصت گیا اور بالآخر شہنشاہ علاء الدولہ کا وزیر مقرر ہو گیا۔ جیسا کہ بوعلی سینا کی سوانحعمری میں تحریر ہے"۔

یہ ہے وہ داستان جو نظامی عروضی نے "چہار مقالہ" میں بیان کی ہے لیکن اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ نظامی نے یہ نہیں بتایا کہ سلطان محمود نے خوارزم شاہ کے دربار سے علماء و حکما کو کیوں طلب کیا تھا اور نہ اس نے سلطان کی کسی بدنیتی کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا تو اشارۃً تک بھی نہیں کیا کہ سلطان بوعلی سینا کو اس کے شیعی عقائد کی سزا دینا چاہتا تھا بلکہ اس کے برخلاف سلطان کو اہلِ کمال کا قدردان، ان کی صحبت سے مستفید ہونے اور اپنے دربار کی رونق بڑھانے کا متمنی دکھایا ہے لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ نظامی کی بیان کردہ داستان درست ہے تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی غالباً اس سبب سے فرار ہونے اور چھپ جانے پر مجبور ہوئے کہ انہیں اندیشہ تھا کہ سلطان کے دربار میں ان کی آزادی محدود ہو جائیگی اور انہیں تحریر و تقریر کی عام اجازت نہ ہوگی اور اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو ان جملہ مصائب کی ذمہ داری ان کی کوتاہ بینی نا عاقبت اندیشی اور غیر معاملہ فہمی پر عاید ہوتی ہے نہ کہ سلطان پر۔

محمد خاوند شاہ نے بھی عروضی اور معمولی اختلاف کے ساتھ یہی لغو داستان تحریر کی ہے مگر اس نے اس میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ سلطان نے حکیم بوعلی سینا کو خوارزم شاہ کے دربار سے اس لئے طلب کیا تھا کہ اسے اس کے شیعی عقائد کی سزا دے چنانچہ محمد خاوند شاہ نے لکھا ہے کہ:-

"چوں شیخ (بوعلی) به بست و دو سالگی رسید پدرش به رحمت ایزدی پیوست. و هم دران اوقات و آن زمان تزلزل و اضطراب بہ بنائی قصرِ دولت و شوکت آل سامان راہ یافت۔ ابوعلی از آنجا بیرون رفتہ روئے توجہ بخوارزم نہاد۔ و در آن اوان جمع کثیر از فضلاء و حکماء مثل ابوسہیل مسیحی۔ ابوریحان بیرونی ابوالخیر خمار وغیرہم در صحبت و ملازمت خوارزم شاہ علی بن مامون بن محمد بسر میبردند۔ چون ابوعلی بدآنجا رسید خوارزم شاہ در تربیت مشارٌالیہ اقبال تمام نمود۔ و وجہ معیشت او مقرر فرمود۔ دراثنا این اوقات سلطان محمود سبکتگین بہ ممالک ملوک سامانی استیلا یافت و پیش او مذمت ابوعلی کردند کہ مذہب او مخالف مذہب اہلسنت و جماعت است و سلطان در دین بغایت صلب بود۔ خواست کہ شیخ را بدست آرد۔"

لیکن اس داستان کو تاریخی کسوٹی پر پرکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ نظامی اور محمد خاوند شاہ پر وہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔ انہوں نے اس میں ایک دو نہیں بلکہ بیشمار غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ نظامی نے آغاز داستان ہی میں ایک زبردست ٹھوکر کھائی ہے یا ابو عباس مامون بن مامون کا نام اس سلسلہ میں لینا حیرت انگیز غلط بیانی ہے کیونکہ حکیم بوعلی سینا بخارا سے آکر جب والی خوارزم کے دربار میں حاضر ہوا تو اس وقت ابوالعباس مامون بن مامون نہیں بلکہ اس کا بھائی علی بن مامون تخت نشین تھا۔ حکیم بوعلی سینا کے اکثر سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ وہ ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا اور جب بائیس برس کا ہوا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب بخارا میں بدامنی اور شورش نے سر اٹھایا تو حکیم بوعلی سینا نے وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر خیال کیا۔ اس حساب سے وہ ۹۴-۹۵ھ میں یا اس کے دو ایک سال بعد خوارزم شاہ کے دربار میں حاضر ہوا لیکن ابو عباس مامون بن مامون اس کے بھی کئی سال بعد بادشاہ ہوا۔ علامہ ابن القفطی نے "تاریخ الحکماء" میں جو بیان حکیم بوعلی سینا کی خود نوشت سوانحعمری سے نقل کیا ہے اور نیز ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے بھی واضح ہے کہ خوارزم کے جس فرمانروا نے حکیم بوعلی سینا کی خاطر تواضع کی اور اس کی گذر اوقات کے لئے ایک معقول رقم بطور مشاہرہ مقرر کر دی اس کا نام علی بن مامون تھا۔ ہمارا جس بیان

کی طرف اشارہ ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"پھر میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ میرے حالات ناگفتہ بہ ہوگئے۔ اور میں نے سلطان کی چند خدمات انجام دینے کی ذمہ داری لی تو میری ضروریات نے مجھے بخارا سے گرگانج چلے جانے پر مجبور کیا۔ وہاں ابوالحسین سہیلی جوان علوم کو وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا وزیر تھا۔ میں اس کے گرگانج کے والی علی بن مامون کے پاس گیا۔ اس وقت میں فقہا کے لباس میں تھا۔ سر پر تُفہ اور عمامہ تھا جس کے نیچے کا حصّہ ٹھوڑی کے نیچے گردن میں لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے میرا شاہرہ مقرر کردیا تھا جو میری طرح کے ایک معمولی انسان کے لئے کافی تھا پھر میری ضروریات نے مجھے فسا جانے پر مجبور کیا اور وہاں سے میں جاجرم گیا جو سرحد خراسان پر واقع ہے۔ پھر وہاں سے جرجان پہنچا۔ میرا ارادہ امیر قابوس کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا لیکن اسی اثنا میں اتفاقاً امیر قابوس گرفتار کر کے ایک قلعہ میں قید کردیا گیا۔ جہاں اس نے انتقال کیا۔ پھر میں دہستان گیا۔ وہاں پہنچ کر میں ایک سخت مرض میں مبتلا ہوگیا اور جرجان کی طرف آیا۔ ابوعبید جرجانی بھی میرے پاس آگیا اور اس نے میرے حالات پر ایک قصیدہ لکھا جس میں ذیل کا شعر بھی تھا:۔ جب میں بڑا ہوگیا تو کسی شہر میں میرے لئے وسعت نہ تھی۔ جب میں گراں قیمت ہوگیا تو میرے قدر دان ناپید ہوگئے"

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ جس حکمران نے خوارزم میں حکیم بوعلی سینا کی خاطر و تواضع کی اور مال و زر سے مالامال کر کے اپنے پاس چند روز قیام کرنے کی ترغیب دی وہ نیک دل اور روشن خیال علی بن مامون تھا نہ کہ ابوعباس مامون بن مامون۔ اس سے چہار نظامی اور محمد خاوندشاہ کے بیانات کی تردید ہوتی ہے وہاں کئی اور امور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حکیم بوعلی سینا نے خوارزم سے رخصت ہو جانے کی وجہ صرف یہ بتائی ہے کہ "ضروریات نے مجھے فسا جانے پر مجبور کیا" اور تقریباً انہیں الفاظ میں اس نے بخارا سے چلے جانے کی وجہ بیان کی ہے جیسا کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ یہ وہی شورش اور بدامنی تھی جو منصور بن نوح کے تخت سے اتارے جانے کے بعد بتوزن اور فائق کی سرکشی کے سبب ملک میں پھیل گئی تھی۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض ایسی ہی وجوہات ہوں جنہوں نے اس کو خوارزم سے بھی چلے جانے پر مجبور کیا ہو۔ اب اگر تھوڑی دیر کیلئے ہمارا یہ نظریہ صحیح بھی نہ مانا جائے تو بھی اس سے نظامی اور محمد خاوندشاہ کی دروغ گوئی اور داستان طرازی کی حقیقت تو آئینہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح یہ داستان بھی کہ حکیم بوعلی سینا نے شمس المعالی امیر قابوس کے ایک عزیز کی صرف نبض دیکھ کر اس کے بیمار محبت ہونے کا راز معلوم کر لیا تھا اور نیز حکیم بوعلی سینا کی امیر قابوس سے ملاقات اور امیر کا حکیم کو پہچان کر اس پر انتہائی عنایتیں اور نوازشیں کرنا صرف نظامی اور محمد خاوندشاہ کی جدت طرازی ہے۔ انہوں نے اس داستان کی بنیاد غالباً حکیم بوعلی سینا کی اُس تحریر پر قائم کی ہے جو حکیم نے اس نوع کی بیماریوں کے متعلق اپنی مشہور عالم کتاب "قانون" میں لکھی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ثابت ہے کہ حکیم بوعلی سینا جرجان امیر قابوس سے ملاقات ہی کرنے گیا تھا مگر اس کی یہ آرزو بر نہ آئی کیونکہ اس کے جرجان پہنچنے سے قبل ہی امیر قابوس کو اس کی باغی فوج نے گرفتار کر کے قتل کردیا تھا۔

گو مجید الدولہ دیلمی کے عم زاد بھائی علاؤالدولہ دیلمی والی اصفہان نے تاج الدولہ کو متعدد بار زیر کیا تھا حتےٰ کہ ہمدان تک فتح کر لیا تھا مگر الفاظ نظامی اسے شہنشاہ کے معزز لقب سے سرفراز کرنا اور حکیم بوعلی سینا کو اس کا وزیر بتانا ایسی صریح غلط بیانی ہے جو کسی حالت میں بھی قابل معافی

قرار نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اس سے مسلّمہ تاریخی واقعات کی تردید ہوتی ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ حکیم بوعلی سینا دو مرتبہ مجیدالدولہ دیلمی کا وزیر مقرر ہوا مگر وُہ علاءالدولہ دیلمی کا کبھی وزیر نہیں بنایا گیا۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد جب تاج الدولہ کے آغاز عہد میں علاءالدولہ نے ہمدان فتح کر لیا تو حکیم بوعلی سینا آخرالذکر حکمران کے دربار میں حاضر ہُوا اور اس نے اپنی عمر کا باقی حصہ وہیں گذارا۔ علاءالدولہ نے اس کی قدردانی کی اور ہمیشہ عنایتیں اور نوازشیں کرتا رہا۔ چنانچہ حکیم بوعلی سینا نے اسی کی سرپرستی میں "حکمت الہٰی" تالیف کی جسے اس نے علاءالدولہ ہی کے نام سے معنون بھی کیا ہے۔ لیکن وہ اس کا وزیر کبھی نہیں ہُوا۔

علاوہ ازیں حکیم بوعلی سینا اور ابوریحان البیرونی دونوں کا بیک وقت مامون بن مامون کے دربار میں موجود رہنا اور غزنی سے طلبی کا خط پاتے ہی وہاں سے رخصت ہو جانا اس کا ثبوت بھی از روئے تاریخ غیر ممکن ہے مشہور جرمن ادیب ایڈورڈ ساؤ (Edward Sachau) نے البیرونی کی کتاب "آثار الباقیہ" کے دیباچہ میں اس تاریخی غلط بیانی کا نہایت حُسن و خوبی سے تار و پود بکھیر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب یہ داستان تاریخی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ بالکل لغو اور مہمل ہے کیونکہ مسلّمہ تاریخی واقعات کی رُو سے ابوریحان اور ابوالخیر ۴۰۷ھ میں خوارزم سے غزنی گئے۔ اور نظامی عروضی کا بیان ہے کہ حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی ۴۰۳ھ سے قبل ہی خوارزم سے فرار ہو گئے تھے۔ کیونکہ حکیم بوعلی سینا (بقول نظامی) جرجان پہنچ کر شمس المعالی امیر قابوس کا وزیر ہو گیا اور امیر قابوس کی تاریخ وفات ۴۰۳ھ ہے۔ دراصل اس داستان میں نظامی نے وقت اور مقصد کے لحاظ سے دو جداگانہ واقعات کو اپنی لاپرواہی سے خلط ملط کر دیا ہے"۔

آگے چل کر ساؤ نے تحریر کیا ہے کہ خود البیرونی نے یہ داستان لکھی ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے کیوں خوارزم پر حملہ کر کے اس کی آزادی کو کچل ڈالا اور اسے غزنی کا ایک صُوبہ قرار دے دیا۔ البیرونی نے بحیثیت ایک چشم دید شاہد کے اس بدامنی اور بغاوت کا حال جس کا خاتمہ شہزادہ مامون بن مامون کے قتل پر ہُوا ہے بتفصیل لکھا ہے۔ مامون کی اس حسرتناک مَوت کی وجہ سے محمود کو خوارزم کے معاملات میں دخل دینے کا بہانہ مل گیا اور وہ مامون بن مامون کے خون کا انتقام لینے کے لئے بہ عجلت تمام خوارزم آیا اور بغاوت فرو کر کے ۴۰۸ھ کے موسم بہار میں اس نے خوارزم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اسے اپنی سلطنت کا ایک صُوبہ قرار دے لیا۔ اس کے بعد سلطان نے باغی سرداروں کو قرار واقعی سزا دی اور اپنے سپہ سالار التونتاش کو گورنر مقرر کر کے اسی سال کے موسم بہار میں افغانستان واپس چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سا مالِ غنیمت اور بے شمار قیدی لے گیا جو بعد میں اس کی فوج میں شامل ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ قیدیوں میں خاندانِ شاہی کے چند افراد بھی تھے جن کو سلطان نے مختلف قلعوں میں قید کر دیا۔ غالباً اسی سفر میں ابوریحان، ابوالخیر اور ابوالنصر بھی سلطان کے ہمرکاب تھے۔

اگر تاریخ اسلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ حکیم بوعلی سینا کی البیرونی سے غالباً کبھی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ حکیم بوعلی سینا نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں لکھا ہے کہ وہ علی بن مامون ہی کی زندگی میں خوارزم سے چلا گیا تھا اور اس زمانہ کے مشہور مؤرخ بیہقی کا بیان ہے کہ البیرونی علی بن مامون کے جانشین مامون بن مامون کے دربار میں ۴۰۰ھ لغایت ۴۰۷ھ یعنی سات برس تک حاضر رہا۔ اور مامون بن مامون کے قتل کر دیئے جانے کے بعد ۴۰۸ھ میں سلطان محمود کے ساتھ غزنی آ گیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حکیم بوعلی سینا جب تک بخارا میں رہا البیرونی سے علمی و ادبی معاملات پر بذریعہ خط و کتابت تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔

اسی سلسلہ میں دو باتیں نہایت حیرت انگیز و قابلِ توجہ ہیں چنانچہ ان سے بھی محمد خاوندشاہ کی دروغ گوئی اور غلط بیانی کا راز طشت از بام ہو جاتا ہے ممکن ہے کہ جب حکیم بوعلی سینا فقیہ کے لباس میں تھا تو اس وقت سلطان محمود کے جاسوس اس کو شناخت نہ کر سکے ہوں لیکن جب حکیم نے ہمدان پہنچ کر اپنا

بھیس اُتارا اور پیچھے بعد دیگرے دو مرتبہ شمس الدولہ کا وزیر رہا اور وہاں سے رخصت ہو کر اصفہان میں علاءُ الدولہ بن کاکویا کے دربار میں حاضر ہوا جہاں اس نے بادشاہ کے ایک معزز مہمان اور مشیر خاص کی حیثیت سے قیام کیا۔ تو ان حالات میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے مشہور مقامات پر وہ اس قدر اہم اور ذمہ دارانہ حیثیت سے اتنے کافی عرصہ تک قیام پذیر رہے اور اس کی موجودگی کی اطلاع سلطان محمود کو نہ ملی ہو۔ اب اگر سلطان محمود کو معلوم ہو گیا تھا جو ایک امر لابدی تھا تو پھر سلطان نے جو بقول محمد خاوند شاہ اسے اس کے شیعی عقائد کی سزا دینے کے لئے بیحد کوشاں تھا، ان معمولی حکمرانوں سے اسے حاصل کرنے کی سعی کیوں نہیں کی؟ اگر سلطان اس کی گرفتاری کی خواہش کرتا تو یقیناً وہ حکمران بھی والیٔ خوارزم کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے تئیں اس کے غیظ و غضب کا شکار ہونے سے بچا لیتے۔

یہاں ایک اور واقعہ بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ سلطان محمود غزنوی اپنے عہد کے آخری سال یعنی ۴۲۰ھ میں رے گیا۔ خود محمد خاوند شاہ نے اس مہم کی مفصل کیفیت لکھی ہے جس کا مقصد دیلمی خاندان کے کمزور حکمران مجید الدولہ کو تخت سے اُتار کر اس علاقہ کو اپنے بیٹے مسعود کے حوالہ کرنا تھا تاکہ اس کو خوش کر کے محمد کو خراسان، غزنی اور بلادِ ہند کا واحد حکمران بنا دے۔ محمد خاوند شاہ نے تحریر کیا ہے کہ اسی موقعہ پر سلطان محمود نے عراق اور اصفہان کے علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کیا۔ مسلمہ تاریخی حقائق کی رُو سے حکیم بو علی سینا اس وقت بھی موجود تھا کیونکہ اس نے ۴۲۸ھ میں انتقال کیا۔ چنانچہ اس کے بعد سیرت نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اپنی حیات کے آخری پندرہ یا سولہ سال اس نے علاءُ الدولہ کی خدمت میں بسر کئے۔ اب اگر سلطان محمود حکیم کو درحقیقت گرفتار کرنا چاہتا تھا تو اس کا یہ مدعا ایک جنبشِ قلم پورا ہو سکتا تھا مگر ہمیں معلوم ہے کہ سلطان محمود نے کوئی ایسی خواہش نہیں کی اور اس سے محمد خاوند شاہ کے قول کی صاف تردید ہوتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب محمد خاوند شاہ نے خود ہی سلطان محمود غزنوی کی خدمتِ اسلام کو نہایت شاندار الفاظ میں تحریر کیا ہے تو پھر اس نے سلطان کے خلاف دیدہ و دانستہ ایسی مہمل اور لغو اور خلافِ واقعہ تہمت کیوں تراشی؛ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ محمد خاوند شاہ کو سنسنی پیدا کرنے والے واقعات لکھنے کا شوق تھا مگر وہ ایسے واقعات کو تاریخی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہی صحیح سمجھ لیتا تھا۔ ہمارے اس قول کے ثبوت میں ضمیمۂ "روضۃ الصفا" اور اسی نوع کی دیگر دستاویزیں جو کتاب مذکور میں ہی اکثر جگہ تحریر ہیں پیش کی جا سکتی ہیں چنانچہ اسی طرح کی ایک اور داستان وہ عہد نامہ ہے جو بقول محمد خاوند شاہ نظام الملک طوسی حسن بن صباح اور عمر خیام نے زمانہ طالب علمی میں مرتب کیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ حکیم بو علی سینا اور سلطان محمود غزنوی کے اس فرضی واقعہ کے متعلق عرب مؤرخ مثلاً علامہ ابن خلدون، الفخری، ابن ابی اصیبعہ، الاثیر وغیرہ بالکل خاموش ہیں یہاں تک کہ بیہقی نے بھی اپنی کتاب "تاریخ مسعودی" میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ایرانی مؤرخ اپنی غلط بیانیوں اور ناقابلِ اعتماد تحریروں کی وجہ سے بدنام ہیں۔ چنانچہ اس مہمل داستان کے مصنف بھی وہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس غلط بیانی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی اہل سنت والجماعت سے تھا اور محمد خاوند شاہ شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلئے ممکن ہے کہ اس نے مذہبی تعصب کی بنا پر اس غلط بیانی کو روا رکھا ہو۔ نظامی نے تو صرف یہ لکھا ہے کہ سلطان محمود نے علما و حکما کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا لیکن اس نے سلطان کی نیت پر کہیں حملہ نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد محمد خاوند شاہ نے تحریر کیا ہے کہ سلطان نے حکیم بو علی سینا کو اس لئے طلب کیا تھا کہ اسے اس کے شیعی عقاید کی سزا دے لیکن "نامۂ دانشوران" جو شاہ نصیر الدین قاچار کے عہد میں تالیف ہوئی اس کے مؤلف نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ سلطان محمود حکیم بو علی سینا کو اس کے شیعی عقاید کی پاداش میں قتل کر دینا چاہتا تھا ع ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

(سید محمود مؤرخ)

غزل

اے خریدارانِ دل! دل چاہیے؟ دل چاہیے
دل سی دولت اور تم؟ دل لینے کو دل چاہیے

میں گیا دل کھو کے بزمِ حُسن میں، آئی صدا
یہ تو دل والوں کی محفل ہے یہاں دل چاہیے

بحرِ غم میں ڈوب کر اُچھلے، تو بیڑا پار ہے
عشق کے پیراک کو کشتی نہ ساحل چاہیے

گنبدِ ایوانِ لیلا ہے بگولا دشت کا
نقشِ پا ہے خضرِ منزل شوقِ منزل چاہیے

آنکھ ساغر، خونِ دل مے اور ساقی یادِ دوست
ایسی خلوت چاہیے اور ایسی محفل چاہیے

تو ہو سرمستِ خودی میں بیخودی میں پائے کوب
دُور اس دُنیا سے دُور ایک ایسی محفل چاہیے

بجھ گیا دل، اب قفس ہے اور یادِ آشیاں
سیر پھولوں کی، نہ گلبانگِ عنادِل چاہیے

اپنے مجنوں کو عطا کر دے ولایت عشق کی
ذکر تیرا زندگی جس کی ہو، وہ دل چاہیے

حُسن تجھ کو ڈھونڈنے آئیگا او گرمِ تلاش
عشق کی معراج یعنی جذب کامل چاہیے

برقِ خرمن سوز پر اُڑ کر گرے پروانہ وار
مزرعِ اُمید کا نشتر وہ حاصل چاہیے

(نشتر جالندھری)

خزاں

گزری ہوئی بہار کو ہم بھول جائینگے
اُجڑے ہوئے چمن میں مسرت کو پائینگے

اس زندگی سے دُور ہمیشہ کے واسطے
ہم ایسے جائینگے کہ کبھی پھر نہ آئینگے

دُنیا سے دُور جا کے ملیگا سکون جب
چھوٹی سی اِک اُجاڑ میں جنت بنائینگے

ناشاد و نامراد جو دِل عمر بھر رہا
اس دِل کو اب خوشی سے لحد میں سلائینگے

تاریک شب میں دل کی تسلی کے واسطے
خاموش تارے چمکیں گے اور جھلملائینگے

غمخوار ہوں گے طائرِ شیریں بیاں مرے
ہر صبح و شام وہ مجھے نغمے سنائینگے

روتے ہیں تیری یاد میں عہدِ گزشتہ ہم
تیری طرح نہیں کہ یونہیں بھول جائینگے

کر کر کے یاد تیری تغافل شعاریاں
آنکھوں سے سیلِ اشک ہمیشہ بہائینگے

"بے نوا"

محفلِ ادب

بازگشت

سجاد

اب مرے خوابوں میں تو آتی ہے کیوں؟
گیت پھر اُمید کے گاتی ہے کیوں؟

تُو نے جب ٹھکرا دیا میرے نیازِ عشق کو
کر دیا محرومِ نغمہ میرے سازِ عشق کو

تُو نے مجھ سے میری دُنیائے محبت چھین لی
میری جنت، وہ مری تنہا مسرت چھین لی

تیرے جلوے میرے غمخانے سے بے پروا ہے
تیرے نغمے میرے ویرانے سے بے پروا ہے

میرے اشکوں کو ترے دامن کی حسرت ہی رہی
میرے غم کو تیری پُرسش سے شکایت ہی رہی

بیچ دی میری محبت تُو نے دولت کے لئے
کر دیا قرباں مجھے اپنی مسرت کے لئے

پھر مرے خوابوں میں تُو آتی ہے کیوں؟
گیت پھر اُمید کے گاتی ہے کیوں؟

"نخلستان"

قدیم ہندوستانی معاشرت

(ای۔ جے۔ ایچ۔ میکے ایم بی۔ اے)

۱۹۲۱ء سے قبل ہم ہندوستان کی تاریخ ۵۰۰ ق م سے شروع کرنے کے عادی تھے۔ یعنی اس زمانے سے جب ماہرین تاریخ کے نزدیک ہندوستان میں آریہ وارد ہوئے لیکن گذشتہ دوازدہ سال کے عرصے میں جدید انکشافات نے اور ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے کے حالات کو نمایاں کر دیا ہے۔

قدیم شہر منہجو دارو کے تودہ ہائے خاک و خشت، دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے پاس کراچی کوئی دو سو ستر میل شمال کی طرف پڑے ہوئے ہیں۔ شہر مذکور کے وسیع کھنڈر تقریباً ایک مربع میل قطعہ زمین پر حاوی ہیں اور ایک دریا بر آمد میدان میں واقع ہیں جس کی موزوں طور پر آبپاشی بے انتہا سرسبزی اور شادابی پیدا کرے گی۔ فی الحال یہ ایک خشک اور بنجر ویرانہ ہے جس میں کری کے

گرد آلود درختوں اور گھنی خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ اس شہر کے مغرب کی سمت قریباً چالیس میل کے فاصلے پر بلوچستان کے کِرْدار نامی سلسلۂ کوہ کا دامن ہے جو گرد و گرما کی دھند میں بہت حد تک نظر نہیں آتا۔ شمال جنوب اور مشرق کی طرف ملک کے وہ خطے ہیں جن میں ازمنۂ اولیٰ ہی سے کاشتکاری کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ آج کل دریائے سندھ شہر سے تین میل کے فاصلے پر بہتا ہے لیکن اس بات کی واثق شہادتیں موجود ہیں کہ یہ بلدۂ قدیم اس دریا کے یا اس کے کسی قابلِ ذکر معاون کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ چنانچہ منہجوداڑو کو شمالی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی بہت آسائشیں حاصل تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اس بات کے دلائل بھی موجود ہیں کہ خلیج فارس کے رستے سے عراق اور ایران کے ساتھ بھی اس کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں ساحلِ بحر موجودہ محلِ وقوع سے کہیں قدر شمال کی طرف تھا جیسا کہ ہمیں خلیج فارس کے شمال مغربی ساحل کے متعلق معلوم ہوا ہے۔ بعید نہیں کہ اُس زمانے کی بندرگاہ کہیں ٹھٹھ کے قرب وجوار میں واقع ہو۔

غالباً اس شہر کا اہم ترین حصّہ وہ تھا جو آج مغرب کی سمت ایک بلند پشتے کی صُورت میں نظر آتا ہے جس کی چوٹی پر مہاتما بدھ کا ستوپا (معبد) اور صومعہ استادہ ہے۔ اس ٹیلے میں وہ کشادہ اور وسیع حوض بھی ہیں جن کی کُھدائی سر جان مارشل نے کی ہے۔ ذرا شمال کی جانب آٹھ نہایت نفیس غسل خانوں کی دو قطاریں ہیں۔ علاوہ بریں ایک بلند عمارت پر ایک دوبدھی معبد کھڑا ہے جو قریباً ۱۵۰ عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کے قریب جانا ناممکن ہے اس خیال سے کہ مبادا معبد اور صومعہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

ہندوستان اور بعض دیگر ممالک کے مقدس مقامات کے قرینے سے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ستوپا کے نیچے جو عمارت ہے وہ بھی کوئی جائے متبرک بلکہ درحقیقت کوئی مندر تھی۔ اس عمارت کو نظرِ تعمّق دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ منہجوداڑو میں کوئی اور عمارت ایسی نہیں جسے وثوق کے ساتھ شہر کی عبادت گاہ کہا جا سکے۔

مذکورہ بالا غسل خانوں کے دروازے ایک درمیانی رستے میں کھلتے ہیں جس میں ایک نفیس بدررو چلتی ہے۔ ہر کمرے میں نہانے کا عجیب و غریب بندوبست تھا۔ ہر کمرے میں نہایت سُبک دستی سے فرش لگایا گیا تھا جس کے ایک طرف نیچان ہُوا کرتی تھی تاکہ پانی اندرونی نالی کے رستے سے بہ کر بآسانی بیرونی نالی میں جا گرے۔ ان غسل خانوں کی تعمیر میں یہ احتیاط برتی گئی تھی کہ کسی ایک کا دروازہ کسی دوسرے کے عین بالمقابل نہ ہو۔ دروازوں کے جوانب اس قدر مضبوط اور ٹھوس بنائے گئے تھے کہ رستے میں سے گذرتا ہُوا کوئی شخص اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر غسل خانے میں سے اُوپر کی منزل کو سیڑھیاں چڑھتی تھیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں۔ اس تمام انتظام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ ستر و اخفا کو بیحد ملحوظ رکھتے تھے۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ حمام صرف تیوہاروں کے موقع پر کوئی منّت پوری کرنے کے لئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔

راہب اور پجاری غالباً بالائی منزلوں کے حُجروں میں مقیم ہُوا کرتے تھے۔ اور ہر ایک کے لئے ایک حمام وقف ہوا کرتا

تھا۔ ان غسل خانوں کے لئے پانی ایک کنوئیں سے حاصل کیا جاتا تھا جو عمارت کے جنوب مشرقی کونے میں واقع تھا۔ پانی کنوئیں سے نکال کر مٹی کے گھڑوں میں رکھا جاتا تھا۔ ان گھڑوں کے کئی ریزے مختلف کمروں میں پائے گئے ہیں۔ شاید شہر کے اس محلے میں سب لوگوں کے نہانے کا بندوبست تھا۔ اگرچہ خیال ہے کہ یہ عمارت محض مذہبی تقدس گاہ تھی اور حمام بھی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے برتے جاتے تھے۔ ممکن ہے وہ عظیم الشان تالاب عوام کے شست و شو کے لئے ہو اور مذکورہ بالا کمروں میں صرف پجاری غسل کرتے ہوں۔

اکثر غیر اہم بازار اور گلیاں بھی کھدائی کے بعد نہایت اعلےٰ اور موثر نظر آنے لگی ہیں۔ اگرچہ ازمنۂ قدیمہ میں کسی طرح ان کی یہ ہئیت نہ ہو گی۔ ان گلیوں کی بعض دیواریں بیس فٹ اونچی ہیں۔ اس زمانے میں طغیانی اور شور کے اثر سے یہ دیواریں کئی جگہوں پر شکستہ و ریختہ ہو گئی تھیں اور درحقیقت بہت بردست مرمت کی محتاج تھیں بعض اوقات بھلی بری مرمت کر بھی دی جاتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ معمار بنیادوں کی مرمت کرتا ہوا اس بات سے خائف ہوتا تھا کہ کہیں دیوار کی دیوار اس کے سر پر نہ آ گرے۔

زیریں سطحوں پر مکانات بے حد نفیس اور معماروں کی چابکدستی کے شاہد ہیں۔ شہر کی تاریخ کے وسطی زمانے تک مکانات بغیر کسی استثنار کے نہایت مضبوط بنائے جاتے تھے۔ بعض عمارتوں میں جوڑ اس قدر عمدہ ہیں کہ تیز اور باریک چاقو سے بھی ان میں سوراخ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید نفاست یہ ہے کہ اینٹیں چن دینے کے بعد اکثر اوپر سے صاف اور ہموار کر دی جاتی تھیں۔ پختہ اینٹوں کا استعمال عام تھا اور اینٹیں موجودہ انگریزی اینٹوں سے کسی قدر بڑی۔ اسی شکل کی اور اتنی ہی نفیس ہوا کرتی تھیں۔

اکثر مکانات دو منزلہ ہوا کرتے تھے۔ بالائی منزل پر جانے کے لئے اینٹوں کی بنی ہوئی بہت تنگ سیڑھیاں ہوا کرتی تھیں کیونکہ ایک ایسے گنجان اور معمور شہر میں جگہ کی کفایت ضروری ہو گئی تھی۔ اکثر اوقات بہت وسیع اور بڑے بڑے زینے بھی تعمیر کئے جاتے تھے۔ اس کا ثبوت اس زمانے کے بنے ہوئے ایک دوہرے زینے کے انکشاف سے ملا ہے جس کی سیڑھیاں کافی کشادہ لیکن پست ہیں۔ ہر سیڑھی کی اونچائی صرف تین انچ ہے یہ زینہ یقیناً کسی اہم عبادتگاہ سے تعلق رکھتا ہو گا جس کی خالی بنیادیں باقی ہیں۔ یہ عمارت مٹی کے پشتے کے کنارے پر واقع تھی۔

شہر کی صفائی کا انتظام نہایت اعلےٰ اور بہمہ وجوہ مکمل تھا۔ یہ بات توجہ طلب ہے کیونکہ اس کی مثال ہندوستان کے باہر بھی اس عہد کے کسی شہر میں نہیں ملتی۔ ایک زمانے میں بازاروں کے عین وسط میں نہایت محنت سے بنائی ہوئی نالیاں ہوتی تھیں۔ اور بعض مقامات پر یہ نالیاں گلی کے دونوں اطراف پر ہوتی تھیں اور ہر مکان سے چھوٹی چھوٹی نالیاں نکل کر ان سے آملتی تھیں۔ بازاروں کی نالیاں عام طور پر پختہ بنائی جاتی تھیں۔ لیکن جب بہت کشادہ نالیاں بنانا مدِنظر ہوتا تھا جیسا کہ وسطی زمانے میں رواج ہو گیا تھا تو اینٹوں کی بجائے کھردرے پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ ان پتھروں کے کنارے بازار کی سطح کے برابر یا کسی قدر نیچے ہوا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض رہگیروں کے قدموں کی رگڑ سے چمک اٹھے! اس مقام پر میں اس بات کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ موہنجودارو کے

بازاروں اور نالیوں کی صفائی کے ساتھ معائنہ کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔ قیاس ہے کہ یہ فرض بلدیہ کے ملازمین سرانجام دیتے ہونگے۔
ہم آج بھی ان نالیوں کے قریب ریت اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پاتے ہیں جو نالیوں میں سے باہر نکال کر یہاں ڈالے گئے تھے۔

از منۂ قدیمہ میں یقیناً آج کل کی نسبت بارش کی افراط تھی۔ چنانچہ بعض مقامات پر طغیانیوں کا پانی باہر نکالنے کے لئے زیر زمین رستے بنے ہوئے تھے۔ یہ رستے اوپر سے ڈھکے رہتے تھے۔ مگر ان کے پھتوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے تھے تاکہ اوپر سے پانی ان میں جا سکے۔ ۲۷۵۰ ق م کے قریب ان نالیوں کی تعمیر "سینٹری انجنیئرنگ" کا محیر العقول کرشمہ ہے اور اس بات کا ثبوت کہ وادی سندھ کے انسان تہذیب کی بہت بڑی معراج پر پہنچ چکے تھے۔

تاہم شہر کے نظام صفائی کے بعض ناقابلِ ستائش پہلو بھی ہیں۔ گھروں کی نالیاں اکثر بیرونی دیواروں میں سے باہر نکالی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں آج کل بھی رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک گرم ملک میں بند نالیوں پر کھلی نالیوں کو ترجیح دینی چاہئے کیونکہ مؤخر الذکر اس قدر جلد نقص پذیر نہیں ہوتیں۔

مہنجو دارو کا فن تعمیر، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اپنے اوصاف میں بالائی سطحوں پر آہستہ آہستہ روبانحطاط ہوتا گیا اور شہر کی آخری دو ساختوں میں مکانات نہایت بھدے بننے لگ گئے۔ شہر کی تیسری تعمیر کا انجام اس طرح ہوا کہ طغیانی آگئی اور رہنے والے لوگ مکان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس آخری طغیانی سے پہلے بھی کئی بار طغیانیاں رونما ہوئیں۔ عہدِ وسطےٰ کی تیسری تعمیر کے دوران میں ایک غیر معمولی طور پر آفت خیز سیلاب آیا۔ ابھی چار ہی سال کا عرصہ ہوا ہے کہ دریائے سندھ میں سیلاب آگیا اور مہنجو دارو کے کھدے ہوئے کھنڈر، اس کا عجائب گھر اور ملازمین کے مکانات معرضِ خطر میں آگئے۔ لیکن فی الفور یہ انتظام کیا گیا کہ ایک بہت بڑا بند لگا کر سیلاب کا رُخ بدل دیا گیا۔

مہنجو دارو کی کھدائی پر جو مزدور لگائے گئے وہ سندھیوں، براہوئیوں اور بلوچیوں پر مشتمل تھے۔ کھدائی کا افسر اعلےٰ خود ایک براہوئی تھا۔ ان براہوئیوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ مہنجو دارو کے قدیم باشندوں کی اولاد ہیں چنانچہ ان کے فن اور ان کی صناعی پر کچھ رائے زنی کرنے سے پہلے اس مسئلے کا حل ضروری ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟

لیکن ابھی اس سوال کا جواب پورے وثوق سے نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ہمارے پاس براہوئیوں کے اس دعوے کی کوئی مستحکم شہادت ہی موجود ہے۔ چند انسانی پنجروں کے معائنے کے بعد ڈاکٹر گوہا جو "زولاجیکل سروے آف انڈیا" کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ وہ بہت حد تک لمبوترے سروں اور بڑے ماعون والی نسل انسانی سے تھے۔ اُن کی کھوپریوں کی محراب ورپہ کو اُٹھی ہوتی تھی۔ اور اہل سمیریا کی طرح ان کی ناک لمبی ہوتی تھی۔ کھوپریاں دو مختلف قسم کی دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کے خط وخال بالکل منگولیائی ہیں۔ یہ بات اور زیادہ دلچسپ ہے کہ زیریں سطحوں پر چند مٹی کے بُت ملے ہیں جن کی وضع بھی بالکل منگولیائی ہے۔ ڈاکٹر گوہا کی رائے ہے کہ مہنجو دارو کے دو عناصر ایک زمانے میں مخلوط ہو گئے تھے۔ دوسری قسم کی کھوپریاں اُن کھوپریوں سے مشابہ ہیں جو تل العبید میں پائی گئی ہیں۔ اور دیگر

خیال ہیں اس بات کا انکشاف چنداں حیرت انگیز نہیں کہ وادیٔ سندھ اور وادیٔ دجلہ و فرات کے انسانوں میں کوئی نہ کوئی نسلی تعلق ضرور تھا۔ اگرچہ اب ان کے لئے "ہندی سمیریائی" کی اصطلاح استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ ہم پہلے کرتے رہے ہیں۔

جو کھوپریاں فراہم کی گئی ہیں، وہ محض ان لوگوں کی نہیں جو طبعی موت سے زیر زمین دفن کئے گئے تھے۔ بلکہ سٹراٹا گریوز کو بہت سی ایسی کھوپریاں دستیاب ہوئی ہیں جن کی شکل و صورت بے حد مسخ شدہ حالت میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ کسی اتفاقی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اور غیر متوقع طور پر مٹی کے ڈھیر تلے دب گئے تھے۔ یہ کھوپریاں بالائی سطح کے قریب ہی پائی گئی ہیں چنانچہ ان کا تعلق شہر کے آخری عہد تعمیر کے ساتھ تھا۔

کچھ بہت زیادہ سال نہیں ہوئے کہ آخری عہد تعمیر کے چند اور اسی نوع کے باقیات، اس انبار کے نیچے سے ملے جس کا نام "د۔ک" رکھا گیا ہے۔ یہ نو آدمیوں کے ڈھانچے اور دو ہاتھی دانت پر مشتمل تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حملہ آوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ جو غالباً بلوچستان کی طرف سے وارد ہوئے تھے۔ اُن کی ہنگامی موت کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ اُن میں سے ایک کا سر دھڑ سے بالکل جُدا ہے اور باقی ماندہ کے اعضا مجروح اور مضروب نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہاتھی دانت کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب دشوار ہے۔ ممکن ہے یہ گروہ ایک خاندان کے لوگوں کا ہو جو شہر سے بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ اپنے ساتھ تھوڑا بہت تجارتی مال بھی لئے جا رہے تھے کہ دفعتاً قابو آ گئے اور مارے گئے۔ ان میں مرد بھی ہیں۔ عورتیں اور بچے بھی۔ جب اُن کا باقی مال و متاع لُوٹ لیا گیا تو حملہ آوروں نے ہاتھی دانت کو اپنے لئے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیلاب کے علاوہ شہر کے لوگوں کو کئی اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور میری رائے ہے کہ انہیں بلوچستان کے قبائل کا ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جیسے آج کل شمال مغربی سرحد کے قبائل بیحد اندیشہ ناک ہیں تاہم جب شہر اپنی قوت اور عظمت کی معراج پر تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی مدافعت کیلئے کافی طور پر چاق و چوبند تھا۔ اس بات کا قطعی طور پر کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس زمانے میں شہر پر کبھی کسی نے یورش کی ہو یا شہر کے کسی حصے میں آگ لگا دی ہو جیسا کہ سمیریا کے کئی شہروں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

یہ بات کہ اس شہر کے سمیریا اور ایلم کے ساتھ وسیع تجارتی تعلقات تھے اُن کثیر التعداد مُہروں سے ثابت ہوتی ہے جو ہندوستان کے کاریگروں کی محنت کا نتیجہ ہیں اور مذکرہ بالا دونوں شہروں کے کھنڈروں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان ہندوستانی مہروں کے علاوہ جو وہاں سے دستیاب ہوئی ہیں۔ وادیٔ سندھ میں سمیریا اور ایلم کے علاقوں کی بہت سی اشیاء ملی ہیں۔

جس قدر ثبوت مہیا ہو چکے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے مغربی ایشیا کے کسی علاقے سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے لیکن اُن کے آنے کا راستہ اور زمانہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اُن کے مذہبی عقائد کے متعلق ہمیں جو تھوڑا بہت علم حاصل ہُوا ہے اُس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے قدیم مذاہب کے رسوم کو اختیار کر لیا

تھا۔ مجھے یہ قیاس حیطۂ امکان میں نظر آتا ہے کہ سمیریا کے رہنے والے وادیٔ سندھ کے باشندوں سے کسی دور کے رشتے کا احساس ضرور رکھتے تھے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو قدرتاً اس وجہ سے اُن کے درمیان تجارتی تعلقات کے قیام میں آسانیاں پیدا ہوگئی تھیں اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے درمیان ایسے تعلقات ضرور تھے۔

(ترجمہ علیم الدین شمسی) ـــــــ "نخلستان"

مطبوعات

تاریخ صقلیہ ۔ جلد اوّل ۔ حجم ۵۱۶ صفحات ۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ۔ قیمت للعہ روپیہ پتہ ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ

سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین و سب ایڈیٹر "معارف" نے سسلی (صقلیہ) کی یہ جامع اور پُر از معلومات تاریخ لکھ کر نہ صرف اُردو زبان پر احسان کیا ہے ۔ بلکہ اسلامی تاریخ کی بھی ایک اہم خدمت انجام دی ہے +

کتاب موجودہ فنِ تاریخ کے اصول پر ہر طرح پوری اُترتی ہے ۔ ہمارے خیال میں اردو میں بہت کم تاریخی کتابیں اس فنی مہارت کے ساتھ لکھی گئی ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی مصنف کا اندازِ بیان نہایت شستہ ، حشو و زواید سے پاک اور ایک متین "تاریخی تصنیف کے ہر طرح شایان شان ہے ۔ صقلیہ کو اقبال نے اپنی مشہور نظم میں تہذیبِ حجازی کا مزار کہا ہے ۔ اس مزار کی یہ دلگداز داستان ہر دردمند مسلمان سے آنسوؤں کا خراج ضرور وصول کریگی ۔ ہماری رائے میں کوئی اسلامی کتب خانہ اس کتاب سے محروم نہیں رہنا چاہیئے +

انجمن ترقیٔ اُردو کی مطبوعات

ہمیں انجمن ترقیٔ اردو کی حسب ذیل کتابیں موصول ہوئی ہیں ۔ اس انجمن کی مطبوعات کے متعلق کسی قسم کی رائے یا حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ اس کی ہر کتاب اردو ادب میں ایک درجۂ امتیاز رکھتی ہے ۔ ذیل میں ہم محض ایک فہرست دینے پر اکتفا کرتے ہیں :۔

تذکرہ ریختہ گویاں مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے ۔ قیمت عہر

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر ۔ ۱۳۲ صفحات ۔ مولوی عبدالحق صاحب کا عالمانہ تبصرہ ۔ قیمت ۸ر

اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ :- حجم ۹۰ صفحات - از مولوی عبدالحق صاحب - قیمت ۸ر

ترکوں کی اسلامی خدمات - ڈاکٹر جولیس جرمانس کے تین لیکچروں کا با محاورہ ترجمہ - قیمت عہر

داستان رانی کیتکی و کنور اودے بھان - مصنفہ سید انشاء مرحوم - قیمت ۴ر

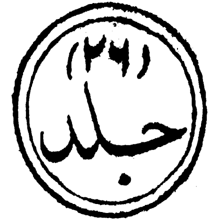
جنگنامہ عالم علی خان - نواب آصف جاہ نظام الملک اور عالم علی خان صوبہ دار دکن کی جنگ کا منظوم حال - مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب - قیمت ۶ر

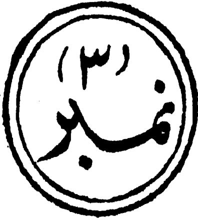
مخزن شعراء - یعنی تذکرۂ شعرائے گجرات - مؤلفہ قاضی نورالدین حسین خان رضوی فائق مرحوم - مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے - قیمت مجلد عہہ - غیر مجلد ۱۲ر

مرحوم دہلی کالج - از مولوی عبدالحق صاحب بی اے دہلی کالج کی جامع تاریخ اور اس ضمن میں انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کی تشریح - حجم ۱۷۰ صفحات بڑا سائز قیمت عہر - یہ سب کتابیں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے منگوائیے +

مثنوی تغلق نامہ خسرو دہلوی :- تہذیب و تحشیہ از سید ہاشمی فرید آبادی - یہ کتاب سلسلۂ مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی ہے - یہ انجمن حال ہی میں قائم ہوئی ہے اور اس کی مجلس عاملہ میں دیگر قابل حضرات کے علاوہ مولوی عبدالحق صاحب علامہ عمادی صاحب نواب مسعود جنگ بہادر - نواب صدر یار جنگ بہادر، اور نواب حیدر نواز جنگ بہادر سی شخصیتیں شامل ہیں - دکن کی علمی خدمات کے سلسلہ میں یہ انجمن ایک مفید اور اہم اضافہ ہے - یہ کتاب امیر خسرو نے سلطان غیاث الدین کی فرمائش پر لکھی تھی یہ مثنوی دنیا کی بہترین منظوم تاریخوں میں شامل ہونے کے قابل ہے - ابتدا میں ہاشمی صاحب نے نہایت قابلیت سے دیباچہ لکھا ہے - قیمت فی نسخہ مجلد چار روپے - پتہ :- مجلس مخطوطات فارسیہ نامپلی - حیدرآباد دکن

ترکانِ احرار (طبع ہفتم) مصنفہ مولانا عبدالمجید صاحب عتیقی - قیمت عہر - مجلد ۸ر - کامل بک ڈپو لاہور سے منگوائیے حضرت عتیقی متعدد تاریخی کتابوں، سیرتوں اور طبی کتابوں کے مؤلف ہیں - ۱۹۲۶ء میں ایک ڈاکٹر کی نادانی اور بے پروائی سے اُن کی بینائی زائل ہوگئی - لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور علمی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کی موجودہ کتاب بے انتہا مقبول ہوئی ہے چنانچہ اب ساتویں بار چھپی ہے - یہ کتاب ترکی کی گذشتہ ربع صدی کی تاریخ ہے - اس میں ان تمام ترک مردوں اور عورتوں کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں - جنہوں نے موجودہ ترکی کی تشکیل میں حصّہ لیا - کتاب میں بیسیوں ہاف ٹون عکسی تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے - ہم شائقین سے اس کتاب کی پرزور سفارش کرتے ہیں - حضرت عتیقی ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں +





فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۴ء

تصاویر:- (۱) کٹار دھار ہوشیار پور (۲) کوہ شوالک کے جنگلوں کی بُری حالت

چندہ سالانہ ۶ صہ مع محصول — ششماہی ۳ صہ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

ہنڈن برگ

مسٹر عطاء اللہ کلیم کا یہ مضمون ہمیں دیر سے موصول ہؤا۔ ہنڈن برگ کی موت کا واقعہ ہنوز تازہ ہے اس لئے اس کی اشاعت ہم اسی مہینے جہاں نما کے زیر عنوان مناسب سمجھتے ہیں۔

آہ! مرنے والے، کتنے خیالاتِ عالی تیرے دماغ سے نکلے تھے، تیری ذات کن جذبات کا مرکز تھی، تو شرافتِ نفس کا نمونہ تھا، وطن عزیز اور بادشاہ کی بے غرض خدمت تیرا کام تھا، تیرے بعد جرمنی میں ذہانت اور اخلاق میں تیرا کوئی ہمسر نہیں،

جن الفاظ میں ہنڈن برگ نے جرمنی کے بہترین سپہ سالار فان مالٹکے فاتح فرانس کی موت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، آج اس کی عظمت خود اس کے متعلق وہی الفاظ ہم سے کہلوا رہی ہے، تاریخ میں نپولین اور مالٹکے کے بعد جو درجہ ہنڈن برگ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہؤا، اس نے سپہگری کی تاریخ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جس طرح بیسویں صدی کے آغاز تک تمام سپہ سالار نپولین کے طریق جنگ کی پیروی کرتے رہے ہیں، اسی طرح نئے دور کے جرنیل فوجوں کی نقل وحرکت میں ہنڈن برگ کو اپنا استاد مانیں گے، اگرچہ جنگِ عظیم کا نتیجہ جرمنی کے حق میں ہزیمت اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ہؤا لیکن اس سے ہنڈن برگ کی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا، اس کی شجاعت، بیدار مغزی اور اولوالعزمی کے اوصاف اس کے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں، اس کے عسکری کارنامے اس قدر شاندار اور اہم ہیں کہ انہوں نے اس کی سیاسی سرگرمیوں کو پس پشت ڈال دیا ہے، صدر جمہوریہ جرمنی کی حیثیت سے اس کی خدمات چنداں حقیر نہیں لیکن آنے والی نسلیں اسے اس کے فوجی کمالات کی وجہ سے یاد کریں گی، اس کا راز اس کی ابتدائی تربیت میں مضمر ہے، اس کی اٹھان ہی اس طرح ہوئی کہ وہ ہر معاملے کو صرف سپاہیانہ نقطۂ نظر ہی سے دیکھ سکتا تھا، اس کی زندگی کا خواہ کسی شعبہ میں مطالعہ کیا جائے اس کی فوجی تعلیم کا اثر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خواہ ہمارا مطمعِ نظر صدر جمہوریہ جرمنی ہو لیکن ہمیں سپہ سالار ہنڈن برگ کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہئے۔ اس کی حقیقت آگے چل کر کھلے گی۔

۱۸۵۹ء میں پال فان ہنڈن برگ گیارہ برس کی عمر میں حربی مدرسہ میں داخل ہؤا، ۱۸۶۵ء میں نصاب تعلیم مکمل کر کے

باقاعدہ فوج میں داخل ہو گیا، ۱۸۶۵ سے ۱۹۱۱ تک جب وہ فوجی خدمات سے سبکدوش ہوا، اس نے آسٹریا اور فرانس کی جنگوں میں حصہ لیا لیکن کوئی نمایاں خدمت سرانجام نہ دے سکا، البتہ فوجی تعلیم اور دورانِ ملازمت میں اسے زندگی کے چند ایسے گر دستیاب ہوئے جن سے یورپ کے مستقبل پر کافی اثر پڑا۔

جنگ جرمن قوم کے اخلاق کا لازمی عنصر ہے، جرمنوں کے لئے زندگی ایک جنگ کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسی رنگ میں زندگی کے ہر شعبہ کی تشریح کرتے ہیں، مہذب دُنیا کی نظروں میں جنگ کتنی ہی مذموم کیوں نہ ہو، امن پسند افراد خواہ فوج کو قوم کے لئے ایک غیر ضروری بار سمجھیں، اور معلمانِ اخلاق جنگ کو اضطراری گناہ سے تعبیر کریں لیکن جرمنوں کی نظر میں جنگی تعلیم زندگی کا جزو لازمی ہے، ہنڈن برگ اس کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں اور جو محض ہٹ دھرمی سے فوج کے خلاف زہر نہیں اُگلتا یہ تسلیم کرے گا کہ فوج عزم وعمل کی تربیت کے لئے بہترین جگہ ہے، ہزاروں اشخاص نے اس میں رہ کر ایسی دلی قوت حاصل کی ہے جو تمام عمر ان کے لئے کارآمد ثابت ہوئی، ہماری قومی فوج ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں مساوات اور اتفاق کا عملی سبق دیا جاتا ہے، ہمارے عسکری نظام کا مُدعا یہ ہے کہ خود غرضی اور حبِ ذات کا جو مادہ انسان میں مضمر ہوتا ہے اور جو حکومت اور سماج کو کھوکھلا کر دیتا ہے اس کا قلع قمع کرے، فوج میں رہ کر فرد کو ذاتی خواہشات پر قابو حاصل کرنے کی مشق ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنے ذاتی مفاد پر ملک وقوم کی اغراض کو ترجیح دینے کا عادی ہو جاتا ہے"

ان دعووں کے امتحان کا وقت آ گیا، جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عمومی چھڑ گئی تو ہنڈن برگ کو اپنے فوجی تجربہ سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا، اسے مشرقی محاذ پر روسی حملہ کے دفاع کے لئے مامور کیا گیا، قدرت نے جس گھڑی کے لئے اسے پیدا کیا تھا، وہ آپہنچی قیصر ولیم کی نظرِ انتخاب کی داد دینی چاہیئے جس نے ہنڈن برگ کو اس کام کے لئے چُنا جو اس کے لئے موزوں ترین تھا اور جس کے لئے وہ موزوں ترین تھا، پُرانے زمانے میں اس کے آباء جن میدانوں میں صدیوں تک روسیوں سے برسرِ پیکار رہے تھے انہی میدانوں میں اسے اپنے قدیم دشمن سے دوچار ہونا پڑا، خود اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی خطہ میں گذرا تھا اور سالانہ مصنوعی جنگوں میں بھی وہ اسی علاقہ میں فوج کی کمان کیا کرتا تھا، ٹینبرگ اور مسوری جھیلوں کی لڑائیوں میں اس نے دو رُوسی فوجوں کو ملیا میٹ کر کے جرمنی کو غیر ملکی دشمن کی لعنت سے پاک کر دیا، ان جنگوں میں اور ان کے بعد جب وہ مغربی محاذ پر مامور کیا گیا۔ جنگ کے خاتمہ تک جنرل لیوڈنڈارف اس کا رفیق کار اور معاون تھا، اس لئے ہنڈن برگ کے نکتہ چین کہا کرتے ہیں کہ جنگ کی تجویزیں تو لیوڈنڈارف کے دماغ سے نکلتی تھیں لیکن سہرا ہنڈن برگ کے سر رہتا تھا، ہنڈن برگ کی سوانح نگار مس مارگریٹ گولڈ سمتھ نے اس بات پر بہت حاشیے چڑھائے ہیں، اور اس کی شخصیت کو گھٹانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس عظیم الشان شخصیت کے کمالات کا اندازہ کرنے سے پہلے اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے، لیوڈینڈ ڈارف کی خداداد ذہانت اور اس کے سپاہیانہ ملکہ سے انکار کرنا انصاف کا خون کرنا ہے، ہنڈن برگ نے نہایت فراخدلی سے اس کے گراں قدر مشوروں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے "میں نے بارہا لیوڈینڈارف اور اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی نوعیت ایک کامیاب شادی کی سی تھی، ایسے معاملے میں ایک تیسرا شخص کس طرح دونوں کے انفرادی اوصاف کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے، وہ قولاً اور فعلاً ایک ہوتے ہیں جو بات ایک کہتا ہے وہ دوسرے کی خواہشات اور جذبات کا نتیجہ ہوتی ہے"

جب جرمنی کی شکست کے بعد لیوڈینڈارف اپنے عہدہ سے سبکدوش کیا گیا اور اس کی شہرت اس کے لئے عذاب جان بن گئی، اس نے اپنے ہموطنوں کے طعنوں کی تاب نہ لاکر مونچھیں منڈا دیں اور ہالینڈ چلا گیا، اس وقت بھی ہنڈن برگ نے رائے عامہ کی پرواہ کرتے ہوئے اعلان حق کو اپنا فرض سمجھا اور ان شاندار الفاظ میں اپنے رفیقِ جنگ کا تذکرہ کیا "ایک دن ایسا ہوگا جب دنیا کے بہترین آدمیوں کی طرح لوگ اس کی قدر بھی کریں گے، اس وقت تمام ملک اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا، میری دُعا ہے کہ جب آزمائش کا وقت آئے تو وطن عزیز کو اس جیسا آدمی مل سکے جس کا رواں رواں اس کے کمال انسانیت کا گواہ ہو، جو اکیلا لشکروں پر بھاری ہو، اگر کوئی آدمی بھی کسی عظیم کام کے لئے پیدا ہوتا ہے تو لیوڈینڈارف ضرور ایسا شخص تھا۔

اس کے دشمنوں کو اس سے بڑی نفرت تھی! یہ اس لئے کہ وہ اس کی قابلیت سے اچھی طرح واقف تھے"

ہنڈن برگ نے جس طرح لیوڈینڈارف کی دوستی کا حق ادا کیا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے، یہ امر ہمیشہ خوشی سے یاد کیا جائے گا کہ اس نے اپنے رفقائے جنگ سے نباہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، جرمنی کے حلیف اس کے لئے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ثابت ہو رہے تھے لیکن ہنڈن برگ کبھی ان کا بُری طرح ذکر نہیں کرتا، آسٹریا جو جنگ کی ابتدا کا ذمہ دار تھا ہر ایک قدم پر جرمنی کا سہارا ڈھونڈتا تھا، بلغاریہ بھی مدافعت اور مجادلت کے لئے جرمنی کا محتاج تھا، اس پر بھی جرمنی کے یہ نامرد حلیف شوخ چشمی اور ڈھٹائی سے بڑھ بڑھ کر مطالبات کرتے تھے اور ان کی جوع الارض ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ صرف ترکی نائندے طلعت پاشا اور انور پاشا جرمنی کے ساتھ معاملہ کرنے میں فراخدلی اور انصاف سے کام لیتے تھے، ہنڈن برگ ان کی فیاضی اور وفاداری کا بڑا مداح تھا اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا کرتا تھا۔

جرمنی کی شکست اٹل تھی، جنگ کے پہلے مہینوں میں ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کا مقابلہ جن حوصلہ شکن اور زہرہ گداز قوتوں سے ہے وہ اس کی کمر توڑ کر رہیں گی لیکن یہ ہنڈن برگ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کئی بار یہ طاقتیں نیست و نابود ہونے کے قریب پہنچ گئیں، اور اگر حوادث جرمنی کے خلاف نہ ہوتے تو اس کی کوششیں ضرور بار آور ہوتیں۔

لیکن تقدیر نے ساری دنیا کو اس کے مخالفین کی صف میں کھڑا کر دیا اور اسے ناچار ہار ماننی پڑی، ۸ اگست ۱۹۱۸ء کو جرمنی

کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا، فاش، ہیگ اور پرشنگ کے متفقہ اقدام نے جرمنی کی ٹڈی ماندی فوج کو ایسی زک پہنچائی کہ اس کا پنپنا ناممکن ہوگیا، اور ہنڈن برگ نے دیکھا کہ اتحادیوں کی فوج کا مقابلہ اس کی ہمت سے باہر ہے، ناچار جرمنی کو صلح کرنی پڑی۔ اب شکست خوردہ فوج کو صحیح وسالم واپس لے جانا بھی جان جوکھوں کا کام تھا، سپاہ بددل ہوگئی تھی، ملک میں انقلاب برپا ہوگیا تھا، اگر فوج قابو میں نہ رہتی تو جرمنی کی تباہی یقینی تھی مگر ہنڈن برگ نے دل شکستہ سپاہیوں کی ڈھارس بندھائی، ناموسِ وطن اور قومیت کے نام پر ان سے حفظِ امن کی درخواست کی اور انہیں واپس برلن پہنچا کر منتشر کردیا۔

اس کارنامہ کی اہمیت کا احساس جب ہوگا کہ تاریخ کے بڑے سے بڑے جرنیلوں کے حالات سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ نپولین نے تین شکستیں کھائیں، اول مصر، دوم ماسکو، سوم واٹرلو، ان لڑائیوں کے بعد اس کی فوجوں کا ڈھونڈے سے پتہ نہیں ملتا، نپولین کو شہرت اور فتح اپنے سپاہیوں کی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جنگ کا رخ بدلتا دیکھتا تھا تو اپنی فوج کو دشمن کے رحم پر چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا، برخلاف اس کے ہنڈن برگ کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جہاں تک ہوسکے کسی سپاہی کا خون رائیگاں نہ جائے، جنگ کی ابتدا سے آخر تک وہ مٹھی بھر فوج سے کثیر التعداد دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اور اس نے مدافعت کا ایسا طریقہ ایجاد کیا کہ چین کی دیوار کے مقابلے میں ہنڈن برگ لائن کا نام رہتی دنیا تک پیش کیا جائے گا۔

ہنڈن برگ کا مقابلہ تقدیر سے تھا جس کے سامنے انسان کی بہترین مساعی بیکار رہیں لیکن شکست کے بعد بھی وہ دنیا کی نظروں میں سرخرو ہوگیا، کیونکہ ہجوم نا امیدی کے باوجود اس کی سعی پیہم میں فرق نہ آیا اور وہ تاریک ترین لمحوں میں بھی اپنا فرض پوری تن دہی سے ادا کرتا رہا، اس نے جرمن فلسفی کانٹ کا یہ مقولہ عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا کہ "ادائے فرض ہی بہترین خوشی ہے" صلح کے بعد بہت سے دردمند جرمن اپنے ملک کی خستہ حالی نہ دیکھ سکے اور ترکِ وطن کرگئے لیکن ہنڈن برگ نے نہایت بے جگری سے مصائب کا مقابلہ کیا اور اپنے وطن کی حالت سدھارنے میں مصروف ہوگیا، اس نے نازک ترین اوقات میں بھی آس نہ چھوڑی اسے یقین تھا کہ ایک دن جرمن قومیت کی روح پھر بیدار ہوگی۔ جرمنی کی رگ رگ میں خونِ زندگی دوڑیگا اور وطن پرستوں کی سعی کامیاب ہوگی، اس کا اُلٹا ہوا تخت پھر قائم ہوگا، وہ دولِ یورپ میں پھر باعزت جگہ پائے گا۔

ہنڈن برگ کی سیرت دو لفظوں میں ختم ہوسکتی ہے وہ بہترین محب وطن اور کامل ترین جرمن تھا، وہ مرتے دم تک اپنے قیصر کا وفادار رہا، لیکن اس نے مفادِ وطن کو قیصر کی دوستی پر بھی ترجیح دی اور اس کی دوستی کا علانیہ دم بھرتے ہوئے بھی جمہوریت کے استحکام میں مصروف رہا حتےٰ کہ اس نے اپنی صحت، سکون اور زندگی کو بھی اس کی نذر کردیا۔

(عطاء اللہ کلیم)

جنگل کی حفاظت

(تصویری مضمون)

تمام مخلوق کا دارومدار نباتات پر ہے۔ جنگل اور کھیت انسان وحیوان کے لئے زندگی کی کُل ضروریات بہم پہنچاتے ہیں۔ جنگل سے عمارت و آرائش کے واسطے لکڑی، ایندھن، کوئلہ، طرح طرح کی جڑی بوٹیاں، پھل، گوند، لاکھ، گھاس پھوس، بانس اور مویشیوں کے لئے چارہ پیدا ہوتا ہے۔ جنگل کی حفاظت کی اہمیت ظاہر ہے۔ انسانی ضروریات کے علاوہ بھی جنگل کا ہونا اور بہت سی وجوہ سے ضروری اور فائدہ مند ہے۔ مثلاً جنگلی علاقے کے دریاؤں اور چشموں میں بارہ مہینے پانی جاری رہتا ہے۔ جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے قریب کے نچلے میدانی حصے تباہ کُن سیلابوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ جنگل میں قسم قسم کے شکار کی پرورش ہوتی رہتی ہے جس سے سینکڑوں آدمیوں کا دل بہلتا ہے۔

جنگل کے برباد ہو جانے سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ بارش میں کمی ہو جاتی ہے۔ پانی کی سطح گر جاتی ہے اور باغوں اور کھیتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ پہاڑی جنگلوں کے برباد ہو جانے سے نہ صرف دولت برباد ہو جاتی ہے بلکہ پہاڑ بھی کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ایسے نالوں کے ذریعہ سے ریت بہہ کر نچلے میدانی حصہ کے کھیتوں میں پڑنے لگتی ہے جس سے وہ بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ یہ ریت نہروں اور نالوں کو بھی پاٹ دیتی ہے۔ جنگل کے برباد ہو جانے سے دریاؤں اور چشموں میں پانی کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے موسم سرما میں آبپاشی پوری نہیں ہونے پاتی۔

جنگل کے تباہ ہونے کا آب وہوا سے کچھ تعلق نہیں بلکہ انسان خود اس کو کاٹ کر مٹا دینے اور نیز آتش زدگی اور چرائی کے ذریعہ سے اُس کو برباد کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ جنگل کے قریب کے میدانی حصہ میں کاشتکاری کی کثرت کی وجہ سے یا ایسی پہاڑی ڈھلانوں پر کاشت کرنے سے جن کی مٹی بکھرنے والی ہو جنگل بہت برباد ہوتا ہے۔

آگ زمین کے قدرتی حفاظت کے ذرائع یعنی گھاس پھوس جھاڑی بوٹی وغیرہ کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اور جب اس کے بعد ننگی زمین پر تیز بارش پڑتی ہے تو یہ سب مٹی کو بہا لے جاتی ہے اور ننگی چٹانیں رہ جاتی ہیں۔ جو پہاڑی علاقہ میں اکثر کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ درختوں اور اُن کی پود کو بھی آگ سے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جوں جوں جنگل اس طرح سے کم ہوتے جاتے ہیں اُن کی منفعی

پیداوار میں بھی کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور ان کے قریب کی آبادی کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے یہ حصہ اُجڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

بلا کسی انتظام و بندش کے مویشیوں کو چرانا خواہ شاملات میں ہو یا جنگل میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا ہے گھاس کا عین اُسی وقت چر جانا جبکہ وہ بڑھنی شروع ہی ہوئی ہو پودوں کو بہت کمزور کر دیتا ہے اور بار بار چرے جانے سے یہ پودے کمزور ہوتے ہوتے آخر کار مرجاتے ہیں اور اُن کے بجائے خراب قسم کی گھاس اُگ آتی ہے۔ اس طرح چارہ کی کمی ہوتے ہوتے آخر کار شاملات کا رقبہ گاؤں کے واسطے بالکل ناکافی ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جنگل پر چرائی کا بوجھ زیادہ ہوتے ہوتے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جو حال شاملات کا ہوا تھا وہی حال جنگل کا ہو جاتا ہے مویشیوں کے چرنے کے علاوہ جنگلوں میں چرواہے پہلے شاخیں تراش تراش کر کھلا دیتے ہیں۔ پھر جب شاخیں کم ہو جاتی ہیں تو اُن مقاموں پر سے جو قریب قریب ننگے ہو چکے ہیں درختوں کو بھی کاٹ کر اپنے مویشیوں اور بکریوں کو کھلا دیتے ہیں۔ اس طرح چرائی سے درختوں اور گھاس پھوس کے برباد ہو جانے پر زمین بارش سے کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہونے لگتی ہے جس سے اس ملک کی دولت کی تباہی ہوتی ہے جب پہاڑی جنگلوں کی اس طرح بربادی ہوتی ہے تو ان نالوں کے ذریعہ سے نیچے کے ملک کی زمین پر ریت کے پڑ جانے سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ انبالہ و ہوشیارپور کے ضلع کے چوڑ اس امر کی مثال ہیں۔ انبالہ و ہوشیارپور کے کوہ سوالک کے جنگلوں کی بربادی سے جو ۱۵۵ مواضع کے ہاتھوں سے وقوع میں آئی ہے ایک ہزار سے زائد مواضع کی زمین ریت پڑ جانے سے تباہ ہوگئی ہے۔

یہ بڑی ناانصافی ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے دیہات کے باشندوں کو اپنا پیٹ پالنے کے واسطے جنگل کو اس طرح برباد کرنے دیا جائے اور اس کی وجہ سے سینکڑوں بڑے بڑے مواضع کی زمین کو نقصان پہنچے۔

کسی ملک کے جنگل برباد ہو جانے سے اُسکی کاشت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے یہی نہیں بلکہ اُس کی ترقی اور تہذیب پر بُرا اثر پڑتا ہے بوریا میں جنگل کی تباہی کی وجہ سے حالت اتنی بدل گئی کہ باوجود زمین کی زرخیزی کے انگور کی کاشت جو پہلے بہت زیادہ ہوتی تھی بالکل فنا ہو گئی پھر زراعت تباہ ہوگئی اور آخر کار چراگاہ بھی نہ رہی۔

قانونِ حقوق کا منشا یہ ہے کہ حقوق اس طریقے سے نہ حاصل کئے جائیں جس سے حقوق ہی مٹ جائیں یا کسی دوسرے کی ملکیت کو نقصان پہنچے۔ پس یہ لازم ہے کہ:۔

(۱) شاملات میں چرائی خاص نظام کے ماتحت کی جائے۔

(۲) جنگلوں کی حفاظت کی جائے اور اُن میں چرائی کا صحیح بندوبست ہو۔

(۳) اُن زمینوں کو جو ریت پڑ جانے سے تباہ و برباد ہوگئی ہیں اور اُن پہاڑوں کو جو جنگل کے برباد ہو جانے سے ویران چٹان بن گئے ہیں از سرِ نو جنگل لگا کر کارآمد اور آباد کیا جائے۔

منظور احمد ککے زئی

جمہوریت

جمہوریت کی مشہور ترین تعریف ابراہیم لنکن کے وہ الفاظ ہیں۔ جو اس نے اپنی گیٹس برگ والی تقریر کے دوران میں کہے۔ یعنی عامۃ النّاس کی حکومت۔ جو عامۃ النّاس کے ذریعے سے عامۃ النّاس کے فائدے کے لئے کی جائے۔ اس تعریف کے تین حصے ہیں:-

اوّل۔ عامۃ النّاس کی حکومت۔ یعنی یہ کہ سیاسی قوت نظام سیاسی کے کسی خاص فرقے یا گروہ یا فردِ واحد پر محدود نہ ہو۔ بلکہ اسے اس قوم یا آبادی کا حق سمجھا جائے جو نظام سیاسی سے متعلق ہو۔ اس عقیدے کی ابتدا دورِ حاضر میں مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے کی۔

دوم۔ عامۃ النّاس کے ذریعے سے۔ یعنی ہر فرد کو ذاتی طور پر دوسروں کی نمایندگی کرنے کا یا دوسری صورت میں کسی اور نمایندے کے حق میں یا اس کے خلاف رائے دینے کا اختیار ہو۔ اگر کسی نظام سیاسی میں کوئی فرقہ اس حق سے محروم کر دیا جائے تو اسے جمہوری نظام نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ یہ محرومی تھوڑے عرصے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ایک دو باتوں کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔

اوّل۔ موجودہ حالات میں چونکہ اکثر حکومتوں کی بنیاد جغرافیائی اور نسلی خصوصیات پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے غیر ملکی باشندوں پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ یہ امتیاز درست ہو یا نہ ہو۔ موجودہ حالات میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

دوم۔ نابالغ یا مخبوط الحواس افراد کو سیاسی حقوق سے محروم کر دینا چاہئے۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔

میرے خیال میں ان دو باتوں کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی فرد کو سیاسی حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہو۔ اگر ہم لوگ اپنی مشرقیت کے زور میں یہ کہیں کہ عورتیں ناقص العقل اور مخبوط الحواس ہیں۔ انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دو۔ تو یہ بات خالص جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے ناقابلِ قبول ہو گی۔ یا ایسے ہی اگر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی جائیں اور آمدنی کا ایک خاص معیار مقرر کر کے جو لوگ اس معیار سے نیچے ہوں انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دیا جائے تو یہ بات بھی اسی نقطۂ نگاہ سے نادرست معلوم ہوتی ہے۔

سوم۔ عامۃ النّاس کے فائدے کے لئے۔ ہر ایک جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنی توجہ اور اپنے روپے کو ایسے کاموں پر صرف کرے۔ جن سے اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ متصور ہو۔ یعنی ان کے اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

لنکن کی تعریف "جمہوریت" کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ اس میں نظام جمہوری کی عملی خصوصیات سے بحث نہیں کی گئی۔ مثلاً

قانونی مجالس۔ دستور اساسی۔ حلقہ ہائے انتخاب وغیرہ جن کے بغیر جمہوریت سوائے ایک خیالِ خام کے اور کچھ نہیں۔ خالص جمہوری نقطۂ نظر کا تقاضا تو یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کی رائے ہر معاملے میں لی جائے۔ مگر چونکہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں مثلاً سوئٹزرلینڈ میں بھی اس اصول پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عملی طور پر جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے ہر فرد کو قوم کی نمائندگی کی کوشش کرنے کا یا کسی اور اُمیدوار کے حق میں رائے دینے کا اختیار دیا جائے۔ جو نمائندے اس طریق سے منتخب کئے جاتے ہیں وہ انتخاب کے بعد بڑی حد تک اپنے حلقۂ انتخاب سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ان کی رائے ہر معاملے میں ان کے حلقۂ انتخاب کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہو۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات ایک آدھ نمائندہ اپنے حلقۂ انتخاب سے کسی مسئلے پر استصوابِ رائے کر لیتا ہے۔ یا کبھی کبھی کسی اہم مسئلے پر ملک کے سب رائے دہندوں کی رائے لی جاتی ہے (جسے انگریزی میں Referendum کہتے ہیں) مگر اس سے جمہوریت کے عام حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک قانون ساز مجلس اپنی اکثریت کے ذریعے سے ایک قانون پاس کر دیتی ہے اور بعد میں اگر یہ خیال ہو کہ ملک کے کسی حصے میں اس قانون سے اتفاق نہیں کیا جائے گا تو پروپیگنڈا کر کے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ جادو چل جاتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ 'جمہوریت' کی عملی صورتوں میں بجائے اس کے کہ انتخابی حلقوں کی حکومت ان کے نمائندوں پر ہو زیادہ تر نمائندوں کی حکومت انتخابی حلقوں پر ہوتی ہے۔

اور جمہوری حکومتوں کے عام شہریوں کا یہ احساس کہ ہم حکومت کے حصہ دار ہیں بڑی حد تک ایک دھوکا ہے اور اسی دھوکے کا نام جمہوریت ہے۔ آج کل کے اکثر جمہوری لیڈروں اور پرانے زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں میں فرق یہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے رعایا کے سامنے تقریریں کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور آج کل تقریروں کے بغیر کام نہیں نکل سکتا۔ یہ فرق معمولی ہو یا غیر معمولی اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ تقریر بازی جمہوریت کا بنیادی اصول ہے اور ہر جمہوری لیڈر کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں صحیح طور پر یا غلط طور پر یہ خیال پیدا کر دے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری مرضی سے ہو رہا ہے۔

'جمہوریت' کا تصور یہ ہے کہ سیاسی قوت کو جہاں تک ہو سکے تقسیم کر دیا جائے اس کی عملی صورت خواہ کچھ ہی ہو۔ ہر ایک جمہوری حکومت کا نظام اسی اصول پر مبنی ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔ ہر ایک قانون ساز مجلس میں مختلف الخیال گروہوں کا وجود لازم ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کسی مسئلے کے ہر ایک پہلو پر غور نہیں ہو سکتا۔ پھر جو گروہ برسرِ حکومت ہو اس کے لئے لازم ہے کہ چیدہ افراد کو مختلف چھوٹے گروہوں یعنی سب کمیٹیوں میں تقسیم کرے جن کو مختلف شعبوں کا کام سپرد ہو۔ قبل اس کے کہ کوئی قانون وضع کیا جائے ضروری ہے کہ مجلس قانون ساز میں اس کے مختلف پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ غور کیا جائے۔ اور اس کے قانون بننے کی راہ میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں پیدا کی جائیں مثلاً انگلستان کی پارلیمنٹ میں جو مسودۂ قانون پیش ہوتا ہے اس پر سب سے پہلے دارالعوام یعنی ہاؤس آف کامنز

میں بحث ہوتی ہے۔ پھر اگر اکثریت کی رائے ہو تو معاملہ ایک سب کیٹی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جو اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس کے متعلق کچھ سفارشات پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد مسودے میں پارلیمنٹ کی رائے سے مناسب ترمیم ہوتی ہے اور اسے اجلاس میں تین مرتبہ "پڑھا" یا پاس کیا جاتا ہے۔ بعدازاں یہ قانون دارالامرا یعنی ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہاں بھی اسی طرح تین دفعہ پڑھا جاتا ہے۔ جب تک یہ سب مرحلے طے نہ ہو چکیں۔ اس پر بادشاہ کے دستخط نہیں ہوتے۔ اور اسے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

"جمہوریت" اکثریتوں کی حکومت ہے۔ ہر ایک انتخاب پر ہر ایک قانون ساز مجلس میں ہر ایک سب کیٹی میں ہر معاملے کا فیصلہ اکثریت سے ہوتا ہے۔ اور اقلیت کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کسی جمہوری حکومت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اکثریتوں اور اقلیتوں کی کشمکش آئینی حدود سے باہر نہ نکلے یعنی جو گروہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں وہ قانون ساز مجلس میں زیادہ سے زیادہ رائیں اپنے لئے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک دوسرے کی مخالفت کے سلسلے میں ملک میں بدنظمی یا انقلاب پیدا کرنے اور ایک دوسرے کی آزادیٔ رائے کو سلب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے خیالات کو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں حلقہ ہائے انتخاب میں پھیلائیں اور اس کے نتیجے کا آئندہ انتخاب تک انتظار کریں۔ یہ بات جبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ قوم کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کی رائے کو عزت کی نظر سے دیکھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور اس کی وجہ سے قوم میں ایک سیاسی توازن پیدا ہو جائے۔ جس میں انقلابی تحریکات اور غیر آئینی جدوجہد کی گنجائش نہ ہو۔

اس توازن کو پیدا کرنے کے لئے اچھے معلموں کی ضرورت ہے۔ جو قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو اُن کی ذمہ داری کے لئے تیار کر سکیں۔ قبل اس کے کہ کوئی قوم جمہوریت کا خیال دل میں لائے اور اسے نباہ سکے۔ لازم ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں تعلیمی نظم و نسق ہے صحیح دماغ اور صحیح احساس کے لوگ ہوں۔ اس امر کو جتنی اہمیت بھی دی جائے کم ہے۔ پرانے زمانے کے شاہزادوں کو بھی اچھے اتالیقوں کی ضرورت تھی۔ مگر ایک اچھے اتالیق کے باوجود بھی ان میں سے اکثر کورے رہتے تھے۔ قوموں کے متعلق یہ بات صحیح نہیں۔ اگر معلم اچھے ہوں تو قوم کے ایک معقول حصے پر ان کا ضرور اثر ہوگا۔ کیونکہ سب لوگ غبی اور نالائق نہیں ہو سکتے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انگلستان کا سیاسی توازن وہاں کی یونیورسٹیوں اور پبلک سکولوں کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر یہ تعلیمی مرکز صحیح خیالات اور صحیح تربیت کے حامل نہ ہوتے تو آج جمہوریت کو انگلستان میں وہ شاندار کامیابی نہ ہوتی جو ہے۔ اب تک جو نقائص نظامِ جمہوری میں موجود ہیں۔ ان کا علاج تعلیم کے سوا کچھ نہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ ان نقائص میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جو انسانی طبیعت کی خصوصیات سے وابستہ ہیں مگر تعلیم فطرتِ انسانی کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور بدل دیتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عامۃ الناس کو خواہ کتنی ہی تعلیم دی جائے ان میں بڑے بڑے سیاسی مسائل کو سوچنے اور سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہو سکتی اور انہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں آ کر ایک خاص رائے دینے اور تقریر باز لیڈروں کے ذریعے سے ورغلائے جانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ تعلیم کے ذریعے سے ان

نقائص کو بتدریج کم کیا جاسکتا ہے۔

اب اگر جمہوریت کے عملی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو چند اہم حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ جمہوریت بظاہر اکثریتوں کی حکومت ہے لیکن اصل میں قوت چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ بہترین قسم کے افراد ہوں۔ اس کا مشاہدہ خصوصاً اس وقت کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی مسئلے پر دو مخالف گروہوں کے ووٹوں کا فرق قلیل ہو۔ مثلاً باؤن رائیں ایک طرف ہوں اور اڑتالیس دوسری طرف۔ یہاں فیصلہ صرف چار رایوں کی کثرت سے ہوگا۔ اور یہ رائیں غالباً ایسے لوگوں کی ہونگی جو خود کوئی رائے نہیں رکھتے اور مصلحت کی وجہ سے یا لاعلمی کی وجہ سے ادھر یا اُدھر رائے دے دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سارے کے سارے جمہوری نظام کی باگ چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو اپنی شخصیت کی وجہ سے دوسروں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ یا ایسے جوڑ توڑ جانتے ہیں کہ کسی اور کو ان کے مقابلے میں قوت میسر نہیں ہوتی اور بار بار وہی لوگ برسراقتدار آتے ہیں، مثال کے طور پر ڈسرئیلی اور گلیڈسٹون دونو چار مرتبہ وزیر اعظم انگلستان ہوئے۔ موسیو بری آں گیارہ مرتبہ فرانس کے وزیر اعظم بنے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ایک اور قباحت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری نظام کے ذریعے سے برسراقتدار آتے ہیں وہ دماغی قابلیت یا طبیعت کی لطافت کے لحاظ سے قوم کے بہترین افراد نہیں کہے جاسکتے۔ جمہوریت بہترین افراد کی قدر کرنے سے قاصر ہے۔ وہ ان آدمیوں کو چاہتی ہے جو دوم درجہ کی قابلیت رکھتے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شیکسپیئر اور گوئٹے یا نیوٹن آج کسی جمہوری حلقۂ انتخاب کی طرف سے اُمیدوار ہوتے تو کبھی منتخب نہ ہوتے۔ مسٹر بونر لا کے بعد لارڈ کرزن کی بجائے مسٹر بالڈون کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ لارڈ کرزن کی قابلیت مسلمہ تھی مگر لوگ انہیں نہیں چاہتے تھے۔

"جمہوریت" کو فنونِ لطیفہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یورپ میں فنونِ لطیفہ نے جو ترقی پندرھویں اور سولھویں صدی کے بادشاہوں، پاپاؤں اور رئیسوں کی مربیانہ توجہ کے زیر اثر کی اس کا عشر عشیر بھی آج جمہوری ملکوں میں نہیں دیکھا جاتا۔ امریکہ کی مثال زبان زد ہے لیکن اور ریاستوں کی بھی یہی حالت ہے۔ سوائے فرانس کے دُنیا کے کسی اور ملک میں فنونِ لطیفہ کا کوئی محکمہ نہیں ہے اور فرانس میں بھی اس محکمے کا کام زیادہ تر پرانے شاہکاروں کی حفاظت کرنا ہے۔ مگر فنونِ لطیفہ کو بہت زیادہ اہمیت دینا غلطی ہے۔ کیونکہ اگر جمہوریت کو ان فنون سے لگاؤ نہیں تو سائنس سے یقیناً گہرا تعلق ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو سائنس خود حقائق کی جمہوریت کا نام ہے۔ سائنس کی کوئی حقیقت قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ جب تک اس کی تصدیق ان لوگوں کے مشاہدے سے جو مشاہدے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ نہ ہوسکے۔ سائنس کے لئے آزادیِ رائے اور آزادیِ عمل کی ضرورت ہے اور یہ بات بہترین طور پر جمہوری فضا میں میسر آسکتی ہے۔ آئن سٹائن کا خیال ہے کہ جن ملکوں میں آج کل مختارانِ مطلق یعنی ڈکٹیٹروں کی حکومت ہے۔ وہاں سائنس کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے میرے خیال میں یہ خطرہ سب سے زیادہ ان سائنسوں کو ہے جن کا موضوع انسان ہے۔

مثلاً اگر آج کوئی جرمن سائنسدان اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ کہے کہ یہودیوں کا دماغ جرمنوں سے اچھا ہے تو یقیناً جرمنی میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ سائنس اور جمہوریت کے باہمی تعلق پر بہت زیادہ زور دینا بھی درست نہیں کیونکہ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں نظریۂ ارتقا کی تعلیم پر جتنی پابندیاں عائد کی جا چکی ہیں اور کہیں نہیں کی گئیں۔

جمہوری طرزِ حکومت جس کی بنیاد تقسیم قوت پر ہو اور جس کا اصول نئے قانونوں کے بننے میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہو۔ حالتِ جنگ میں یا ایسے وقت میں جب قوم کسی نازک صورتِ حالات سے گزر رہی ہو۔ کبھی اپنے عام رنگ میں قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسے موقع پر سیاسی قوت کو پراگندہ کرنے کی بجائے ایک دو آدمیوں کے ہاتھوں میں جمع کر دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں تمام جمہوری ممالک کے وزرا مختارِ کل تھے۔ اور اکثر کوئی خاص فیصلہ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ سے پوچھنے کے پابند نہیں تھے۔ اس سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو جمہوری طرزِ حکومت ان ملکوں کے لئے جو تہذیب کی دوڑ میں پیچھے ہیں۔ بہت موزوں نہیں۔ ایسے وقتوں میں ملک کی سیاسی نبضت ایک آدھ مضبوط آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ مثلاً جنگِ عظیم کے بعد اگر ٹرکی میں خالص جمہوری نظام قائم ہو جاتا اور آبادی کے کسی طبقے پر کوئی پابندی نہ ہوتی تو یقیناً ٹرکی کی حالت وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔ اگرچہ بحوالہ خالدہ ادیب خانم کمال پاشا کا یہ قول کہ قوت تقسیم نہیں ہوسکتی۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جو کام اس نے کیا ہے وہ ایک جمہوری حکومت سے اتنے عرصے میں اس کامیابی کے ساتھ نہ ہوسکتا۔

آج کل دنیا کے مختلف ممالک میں مختارانِ مطلق کی حکومت ہے۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اٹلی۔ پولینڈ۔ ہنگری۔ ٹرکی۔ روس سب ان لوگوں کے زیرِ اثر ہیں۔ اور آج کل تو امریکہ کے صدر روزولٹ کا نام بھی اسی فہرست میں ہونا چاہئے۔ اس حکومت سے ان ممالک کو ایک حد تک ضرور فائدہ ہوا ہے۔ اور ان کی بین الاقوامی حیثیت بہتر ہوگئی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایسی حکومت کا فائدہ جبھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکومت عارضی ہو۔ اگر اسے دائمی طریقِ حکومت بنانے کی کوشش کی جائے تو نتائج اچھے نہیں ہوسکتے۔

اوّل تو مختارِ مطلق یا ڈکٹیٹر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جسے سب سے پہلے اپنی عظمت کی تمنا ہوتی ہے اور اس کے بعد کسی اور چیز کی۔

دوسرے مختارِ مطلق کی حکومت سے قوم کے افراد کی شخصیت محو ہو جاتی ہے اور وہ محض ایک مشین کے پرزے دکھائی دیتے ہیں جو انسانیت کی معراجِ کمال نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ مختارِ مطلق سے اختلافِ رائے رکھتے ہیں اُن کو اپنے ملک کے باہر پناہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ مثلاً روس جرمنی اور اٹلی کے حالات۔

چوتھے مختارِ مطلق کی حکومت کے بعد ملک میں وہ سیاسی توازن باقی نہیں رہتا جو کسی قوم کے ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لئے ضروری

ہے سپین کی مثال لیجئے۔ جنرل پرائمو ریویرا کے عہد کے بعد ملک اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور انقلاب برپا ہو گیا جس سے کوئی مستقل صورت حالات پیدا ہونے کی فی الحال توقع نہیں۔

جمہوری نظامِ حکومت پر شاید ایک اعتراض یہ بھی کیا جائے کہ اس کے انصرام میں ملک پر نسبتاً بہت زیادہ مصارف کا بار پڑتا ہے۔ مگر جب تک اس کے ثبوت میں کافی اعداد و شمار بہم نہ پہنچائے جائیں۔ اس مسئلے پر صحیح اور قطعی رائے قائم نہیں کرنی چاہئیے۔ کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ قدیم شاہی طرزِ حکومت میں ملک کو اُتنے ہی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا تھا جتنا آج کل کی جمہوری حکومتوں کو ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ جو اس قدیم نظامِ حکومت کا مرکز ہوتا تھا وہ اپنی کارکردگی کی اُجرت ضرورت سے بہت زیادہ وصول کرتا تھا۔

اس مضمون میں جمہوری نظامِ حکومت پر دونوں پہلوؤں سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اُمید ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ اس نظام کی خوبیاں اس کے نقائص کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

اختیارِ مطلق سیاسی ادارات کی نشو و نما کی ابتدائی منزلوں میں نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے لیکن اگر اقوامِ عالم کے تاریخی ارتقا پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ چند پسماندہ ملکوں کے علاوہ دُنیا بڑی حد تک اس منزل سے آگے نکل چکی ہے جس میں سیاسی نظم و نسق کے لئے کسی فردِ واحد کی رہنمائی کی ضرورت ہو۔ اگر انسان بحیثیت فرد کے کوئی آخری اور انتہائی قیمت رکھتا ہے تو باوجود اس کے کہ اس کی عقلی سطح چند خاص افراد سے پست ہو یہ ضروری ہے کہ اسے جماعت کا محض ایک رُکن ہونے کی وجہ سے جماعت کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں دخل حاصل ہو اگرچہ علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے آید

لیکن عرض یہ ہے کہ اوّل تو ان دو صد خروں کو اگر مسلسل طور پر تعلیم دی جائے تو ان کی ذہنی سطح کا "حماریت" کے درجہ سے بلند ہو جانا ایک حد تک ممکن ہے۔ اس کے علاوہ "پختہ کاروں" کے دل میں نفس پرستی کا جذبہ اگر غالب ہو جائے تو وہ سارے سیاسی نظام کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں رائے دہندوں کا تعلیم یافتہ اور صحیح الدماغ ہونا جمہوریت کی کامیابی کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اگر یہ شرط پوری کر دی جائے تو فردوسی کا یہ شعر بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ؎

شنیدم ز دانا کہ دانش بسے است
ولیکن پراگندہ با ہر کسے است

ممتاز حسن

گریۂ مسرت

آج تڑکے، الحفیظ والاماں
دوستو! عثمان[1] ساگر کا سماں

دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک
بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دُور تک

ظلمتیں تھیں نور سے گرمِ ستیز
ولولوں پر تھی ہوائے تُند و تیز

سامنے تھیں پتھروں کی حسرتیں
نرم و نازک جھاڑیوں کی شکل میں

جزر و مد میں تھی بفرطِ اضطراب
ساغرِ عثمان ساگر کی شراب

روحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں
لو سُنو! کس طرح تھیں موجیں رواں

جھاگ اُڑاتی، پھاندتی، اُڑتی ہوئی
کپکپاتی، لوٹتی، مُڑتی ہوئی

چُلبلی، اُبھری ہوئی، نکھری ہوئی
چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی

بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی
دمبدم آتی ہوئی جاتی ہوئی

اِس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی
پتھروں کو چھانٹتی دھوتی ہوئی

گِرتی پڑتی مست سر دُھنتی ہوئی
مرتعش قالین سا بُنتی ہوئی

[1] حیدرآباد کا روح پرور تالاب

زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی
اُٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی

گنگناتی صف بصف آتی ہوئی
لڑتی بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی

مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی
ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی

ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی
اینڈتی، اِٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی

دمبدم ہنستی ہوئی روتی ہوئی
ملتی، کتراتی جُدا ہوتی ہوئی

جا بجا دلدل میں کا جل پارتی
چوکڑی بھرتی چھلانگیں مارتی

پے بہ پے غاروں کے اندر گھومتی
ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی

بلبلاتی، بھاگتی، مُنہ موڑتی
مُڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی

گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی
دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

یہ سماں تھا اور اک رنگیں پرند
رُوحِ شاعر کی طرح بے قید و بند

بے خودی کے جام چھلکاتا ہُوا
گذرا میرے پاس سے گاتا ہُوا

نغمہ سُنکر اس قدر دل خوش ہُوا
ہچکیاں لے لے کے مَیں رونے لگا

(جوش ملیح آبادی)

خُدا کی دین

(۱)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور منظفر آباد کا شہر اس کی خوفناک تاریکی اور خموشی میں بے خبر سویا ہوا تھا تاریخ کی رو سے چاند کو چاہیے تھا کہ اپنی روشنی سے اس سوتی ہوئی دنیا کو منور کرتا لیکن وہ بادلوں کی یورش میں روپوش ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کی تیز اور خیرہ کن چمک اس تاریکی کا اور بادلوں کی کڑک اس خموشی کا سینہ چاک کرتی ہوئی فضا میں گم ہو جاتی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی لیکن اس طرح بند جیسے کسی غضب ناک وحشی کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو، جیسے طوفان نے کسی مجبوری سے اپنے سانس کو سینے میں روک لیا ہو کہ ذراسی چھیڑ ملی تو ابھی آفت برپا ہو جائے گی۔ رات کے دو بجے کا عمل ہو گا یعنی وہ وقت جب دُنیا دار اپنی تگ و دو سے، اپنی ناکام کوششوں سے تھک کر نیند کی آغوش میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور صبح خیز پجاری اور تہجد گزار عابد کی جبین نیاز تک بیدار نہیں ہوتی۔ جب سارا سنسار سوتا ہے اور صرف رات کا چوکیدار اور شب بیدار چور اپنے اپنے کام میں مشغول اس اندھیر نگری میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔

اس سماں کے عالم میں ایک شخص بہت ہوشیاری کے ساتھ درختوں اور دیواروں کی آڑ لیتا، کسی دھن میں لگا چلا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں اس کی صورت دیکھنا ممکن نہیں لیکن اگر روشنی بھی ہوتی تو اس کے چہرے کی زیارت نہ ہو سکتی کیونکہ ایک دفعہ بجلی کوندی تو صرف اتنا دکھائی دیا کہ اس نے اپنے سر پر ایک بڑی سی پگڑی لپیٹ رکھی ہے اور اس پر غالباً ایک ٹاٹ کی بوری اس طرح ڈال لی ہے کہ اس کا چہرہ بالکل چھپ گیا ہے۔ وہ دبے پاؤں مگر بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا اور بار بار پھیر کر ادھر اُدھر نظر ڈال لیتا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ پتہ بھی کھڑکتا تو وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا لیکن پھر اطمینان کر کے تیزی کے ساتھ آگے روانہ ہو جاتا۔ اس طرح کئی گلیوں اور بازاروں میں سے ہوتا ہوا، شہر کے زیادہ آباد حصے میں سے گزر کر وہ ایک ایسے حصے میں پہنچا جہاں کشادہ اور فراخ باغوں میں خوشنما اور عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں جن میں سے چند دو منزلہ تھیں اور باقی تین یا چار منزلوں کی۔ اس نے بہت احتیاط سے مکانوں کا جائزہ لیا اور ایک سہ منزلہ مکان کو پہچان کر اس کے احاطے میں داخل ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کی پشت پر جا پہنچا اور بلی کی سی چستی اور مستعدی سے اینٹوں کی نوکوں پر پاؤں کی انگلیاں جماتا ہوا اوپر چڑھ گیا اور چھت پر پہنچتے ہی منڈیر کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تاکہ رات کے اُلو تک کی نظر سے محفوظ رہے۔ اس کا دل دھڑک رہا

تھا، خوف سے زیادہ اس محنت کی وجہ سے جو اس نے سانس روک کر چھت پر چڑھنے میں کی تھی جس طرح گھوڑا کان کھڑے کر کے
آوازوں کو سنتا ہے اسی طرح کان لگا کر اس نے اپنے گرد و پیش کی خاموشی کو سُنا اور اس میں اسے بہت سی وہ آوازیں سنائی دیں جو
رات کے وقت فطرت کے عضو عضو سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ان میں ایسی ہم آہنگی اور تسلسل پیدا ہوتا ہے کہ وہ خموشی کو نہیں توڑتیں۔
لیکن ان میں بظاہر کوئی اندیشہ پیدا کرنے والی آواز نہ تھی لہذا مطمئن ہو کر وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ مکان
کی دوسری منزل پر تھا جہاں ہر طرف تاریکی اور خاموشی طاری تھی۔ وہ آگے کی طرف بڑھا کہ اسے اس ہنگامہ بھرے سکوت میں ایک ایسی
دھیمی آواز سنائی دی جو دوسری تمام آوازوں سے مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کے گانے کی آواز ہو جو دور سے بند دروازہ
میں سے آرہی تھی، ایسی ہلکی، ایسی نرم جیسے چاندی کی کٹوریوں میں پانی کی باریک پھوار پڑ رہی ہو۔ کبھی کبھی آواز بند ہو جاتی اور اس
کے بجائے آواز سے بھی زیادہ دھیمی گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔

دو تین روز کا فاقہ زدہ چور جو جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چوری کرنے آیا ہو اسے کیا کرنا چاہئے تھا، عقل اور مصلحت اور منطق کا تقاضا
تو یہی تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا لیکن اچھے سمجھدار آدمی بھی منطق کے اصول پر کام نہیں کرتے اور یہ بیچارہ جمّن تو ایک دنیا کا
دھتکارا ہوا، جاہل، نیم وحشی شخص تھا۔ اسے یہ کرید پیدا ہوئی کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ اس نے دبے پاؤں چھت کا چکر لگایا
معلوم ہوا اس سے اوپر کی منزل پر کسی کمرے میں سے ایسی آواز آرہی ہے جیسے ناچ اور گانا ہو رہا ہو۔ بہت آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر
چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچا۔ وہاں صرف دو بڑے بڑے کمرے تھے جن میں سے ایک خالی اور تاریک تھا اور دوسرا بجلی کے قمقموں سے
بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں اسے یہ اندیشہ ہوا کہ شاید کسی کی نظر پڑ جائے۔ اس لئے اس نے پھر ہمت کی اور خالی کمرے کی چھت پر
چڑھا اور روشن دان میں سے جھانک کر اس کمرے کے اندر نظر ڈالی جہاں محفلِ رقص و سرود گرم تھی۔ نظر ڈالی اور یہ سماں دیکھا۔

(۲)

ایک خوبصورت، فراخ کمرے میں نہایت صاف سفید فرش اور اس پر جا بجا، مناسب فاصلہ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور
خوش رنگ قالین بچھے تھے۔ دروازوں پر سفید، کامدار پردے پڑے تھے اور کھڑکیوں پر ایک سفید جالی۔ مشرقی وضع کے فانوسوں میں نہایت
کاریگری کے ساتھ بجلی کے قمقمے لگے تھے جن کی روشنی موٹے اور منقش شیشوں میں سے گزر کر کمرے کو اس طرح روشن کئے ہوئے تھی کہ
آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ کارچوبی گاؤتکیوں کے سہارے پندرہ بیس آدمی قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے سامنے چھوٹی چھوٹی
نقشین میزیں لگی ہوئی تھیں جن پر چاندی کی طشتریوں اور گلاسوں میں کھانے پینے کی مختلف چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چاندی کے
خوبصورت پیک دان رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ کمرے کی دیواروں کے برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے اور بیچ کی جگہ خالی تھی جہاں...

... ایک فتنۂ دوراں، ایک رہزنِ عقل و ایماں سفید، ملائم ساری میں ملبوس، اپنے سیاہ بالوں میں موتیوں کا ایک ہار لپیٹے ہوئے

قامت میں دلِ فریبیٔ سروِ چمن نژاد سروِ چمن میں دولتِ بستاں لئے ہوئے

ناچ رہی تھی۔ اس کے قدموں کی ہر ٹھوکر پر حاضرین کے دل پامال تھے اور ان کی حرکت بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے رقص کی ہر ادا میں لوچ تھا، موسیقی تھی، جادو تھا جس کا اندازہ ان لوگوں کے چہروں سے ہوتا تھا جو آنکھیں کھولے اس کو اس طرح بے اختیار دیکھ رہے تھے گویا جسم کی تمام قوت سمٹ کر آنکھوں میں آگئی ہو۔ ایک صاحب اپنی سیاہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور اس کے قدم کی ہر جھنکار پر اپنے سر کو اس زور سے جنبش دیتے تھے جیسے کسی چھپے ہوئے ہاتھ نے اس کو زور سے جھٹکا دیا ہو۔ ایک صاحبزادے نے داد دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کو بڑھایا تھا لیکن عالمِ بے خودی میں ہاتھ اسی طرح رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رقاصہ کے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہے۔ ایک تیسرے صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے ایک طرح کا ساکن رقص کر رہے تھے یعنی ان کی حرکات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جسم اٹھ کر رقص کرنا چاہتا ہے لیکن اس بدہوشی کے عالم میں بھی آدابِ محفل کا احساس مانع ہے۔ ہر شخص پر ایک علیحدہ کیفیت طاری تھی اور وہ حسن متحرک اپنے اثر سے بے خبر اپنے رقص میں کھوئی ہوئی ناچ رہی تھی ناچے جا رہی تھی۔ . . .

جمن نے یہ الف لیلہ کا سا سماں دیکھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک آوارہ، بے خانماں، ہوسناک، کارِ اندہ ہوا اچور ہے جس کو کئی روز سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا جس نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے خطرے کا یہ کھیل کھیلا ہے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی عیش و عشرت کا یہ سامان، یہ دولتِ فراواں نہ دیکھی تھی، نہ ایسا بے پناہ حسن جس نے اپنی انتہائی سادگی اور بےخودی کی کیفیت میں اس کے مجرم اور بے حس دل کو بھی اسی طرح تہ و بالا کر دیا تھا جس طرح ان عیش نصیب لوگوں کو جو کمرے میں آرام سے بیٹھے اس نظارۂ جمال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی مبہوت اور بے تاب نظریں کبھی چاندی کی خوشنما طشتریوں پر پڑتیں جن میں قسم قسم کی مٹھائیاں اور پھل اس کی بھوک کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ کبھی اس ایوانِ دولت کے ساز و سامان کا جائزہ لیتیں جس کی قیمت کا اندازہ اس کے محدود اور ناکارہ تخیل کی حدود سے باہر تھا۔ اور پھر پلٹ پلٹ کر رہ رہ کر اس کی بھوکی اور بے تاب نظریں اس حسینہ کے چہرے پر گڑ جاتیں جو اپنے دونوں مرمریں بازوؤں کو سر سے بلند کئے، جسم کو لچاتی ہوئی ناچ رہی تھی، ناچے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں اس کا ناچ ختم ہو گیا اور وہ سروِ رقصاں ایک صاحب کے پاس جا بیٹھی جو کمرے کے صدر مقام پر بیٹھے ہوئے تھے اور جن کی ہیئتِ ظاہری سے معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ خود میزبان ہیں یا جلسے کے سب سے معزز مہمان۔ حاضرین نے بے اختیار ہو کر اس کے کمالِ فن کی داد دینا شروع کی۔

"ستارہ بائی آپ نے تو غضب ہی کر دیا۔ عمر میں خدا جھوٹ نہ بلائے سینکڑوں مرتبہ جلسوں میں شریک ہوا۔ کئی دفعہ آپ کا ناچ بھی دیکھا لیکن آج آپ نے جو کمال دکھایا ہے وہ تو خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔"

(ایک اور صاحب) "جی ہاں سیٹھ صاحب" (رقاصہ کے ہم نشین کی طرف اشارہ کر کے) "یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے

جلسے میں ان کا رقص اس قدر شباب پر ہے"۔

(ایک تیسرے صاحب جو ظاہری وضع قطع سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور بھاری بھرکم آواز میں بولتے تھے) "خدا کی شان کا مظہر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے اور آپ کی ہر حرکت میں شانِ جمال کا اظہار ہوتا ہے"۔

(ایک چوتھے صاحب جن کے بالوں کی پریشانی اور صورت کی خود ساختہ وحشت سے یہ خواہش ظاہر ہوتی تھی کہ انہیں شاعر سمجھا جائے) "جناب میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ کے حسین رقص میں نسیم صبح کی سبک خرامی ہے، دریا کی موجوں کا اُتار چڑھاؤ ہے، آہوئے صحرا کی بے تابی ہے، سرو کی..... (ایک پانچویں صاحب جو شاعر کی تشبیہوں کی خوبصورتی سے زیادہ ان کے سلسلہ درازی سے متوحش معلوم ہوتے تھے) "قطع کلام معاف! سیٹھ صاحب ان سے درخواست کیجئے کہ ایک غزل اور سُنا دیں تاکہ جنتِ نگاہ کے ساتھ ساتھ فردوسِ گوش کا لطف بھی نصیب میں آ جائے"۔

سیٹھ صاحب نے جھک کر مغنیہ کے کان میں کچھ فرمائش کی جس نے ذرا سی دیر تک اپنے گلے کے نازک تاروں کو چھیڑا جیسے کوئی ستار کے خوابیدہ نغموں کو جگا تا ہو اور یہ غزل شروع کی:۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ——— جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

غالب کے جوش سے بھرے ہوئے مترنم الفاظ اور اس کا نرم کی دبھری آواز نے مل کر ایسا سماں باندھا کہ کمرے میں بالکل سناٹا ہو گیا۔ وہ گا رہی تھی اور سننے والوں کے تخیل کے سامنے مبہم دلکش نئے دلکش تصویریں آتی جاتی تھیں۔ اس کی آواز کا زور اور گداز بڑھتا جا رہا تھا جیسے بجائے فرمائشی غزل گانے کے وہ کوئی آپ بیتی بیان کر رہی ہو..... اور رحمٰن ہمہ تن گوش آواز کے اس دھارے پر بہا جا رہا تھا۔ اپنے سے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔ الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے لیکن موسیقی اور شاعری کا اثر الفاظ کا محتاج نہیں۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی، لوچ میں ڈوبی ہوئی احساس سے بھرائی ہوئی

(۳)

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ——— پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

غزل کو سنتے سنتے دفعتہً رحمٰن کے شعور کی گہرائیوں میں کوئی چیز عجیب اور بے جوڑ سی محسوس ہوئی، بدن میں ایک خفیف سی تھرتھری جس کا مطلب وہ نہ سمجھ سکا۔ ابھی وہ اپنی توجہ کو رقص اور نغمے کی اس دنیا سے ہٹانے نہیں پایا تھا کہ بارش کی چند بوندیں اس کے جسم پر پڑیں اور قبل اس کے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلے موسلا دھار مینہ برسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جو بادلوں کی گونج سے بالکل اور اس سے بالکل مختلف تھی، ایک غصے سے بھری ہوئی آواز جو زمین کے پیٹ سے نکلتی معلوم ہوتی ہو، جیسے کوئی خوفناک قوت جو صدیوں سے قید ہو مادرِ گیتی کا سینہ چاک کر کے باہر آنا چاہتی ہو اس کے پاؤں کے نیچے کی چھت ہلنے

لگی۔ جس دیوار سے سہارا لگائے وہ بیٹھا تھا ہلنے لگی۔ زمین اور آسمان میں تو لزل پڑ گیا۔ کمرے سے دہشت ناک چیخوں کی آوازیں سنائی دیں "ارے بھاگو، زلزلہ ہے زلزلہ، الٰہی خیر، پرمیشور بچائیو" اور چشم زدن میں زلزلے نے سارے شہر کو آ لیا۔ زمین کے بطن میں جو خوفناک عفریتی قوتیں پنہاں ہیں انہیں کس طرح آزادی مل گئی کہ رات کی تاریکی میں دنیا کو غافل پا کر انسانوں کے آرام پر، ان کی چین کی نیند پر چھاپا ماریں اور چند لمحوں میں دیکھتے دیکھتے ان تمام تعمیروں اور مصنوعات کو تباہ و برباد کر دیں جو پرخود غلط انسان نے صدیوں کی کوشش سے تیار کی تھیں اس امید میں کہ انہیں استقلال نصیب ہو گا! سارا شہر جو شہر خموشاں کی طرح سو رہا تھا اس طرح جاگ اٹھا جیسے کسی نے روزِ حشر صور پھونک دیا ہو، بدحواس، نیم بیدار، بے بس۔ عمارتوں کے گرنے کا شور اور بچوں، بڑوں، مردوں، عورتوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ ان کے واویلا میں ایک جنون کی سی کیفیت تھی۔ وہ چوہوں کی طرح ایک ایسے پنجرے میں گرفتار تھے جس سے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ زمین، وہ در و دیوار جن کو وہ بالکل مستقل اور پائدار سمجھتے تھے کیوں مٹی کے گھروندوں کی طرح ان کی نظروں کے سامنے ڈھیر ہوئے جاتے ہیں۔ محسن کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا تمام جسم اور حواس بالکل سن ہو گئے ہوں۔ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا تھا نہ منہ سے آواز نکال سکتا تھا۔ البتہ اس کی قوتِ سامعہ ابھی کام کر رہی تھی اور اس کے دل و دماغ کو بے بسی اور خوف کی چیخوں سے پاش پاش کر رہی تھی۔ اس کی نظر بھی ابھی بیکار نہ ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر روشن دان میں سے اس کمرے پر نظر ڈالی جہاں ابھی چند لمحے پیشتر عیش و عشرت اور رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ چند لمحے پیشتر؛ نہ معلوم اس محفل کو برہم ہوئے چند سیکنڈ گذرے تھے یا چند صدیاں، کیونکہ اس قیامت کی گھڑی میں وقت کا معمولی تصور جو دنوں اور گھنٹوں کے ساتھ وابستہ ہے بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے یہ ضرور دیکھا کہ ان چند لمحوں یا صدیوں میں ان خوش پوش، خوش گفتار، وضعدار لوگوں کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ مدتوں کی تعلیم و تربیت نے حیوانی جبلتوں پر جو سطحی جلا کر دی تھی وہ آناً فاناً زائل ہو گئی تھی اور اس کے نیچے کی اصلی صورت اور رنگ روپ نکل آیا تھا۔ اطمینان سے سوئے ہوئے حیوان اور درندے پریشان ہو گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اپنے ان عزیز دوستوں اور ساتھیوں کو روندتا ہوا، اگر ممکن ہو تو ان کی لاشوں کا پل بنا کر کسی طرح اس خطرے کے مقام سے نکل کر کسی جائے امن میں پہنچ جائے۔ اور ستارہ بائی، وہ رقص اور موسیقی کی جان، وہ حسن کی دیوی کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی، حواس باختہ، آنکھیں پھٹی ہوئی۔ جو لوگ ذرا دیر پہلے اس کے کمالِ فن اور اس کی رعنائیوں پر دل قربان کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے وہ اس وقت اس کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور وہ بھی خود کو فراموش کر چکی تھی۔ اس ان بوجھے خوف نے اس کے سیماب آسا جسم کو بالکل معطل اور بے حس کر دیا تھا۔ محسن نے دیکھا کہ اس کے سر کے اوپر بجلی کا فانوس بہت زور سے حرکت کر رہا ہے اور قریب ہے کہ چھت سے ٹوٹ کر اس کے اوپر گر پڑے۔ اس نے بے اختیار ہو کر ایک چیخ ماری جس نے ستارہ کو ذرا ہوشیار کر دیا اور وہ دروازہ کی طرف

جھپٹی۔ اتنے میں بجلی زور سے کڑکی اور کمرے کی تمام روشنیاں غائب ہوگئیں اور جمن کے سر پر کوئی چیز بہت زور سے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر نہ معلوم کہاں جا گرا۔

(۴)

اگلے روز جب آفتاب اس شہر پر طلوع ہوا تو اس نے بار بار اپنی آنکھیں مل کر نیچے کی طرف دیکھا مگر جو کچھ اسے نظر آیا اس کا یقین نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ کہیں میں ابھی تک نیند میں تو نہیں ہوں، کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن کہاں تک اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دیتا۔ حواس کا مشاہدہ خواہش پر غالب آیا اور اسے چار و ناچار یہ ماننا پڑا کہ رات کے چند گھنٹوں میں جب وہ دور دراز مغرب کی کسی گھاٹی میں بے خبر سویا ہوا تھا کسی زبردست ہلاکت آفریں قوت نے سرسبز میدانوں، لہلہاتے کھیتوں اور متبسم باغات کو تباہ کر دیا ہے، سربفلک عمارتوں کو خاک میں ملا دیا ہے، اور اس کے بہت سے جانے بوجھے نشانات کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا ہے۔ اگر وہ اپنی آنکھ سے اس دہشت ناک منظر کو دیکھتا جب فطرت کی تمام مجنوں قوتیں بے بضاعت انسان کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی تھیں تو اس کا دل خون ہو جاتا۔ زلزلے کی شدت نے عمارتوں کو اس طرح جھنجھوڑا تھا کہ وہی گھر جنہیں لوگ امن اور عافیت کا ملجا سمجھتے تھے ان کی خون آشام قبریں بن گئے تھے اور انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی دولت، ان کے کاروبار، ان کے ادبی اور علمی کارنامے بھی مدفون ہو گئے تھے۔ عمارتوں کے گرنے سے جابجا بجلی کے تاروں میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک طرف تو بارش کا طوفان عمارتیں گرا رہا تھا اور دوسری طرف اندر ہی اندر آگ سلگ رہی تھی جس نے گھروں کے ساز و سامان بلکہ ان کے مکینوں کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ زمین سے جابجا گرم پانی کے کھولتے ہوئے چشمے نکل پڑے تھے۔ دریا کی جگہ ریت اور کھیتوں کی جگہ دریا نے لے لی تھی۔ آسمان تو بیشک اپنی جگہ قائم تھا لیکن زمین کی تمام کائنات تہ و بالا ہو گئی تھی۔ . . . . سورج نے بدحواس ہو کر اس منظر کو دیکھا اور دل کا اضطراب کم کرنے کے لئے بادل کے ایک ٹکڑے کے پیچھے جا چھپا۔

اس وقت تک دن کافی چڑھ چکا تھا۔ جمن کو ہوش آیا مگر نہ حواس کام کرتے تھے نہ حافظہ کام کرتا تھا۔ وہ ایک کھنڈر میں پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں زخمی تھے۔ سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور خون بالوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ بدن بالکل سُن تھا اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہ کسی قدیم اور تباہ شدہ تہذیب کے کھنڈروں میں پہنچ گیا ہو جہاں کوئی جاندار نظر نہ آتا تھا۔ زمین و آسمان تک پہچانے نہ جاتے تھے۔ وہ بہت کوشش کر کے اٹھا اور پھر ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے ہائے کر کے بیٹھ گیا۔ پھر بہت ہمت کر کے کھڑا ہوا اور لنگڑاتا ہوا چلا۔ آنکھیں پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہر طرف اینٹ، چونے، مٹی کے ڈھیر تھے، جن میں جابجا ٹوٹا ہوا فرنیچر اور سامان دبا ہوا نظر پڑتا تھا۔ ایک کمرے کی دو دیواریں کھڑی تھیں اور باقی دو دیواریں اور چھت شق ہو گئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں ایک لوہے کی صندوقچی پڑی تھی جس کا ڈھکنا کسی سخت ضرب کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ پیشے کے رجحان نے زور کیا اور

اس نے صندوقچی کو اُٹھا کر دیکھا تو اس میں بیش قیمت زیورات اور اشرفیاں نظر پڑیں۔ مُنہ میں پانی بھر آیا اور فوراً صندوقچی کو بغل میں مار کر وہاں سے بھاگنے کا قصد کیا لیکن معاً خیال آیا کہ نہ معلوم اس کھنڈر میں اور کیا کیا خزانے مدفون ہوں۔ انہیں تلاش کرنا چاہئے لہٰذا اسی طرح لنگڑاتا ہوا آگے کو روانہ ہوا اور مالِ غنیمت کی تلاش میں اس وسیع کھنڈر کے کونے کونے کو دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ طرح طرح کی قیمتی چیزیں پڑی ہوئی تھیں بعض ٹوٹی پھوٹی، بعض سلامت۔ ایسی چیزیں جن کو اس نے آج تک کبھی ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ اپنے خیال میں ان تمام چیزوں کو جمع کرتا چلا جا رہا تھا کہ دفعتہً ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دروازے کی چوکھٹ پر کسی عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک شہتیر جس کا ایک سرا دیوار میں اٹکا ہوا تھا اس کے اوپر سپر بن گیا تھا اور اس کی وجہ سے بہت کچھ اینٹ اور پتھر کا ملبا اس کے اوپر نہیں گرا تھا۔ وہ اس ذرا سی صاف جگہ میں چاروں طرف کی تباہی سے بے خبر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک گہرا زخم لگا تھا جس نے اسے پیشانی سے ٹھوڑی تک فگار کر دیا تھا۔ وہ ایک سفید گرد آلود ساری میں ملفوف دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے پڑی تھی۔ اس نے غور سے اس کو دیکھا بہت غور سے۔ اس کے حافظے میں ایک کھٹک پیدا ہوئی۔ یہ سفید ملائم ساری، یہ خوبصورت کتابی چہرہ، یہ سیاہ لانبے بالوں میں لپٹا ہوا موتیوں کا ہار جو اس وقت گرد و خون میں اٹکا ہوا تھا، اس نے یہ سب چیزیں کب اور کہاں دیکھی تھیں؟ . . . . . کسی خوشگوار خواب کا سا دھندلا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ خوبصورت اور متناسب اعضا جو اب بے جان تھے اس نے کہیں متحرک دیکھے تھے۔ یہ موتیوں کا ہار روشنی میں چمکتا دیکھا تھا۔ کہاں؟ دفعتہً اس کے حافظے کے سامنے ایک بجلی سی چمک گئی اور رات کا تمام واقعہ یاد آ گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں رات گلستانِ رنگ و بو کی یہ تیتری رقص کر رہی تھی جس کے ہر ہر قدم پر حاضرین کے دل پامال تھے، اور اس کے بعد زلزلہ اور بارش کا طوفان اور روشنی کے فانوسوں کا خطرناک طریقے سے اس کے سر پر جھولنا اور خود اس کا چوٹ کھا کر بے ہوش ہونا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کہاں ہے، اس پر کیا گذری ہے اور اس کے چاروں طرف جو کھنڈر ہیں وہ اس بارونق شہر کی یادگار ہیں جو چند گھنٹے پہلے اطمینان کی نیند سو رہا تھا . . . . . وہ آگے بڑھا اور اس کے جسم کو چھوا۔ اس میں ابھی تک گرمی تھی سینے پر ہاتھ رکھا، اس میں خفیف سی حرکت تھی، اس کے بے جان جسم میں زندگی کے یہ آثار پا کر اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی مُردے میں جان پڑ گئی ہو، کوئی معجزہ وقوع میں آیا ہو۔ اس نے پھر ایک امید افزا نظر اس پر ڈالی۔ اس بے ہوشی کے عالم میں بھی اس کے چہرے پر سکون کی ایک شان تھی وہ خون بہنے کی وجہ سے سفید پڑ گیا تھا اور سیاہ بالوں کے حلقے میں اور صبح کی دھندلی روشنی میں اور زیادہ سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس پر ایک بچوں کی سی سادگی اور بے بسی اور اعتبار کی کیفیت تھی جس نے جمن کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگا دیا۔ اس کے دل میں جس کو زمانے کی ٹھوکروں اور بدسلوکیوں نے پتھر کا بنا دیا تھا رحم اور ہمدردی کے سوتے جوش میں آئے۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک بدنصیب اور آوارہ شخص ہے جس کو سوسائٹی کی بے رحمی اور بے اعتنائی نے

چور بنا کر قانون کی حد سے باہر نکال دیا ہے۔ رات اس تمام عیش و عشرت کے سامان دیکھ کر اس کے دل میں حسد اور نفرت کی جو آگ بھڑکی تھی وہ بجھ گئی اور اس کا دھواں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے نکل گیا۔ زیوروں کی صندوقچی، برتن، کپڑوں کے بکس، تمام چیزیں جو اس نے وہاں سے جمع کر کے لے جانے کا ارادہ کیا تھا اس کی یاد اور نظر سے گر گئیں سامنے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ وہ ایک انسان ہے اور یہ ایک بے بس اور مجروح عورت جو اس کی ہمدردی اور تیمارداری کی محتاج ہے......

جب کچھ دیر کے بعد سورج کا اختلاج قلب کم ہوا اور اس نے بادلوں کی نقاب میں سے اپنا منہ نکالا تو یہ تماشا دیکھا کہ شہر کے باہر ایک زخمی آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے اور اپنی کمر پر ایک عورت کو اٹھائے ہوئے ہے جس کی پیشانی پر ایک میلی پٹی بندھی ہے اور سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی فلاکت زدہ جھونپڑی میں داخل ہوا مگر اس کے چہرے پر ایک ایسا مطمئن اور پاک تبسم تھا کہ سورج بھی اپنی پریشانیوں کو بھول کر مسکرانے لگا اور اس کی روشنی کی لہر اس تمام خرابے میں اُمید کی کرن بن کر پھیل گئی۔

(۵)

اگلے روز صبح کلکتہ کے ایک اخبار میں کسی مقامی خبر نویس کی مندرجہ ذیل رپورٹ چھپی جو اس مستعد صحافی نے ایک دن پہلے ہی اخبار کو بھیج دی تھی:-

"شب گذشتہ سیٹھ لچھمن داس کی عالیشان کوٹھی شانتی نواس میں ایک محفل رقص منعقد ہوئی جس میں شہر کے تمام با مذاق ماہرین فن اور رؤسا جمع تھے۔ تمام کوٹھی اس قدر نفاست اور خوبصورتی سے سجائی گئی تھی کہ الفاظ اس کی تصویر کھینچنے سے عاجز ہیں۔ اس موقع کے لئے سیٹھ صاحب نے کلکتہ کی مشہور و معروف مغنیہ مس ستارہ بائی کو باصرار مدعو کیا تھا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ وہ کلکتہ سے باہر کہیں تشریف لائی ہوں۔ محفل رات کے تین بجے تک گرم رہی اور مس ستارہ بائی نے اپنے ملائک فریب حسن، اپنے کمال رقص اور اپنے اعجاز سرود سے حاضرین کو بالکل بے خود بنا دیا۔ ان تمام معزز حضرات کی متفقہ رائے یہ تھی کہ وہ پہلے کبھی ایسی بامذاق اور پُر لطف صحبت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ خدا سیٹھ صاحب کو عرصہ دراز تک سلامت رکھے کہ ان کی ذات ہمارے شہر کی رونق ہے۔"

خواجہ غلام السیدین

واہ رے مَیں!

(۱)

کہتے ہیں آثارِ محبت مجھ کو محبت راس نہیں — جس سے محبت کرتا ہوں مَیں آہ وہی حسّاس نہیں

جانتا ہوں مَیں آگے ہی سے اُس کو کسی کا پاس نہیں

مانتا ہوں میں مہر و وفا کی اُس گل میں بُو باس نہیں — واہ رے میں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۲)

سلسلۂ سعیِ بے حاصل آہ نہ اب تک ٹوٹ سکا — خواب میں بھی دامانِ خیالِ دوست نہ مجھ سے چھوٹ سکا

لُوٹ لیا ایک آن میں اس نے جتنا مجھ کو لوٹ سکا

غیر کے ہاتھوں لُٹ جانے کا کس دل میں وسواس نہیں — واہ رے میں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۳)

آہ ہجومِ یاس نے میرے دِل پر دھاوے کب نہ کئے — سینکڑوں چکر ناکامی نے اس کی راہ میں کب نہ دیئے

جمع کئے سامان نہ کیا کیا اُس کی جفا نے میرے لئے

اس کی نگاہِ فتنہ اثر سے صلح کی بالکل آس نہیں — واہ رے مَیں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۴)

جذب مرے دِل میں ہے کتنا راز یہ اُس پر فاش نہ ہو — مہرِ محبت وقت پہ چمکے بے موقع ضو پاش نہ ہو

آئے وہ خود، آنے کا سبب معلوم اُسے اے کاش نہ ہو

آہ محبت! تجھ کو اس دُنیا کی ہوا ہی راس نہیں — واہ رے میں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

علی منظور حیدرآبادی

سوامی رام تیرتھ[1] کا پیام

اور

اُردو ادب

جس طرح چراغ کی روشنی، شعلے کی گرمی، پھول کی خوشبو اور نغمہ کی لہر پھیل کے اپنے گرد و نواح کو اپنی خصوصیت اور کیفیت سے معمور کر لیتی ہے اسی طرح خدا کے وہ بندے جو اپنی زندگی کو ہم آہنگِ فطرت کر دیتے ہیں اپنے دل کی کیفیت اور روح کی وسعت کو اپنے وجود کے ذریعے آس پاس پھیلاتے ہیں اور اس حالت میں ایک غیر معمولی خصوصیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی تخصیص کو عوام النّاس معجزہ یا کرامت کہا کرتے ہیں۔

---

[1] سوامی رام تیرتھ (پیدائش سمبت ۱۹۳۰ بکرمی وفات سمبت ۱۹۶۳ بکرمی) آپ نے قصبہ مرالی والا ضلع گجرات صوبہ پنجاب میں ایک غریب برہمن کے یہاں جنم لیا۔ آپ کا نسبی سلسلہ بابا تلسی داس جی سے ملتا ہے۔ مرالی والا پرائمری اسکول سے سلسلہ تعلیم شروع کیا۔ انٹرنس گوجرانوالہ اسکول سے پاس کیا اس کے بعد لاہور مشن کالج میں آ کر ۲۲ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیالکوٹ مشن اسکول میں کچھ عرصہ تک ملازم رہے اور وہاں سے لاہور مشن کالج میں پروفیسر ہو کر آئے۔ بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر ہو گئے۔ آپ کو علم ریاضی سے خاص شغف تھا تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں آپ تارک الدنیا ہو گئے اور ہمالیہ پہاڑوں میں صرم سادھو کے ساتھ چلے گئے۔ گڑھوال کی پہاڑیوں میں آپ نے ٹہری کو پسند کیا۔ اس طرح آخر وقت تک آپ یو۔پی ہی میں رہے۔ ۷ ۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو آپ دریائے گنگا میں اشنان کرتے ہوئے غرق دریا ہو کے معرفت ہو گئے۔ مصرعۂ تاریخِ وفات یہ ہے :۔

"واہ واہ رام تیرتھ رام میں جا رم گئے"

علامہ اقبال نے آپ کی وفات سے متعلق ایک پُر معنی نظم لکھی ہے جو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ یہ اشعار قابلِ غور ہیں :۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تُو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تُو

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے

کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

سوامی رام تیرتھ نے دنیا کے تمام مہذب ممالک کا سفر کیا۔ اہلِ امریکہ آپ کے خاص طور پر مداح تھے۔ اہلِ جاپان آپ کی عزت کرتے تھے اور اہلِ مصر کو آپ سے محبت تھی۔

انسان کا دل اور اس پر روح کی قوت کا اثر ایک ایسی غیر فانی شکتی ہے جو جاندار تو کیا بے جان اشیاء کو بھی اپنی کہربائی کیفیت سے اپنی طرف کھینچ لے۔ کوئی تعجب نہیں اگر آرفیس اپنی بانسری سے بہتے پانی کو محو کر دیتا ہو یا تان سین کی سرمی ملہار سے موسلادھار پانی برسنے لگتا ہو۔ اب بھی ایک نہایت عام مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شریف خصلت بھلا مانس کسی عام صحبت میں آجائے تو آناً فاناً اس صحبت کا رنگ بدل جاتا ہے اور ایک دم اہلِ محفل اس کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں جس کی وجہ اس کے کیرکٹر کی کہربائی قوت ہے جو اہلِ محفل کی پست اور رکیک بے تکلفی کو اپنی شکتی سے دبا دیتی ہے اور ہر شخص کا دل اس ایک کی طرف کھنچ کر ایک حد تک اس سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ دنیا میں پیغمبر، پیشوا، اولی، ریفارمر، فاتح اور بعض دنیا لیڈر کہلاتے ہیں۔ غرض کسی شخص میں کوئی ایک ایسی تخصیص نمایاں طور پر عیاں ہو جانے جو ایک حد تک اپنا اثر دوست و دشمن ہر ایک پر ڈال سکے وہی اس فردِ انسانیت کا جزوِ اعلیٰ ہے بشرطیکہ وہ تخصیص شرفِ انسانیت سے بخوبی ہم آہنگ ہو۔

اس تخصیص کو عام کرنے کا ذریعہ کہیں صنعت ہے کہیں کیفیت، کہیں رنگ کہیں آہنگ، کہیں نقش کہیں نغمہ۔ ادب و انشا میں اسے نظم و نثر کی نوعیت کہنا چاہئے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ادیب یا انشا پرداز بلا شرکتِ غیرے کبھی ایجاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ متقدمین و متاخرین کا کچھ نہ کچھ اثر اس کے خیالات پر ضرور پڑتا ہے۔ ہاں تھوڑی بہت تجدید ضرور ہوتی ہے اور وہی اس تخصیص کی بنیاد ہے۔

بنی نوعِ انسان میں کون ایسا ہوگا جس کی زندگی میں چند ایسے لمحے بھی نہ ہوتے ہوں جو اس کی روح کو دامِ خیال کی پیچیدگیوں اور مایا کے جال سے بالکل آزاد کر کے سدرۃ روح کے سامنے نہ لا کھڑا کرتے ہوں۔ چنانچہ وہ لمحے ایسے ہیں جب کہ آتما پرم آتما کے روبرو ہوتی ہے اور جب ذرہ آفتاب کے عکس سے چمک اٹھتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ خیالات سرمدی نور سے معمور ہو کر تمام عالم کو اپنی پاکیزگی سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی کوشش اس برگزیدہ فرد کا پیام کہلاتی ہے۔ خدا کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس پیام کو لبیک کہتے ہیں اور خدا کے ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ ضروری نہیں کہ تمام دنیا اس پر کاربند ہو۔

ہندوستان میں بالخصوص طبقۂ ہنود میں کوئی شخص اس پایہ کا آج تک نہیں ہوا جس نے اردو زبان کے ذریعے سے اپنے اس پیام کو اس خلوصِ نیت کے ساتھ عام کیا ہو جس طرح کہ غریق دریائے حقیقت و معرفت سوامی رام تیرتھ نے کیا۔ شیخ و برہمن میں بہتیرے ایسے ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی کو بنی نوعِ انسان کی روحانی خدمت میں وقف کر دیا مگر سوامی رام تیرتھ کا نام ان سب میں پیش پیش نظر آتا ہے۔

چونکہ یہاں ہم سوامی رام تیرتھ مرحوم کی تاریخِ حیات نہیں لکھنا چاہتے اس لئے ان کے زمانۂ تعلیم، ملازمت کے حالات، ممالکِ غیر کے سفر کے واقعات اور ایک تارک الدنیا سنیاسی کی حیثیت سے پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے کے حالات کی بابت کوئی بحث نہ کریں گے[1] البتہ یہ لکھنا ضروری ہے کہ سوامی رام ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت سے تعلیم حاصل کر کے ایم اے تک پڑھ گئے، ریاضی آپ کا خاص مضمون تھا۔ ہندی، فارسی، انگریزی اور اردو میں آپ ملکہ رکھتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ان زبانوں میں متعدد تصانیف

---

[1] اس قسم کی بحث ایک مضمون میں ہو چکی ہے جو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان سے غالباً رسالہ ادب لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔

چھوڑی ہیں خصوصاً انگریزی اور اردو زبانوں میں تو آپ کو بدرجۂ اتم دستگاہ تھی۔ ان زبانوں میں سے بھی اردو زبان کو آپ زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ نظم و نثر کا ایک ضخیم ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے جس کو "رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ" کوشش کرکے جمع کر رہی ہے۔ سوامی جی کے پیام پر جو کچھ یہاں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کو ایک مزید اضافہ سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ تمام و کمال ان کے اردو مواعظ و کلام کا نتیجہ ہے جو مختلف رسالوں (مثلاً ست اپدیش اور رسالہ الف وغیرہ) اور چند ہندو احباب کی کرم فرمائیوں کی بدولت یہاں ایک با قاعدہ تبصرے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سوامی جی کے پیام کی اہمیت اُن فقیروں اور بھگتوں کے پیام کی طرح نہیں جنہوں نے نئے نئے پنتھ قائم کئے۔ ان کے نصائح تو بالکل عام تھے جو روحانیت کا رنگ لے کر معاشرت (رسوسائٹی) سے متعلق ہیں۔ سوامی جی کوئی نیا مذہب یا پنتھ قائم کرنے کے مخالف ہی نہ تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ "محبت" خود ایک عالمگیر مذہب ہے جو ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اس کو خواہ مخواہ کسی قسم کے رنگ یا تعین سے پابند کرکے پیش کرنا اس کو محدود کرنا ہے اس لئے ان کا پیام قدیم صوفیائے کرام کے اس کلام پر مبنی تھا کہ "جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا" وغیرہ۔ سوامی جی موصوف اپنے ان عقائد کا حوالہ ذیل کے فارسی اشعار سے دیا کرتے تھے۔

رفتم بہ طبیب و گفتم از دردِ نہاں ... گفتا کہ زغیر دوست بر بند زباں
گفتم کہ غذا؟ گفت ہمیں خونِ جگر ... گفتم پرہیز! گفت از ہر دو جہاں

اسی پیام کو مقتضائے معاشرتِ وقت وہ ایک خاص انداز سے دُنیا کے سامنے پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ پہلے خود اپنے آپ کو پوجے۔ اس طرح وہ اپنے وقت کے مہاتما بدھ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن پر اسلامی تصوف زیادہ غالب تھا اس لئے وہ کہتے تھے کہ ؎

کریں ہم کس کی پوجا اور لگائیں کس کو چندن ہم ... صنم ہم، دیر ہم، بتخانہ ہم، بُت ہم، برہمن ہم

وہ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مذہب ان کے زمانہ ہی میں دیوالیہ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کا کہیں نام تک نہیں لیتے اور اپنے پیام کو سلطنت مغلیہ کے ہر دلعزیز فرمانروا جلال الدین محمد اکبر کی کوشش سے مقابلہ کرکے فرماتے ہیں کہ:۔

"بظاہر ہندو پن، مسلمان پن، عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں جس میں پاکیزہ عشق عالمگیر پلانے کی وقتاً فوقتاً کوشش ہوتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان پُرانے پیالوں کی طرح اکبر نے بھی ایک نیا جام گھڑا ——— یعنی دینِ الٰہی ——— ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دینا اس کا مقصد تھا۔"

یہ پاکیزہ عشق عالمگیر "کبھی دیوالیہ نہیں ہو سکتا یعنی انسان کی روح پر حرف نہیں آسکتا یہ دوسری بات ہے کہ ظلمت کا احساس اور جہالتِ نفس اُسے سرمنے تنگ تعینات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رکھے اور اس کی سرمدی تابانی کو مدھم کر دے۔ خدا خود ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی

بندے اُس سے اتنے دور ہو جائیں اس لئے وہ ہر زمانے کے موافق ایسے برگزیدہ افراد کو بھیجتا رہتا ہے جو اس الٰہی امانت کو جہالت کی خیانت سے بچائیں۔ خود سوامی جی ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں :-

"آدمی اپنی قسمت اپنے ہاتھوں بناتا ہے۔ اور بقول ہربرٹ اسپنسر ملکی حالات ہی خود اپنے مطابق آدمی پیدا کر لیا کرتے ہیں"

سوامی جی اس بات کے قائل تھے کہ انسان اگر کوشش کرے تو مقصد براری لازمی ہے اس لئے ان کی کوشش بھی قدیم مہارشیوں کی سی کوشش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مغرب کا اثر لے کر اہل مشرق اور خصوصاً اہل ہند اپنی قدیم روحانیت کو بالکل کھو نہ بیٹھیں۔ اس لئے وہ بعض اوقات ایک دُکھے ہوئے دل کی صدا بن کر اپنے احباب اور شاگردوں سے اس طرح مخاطب ہوتے :-

"ہائے گوپی چند! میرے لال! تو گوبر اور مٹی (خواہشات نفسانی) میں کیوں ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ یہ لیلا رکھیل) خوب نہیں۔ بھگمن جیسا بدن تم نے میلا کیوں کر لیا ہے۔ گوبر مٹی میں تو بچھو (دُکھ) ہوتے ہیں کہیں کاٹ نہ کھائیں۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیگے تمہارا رونا تمہارا دامن نہیں سہہ سکتا۔ میرے ننھے آؤ تمہیں نہلاؤں۔ دُعا اور دل سے دودھ پلاؤں تم گڈریئے تو نہیں۔ تم دوارکا دھنش (مالک بحر و بر) ہو۔ چھوڑو یہ تماشا پن"۔

استعارہ کنھیا جی کے بچپن سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس سے وہ جذبہ ظاہر ہے جو سوامی رام تیرتھ کو ان کی اصلی صورت میں پیش کرتا ہے۔ باوجود اس نرمی کے آج کل کے تعلیم یافتہ طبقہ پر ان میٹھی باتوں کا اثر بھلا کیوں ہونے لگا۔ ان کے سخت دلوں پر کوئی پھول کھینچ مارے تو پھول ہی کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ایسے سخت دلوں پر تو ایک بڑے ہتھوڑے کی ضرب چاہیے۔ لیکن سوامی جی اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہتھوڑے کو بھی کسی نرم مخمل میں لپیٹ کر لگائیں۔ اس لئے وہ اس طرح کہتے تھے :-

"پیارے تم منتخب ہو چکے ہو۔ تمہارے لئے لنگور اور چیتے کا زمانہ گزر چکا۔ خونخوار ناخنوں، دانتوں اور سینگ کا عہدیت چکا پھاڑ کھانے یا دُم ہلانے کا وقت نہیں رہا۔ تم اب دنیا نوس کی طرح آفتاب، ماہتاب اور سب ستاروں کو چھوٹی سی دُنیا کے جسم کے گرد مت گھماؤ۔ خود غرضی سے باز آؤ! بلکہ اس زمینی جسم کو آفتاب حقیقت پر نثار کر دو۔ وار کے پھینک دو"۔

لیکن پھر بھی ضرب کاری نہ ہوتی تھی اور بہ مقتضائے بشریت آزردہ خاطر ہو جاتے اور اس روحانی ظلمت سے نالاں ہو کر کہتے :-

"اے آنند پرستار لوگو ۔۔۔۔۔ وہ رام کے دلیا پن کی ایک جھلک ہے اور بس۔ تمہیں شرم نہیں آتی لیکر کے بھوت (شراب) سے مصنوعی مستی مانگتے ہو ۔۔۔۔۔ آؤ شاہنشاہ زماں کو جو مستی نصیب نہیں ہے رام مرحمت فرماتا ہے"۔

روحانیت کا احساس تازہ رکھنے کے لئے سوامی جی نے وحدت الوجود کو جو اسلامی فلسفہ تصوف سے ماخوذ ہے فلسفۂ ویدانت سے اس طرح شیر و شکر کیا ہے کہ بڑی مشکل سے کوئی فرق نظر آتا ہے مگر در اصل ایک دوسرے میں بہت فرق ہے۔ بنیادی اصول ایک ہوں تو البتہ فرق نظر نہ آئے لیکن مشکل تو یہی ہے کہ جب جڑیں مختلف ہیں تو شاخوں، پتیوں، پھول اور پھلوں میں اختلاف ہونا ہی چاہئے۔ اور چونکہ

اس اختلاف کی بنیاد عقائد پر ہے اس لئے ہم اس کو یہاں دیدہ و دانستہ نظرانداز کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک کا مقصود ایک ہی ہے اس لئے سوامی جی کا مقولہ تھا کہ اُس کی تلاش چاہیئے راہ کوئی بھی ہو۔ زندگی کا حسن تو دل کی اس آرزو میں ہے جو اس کی جستجو سے متعلق ہو۔ اس کے وسائل ہر مذہب و ملت میں ہیں مثلاً :۔

"سنسکرت میں ویدانت (توحید) کے ازحد مستانہ نسخے ہیں۔ دتاتریہ کی اجدوت گیتا، اشٹاورگیتا، شنکراچاریہ کے استوتریا۔ بعض حصے یوگ باسسٹھ کے۔ فارسی میں سب سے بڑھ کر توحید کا کلام شمس تبریزؒ[1] کا ہے، اس سے اُتر کر مثنوی شریف، شیخ عطار مغربی وغیرہ، امریکہ میں والٹ وہٹ من کے" اوراق گیاہ "۔

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوامی جی کا فلسفہ تصوف بالکل اقتضائے وقت کے مطابق ہے کیونکہ اس میں دُنیا کے ہر بڑے مذہب کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور موجود ہے جو گھوم پھر کر "ہمہ اوست" کی تشریح و تفسیر ہو جاتا ہے۔ فارسی شعراء کے کلام سے جو اقتباسات سوامی جی نے اپنے لیکچروں میں بطور تمثیل و حوالہ پیش کئے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ بغیر کافی مطالعہ کے کوئی شخص اس قدر معلومات بہم نہیں پہنچا سکتا۔ جو شعر وہ لکھتے ہیں مبسوط لٹریچر کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ فوراً تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ مثلاً ؎

دوش آں صنم بیگانہ وش بگذشت از من چوں پری ۔۔۔ کردم سلامش، لیکن او داده جواب سرسری
گفتم چرا بیگانۂ؛ گفتا کہ تو دیوانۂ! ۔۔۔ من کیستم؛ تو کیستی؛ در خود چرا می ننگری
تو اوّلی و آخری تو باطنی و ظاہری ۔۔۔ تو قاصدی و مقصدی تو ناظری و منظری!

سوامی جی نے فلسفۂ ویدانت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے کمال انشا پردازی سے کیفِ محبت میں سرابور کر کے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر قسم کے احساس کو مغلوب کرتا ہوا سیدھا دل پر آلگتا ہے مگر بنیادی تعلیم عموماً اُپنشدوں پر مبنی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ تعلیم روحانیت کی عام شکل تعلیم اخلاق ہے جو برتاؤ کے ذریعہ سے عملی صورت میں نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرو نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

ہے ترائیسی پریت کر جیسی برچھ کرے ۔۔۔ دُھوپ سہے سر آپنے اورن چھاؤں کرے

(برچھ: درخت؛ اورن: دوسروں کیلئے)

وہ کہتے تھے کہ جب تک رُوح کا تعلق جسم سے ہے انسان کو اپنے کردار پر قدرت حاصل ہے لیکن اس کو خودی اور انانیت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ مؤخرالذکر تو مایا کا ایک پھندا ہے۔ جسم و جان کے تعلق سے جو قدرت انسان کو حاصل ہے وہ بھی دراصل قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اس مسئلے کو وہ نہایت سلجھے طریقے پر اس طرح حل کرتے ہیں :۔

"یہ خیال کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یا پرشارتھ سے سب کچھ ہوتا ہے، اس میں کچھ فرق نہیں بلکہ فرق صرف ان کے کہنے والوں کا ہے

---

[1] جو دراصل مولانا رومؒ کا کلام ہے۔ حضرت شمس تبریزؒ آپ کے مرشد تھے۔ اس لئے ان کے نام سے بہت کچھ لکھا۔

جو حقیقت کو نہیں دیکھتیں سو دیانت تو اُن تمام لوگوں کی خدمت میں جو یہ کہتے ہیں کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یہ کہتا ہے کہ پہلے صرف اتنا بتاؤ کہ آپ ایشور کا سروپ کیا مانتے ہیں۔ آیا وہ نراکار ہے یعنی بے صورت ہے یا ساکار ہے یا باصورت۔ آیا وہ فاعل کرتا ہے یا محض اکرتا۔ وہ باتعلق یعنی سنگ دان ہے یا بے تعلق اسنگ؟..... جو لوگ نپولین وغیرہ کی ہمت کا حوالہ دیتے رہتے ہیں اگر وہ اس کی سوانحعمری کو غور سے پڑھیں تو ضرور یہ بات پائیں گے کہ جس وقت نپولین کامیابی حاصل کر رہا تھا اس وقت اس کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ میں کام کر رہا ہوں بلکہ جس وقت جوشِ مستی میں بے خبر ہو کر لڑتا تھا اس وقت کامیابی حاصل ہوتی تھی"۔

یہی وہ کیفِ بے خودی تھا جو قدیم ہندوستان کو تمام دنیا پر روحانیت کے اعتبار سے برتری فائق کئے ہوئے تھا۔ اب نہ وہ کیفِ بیخودی ہے نہ روحانیت اب وہ ہندوستان ہی نہیں کیونکہ:۔

"وہ ہندوستان جنت نشان جس کے گنجان درختوں کے جھنڈوں میں یا کوئل کے میٹھے سُر سُنائی دیتے تھے یا شانتی برساتی ہوئی دید دھنی .... جس کے شیشے کی طرح صاف و شفاف چشمے اُن مہا پرشوں کے انتہ کرن سے زیادہ نرمل تھے جو وہاں رمن کرتے تھے.... آج اُن رشیوں والے بھارت ورش میں اس سرے سے اس سرے تک کتنے آدمی ایسے ملیں گے جو سروپ میں ارود لڑھ ہوں.... جس سے پوچھو سوار نداد گھوڑے ہی کا پتہ دے گا.... فلاں دفتر میں ملازم ہوں۔ یہ تنخواہ۔ فلاں قوم۔ فلاں شخص کا بیٹا۔ یہ جائے سکونت۔ یہ عمر۔ خوبصورت ہوں۔ میں مرد ہوں۔ میں ایم اے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ بیلیے یہ سب تو جسم کا حلیہ و پتہ ہے"۔

حقیقت میں یہ سب مایا کا جال ہے بقول امریکن محقق ایمرسن (Emerson) کے:۔

In changing moon and tidial wave,
Glows the fend of want and have.

اس انقلابی مد و جزر پر سوامی جی نے ایک نہایت ستھرے انداز میں اس طرح خیال آرائی کی ہے:۔

"ہندوستان اور امریکہ میں کیا فرق ہے؟ یہاں دن ہے تو وہاں رات ہے۔ وہاں دن ہے تو یہاں رات ہے۔ جن دنوں ہندوستان کا ستارا بالا تر تھا امریکہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ آج امریکہ عروج پر ہے تو ہندوستان کی پرچھ نہیں"۔

سوامی جی جب کیفِ جذبات میں ہمہ تن محو ہو جاتے ہیں اس وقت وہ کچھ کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرِ رحمت ہے جو موسلا دھار مینہ کی طرح برس رہا ہے۔ دیکھئے روحانی تعلیم کا حسب ذیل انداز خود ثابت کر رہا ہے کہ میں ایک ایسے دل کی صدا ہوں جس سے محبت کا دریا اُمنڈ رہا ہے:۔

"او ہتکڑی کے کنگن پہنے ہوئے مجرم اگر اس وقت بھی تو ایک لمحہ بھر کے لئے یاد حقیقت میں جسم و جان کو سچ مچ بھول جائے۔ اپنی

بے خودذات میں جاگ پڑے تو سوا کا فتوے دینے والے جج کا دماغ رُک جائے ۔ اظہار لکھنے والے مثل خوان کا قلم رُک جائے ۔ بگڑنے والے کوتوال کا قلم رُک جائے ۔ جرح کرنے والے وکیل کی زبان رُک جائے ۔ کون دماغ ہے جو تیرے بغیر سوچ سکتا ہے ۔ کون زبان ہے جو تیری مدد بغیر بول سکتی ہے ۔ کون ہاتھ ہے جو تیری قوت بغیر چل سکتا ہے ؟ میری جان سب قصوروں کا قصور (سب پاپوں کی جڑ) اپنی ذات پاک کو غلطی یا بھولنا ہی تھا "

اور اس ہمہ اوست جذبہ کا پہلو دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا گیا ہے :-

" چھپ کر رہنے والی ہندوستان کی عورت کی آنکھ سے ٹپکتا ہوا آنسو کا موتی جو کسی نے بہتے نہیں دیکھا اُسی قانون کشش ثقل کا مظہر ہے جس کا آسمان میں ٹوٹتا ہوا اور دوڑتا ہوا تارا جو سب کو نظر آنے والا شہاب ہے ۔ شاہی قلعوں میں اور اندھی بڑھیا کے جھونپڑے میں دل کی خواہشیں تو ایک جیسی ہیں اور اندرونی رنج و راحت بھی ایک جیسے اور قانون کامیابی بھی ایک ہی ہے اس ایک قانون کو جان لیا تو تم گویا تاریخِ عالم کو جان گئے "۔

اور اس کی مزید تشریح خلاصہ کی شکل میں اس طرح کی جاتی ہے :-

" جہاں غیریت دکھائی دیتی ہے وہاں ایک دوسرے کو دیکھتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کو سونگھتا ہے وہاں ایک دوسرے کو سنتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کا ذکر کرتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کی بابت فکر کرتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کو جانتا ہے ۔ لیکن جہاں سب کچھ ایک ہی آتما ہو وہاں کس کو کس سے دیکھے ۔ کس کو کس سے سونگھے ۔ کس کو کس سے سنے ۔ اس کا کس سے ذکر کرے ۔ کس کا فکر کرے ۔ کس کو جانے جس سے یہ کل اشیا جانی جاتی ہیں ۔ وہ عین علم کس سے جانا جائے ؟

اے خدا جویان خدا گم کردہ اید   گم درین امواج قلزم کردہ اید "

یہ منتہائے اخلاقِ روحانی اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تعینات کی تمام دیواریں ڈھے جائیں ۔ دُنیاوی علائق کے ساتھ ساتھ یہ غیر ممکن ہے مگر دراصل انسان کی ہمت کے آگے کوئی چیز غیر ممکن نہیں ۔ بھوکے پیٹ کے لئے جس طرح محنت کرکے غذا بہم پہنچائی جاتی ہے اسی طرح بھوکی روح کو ریاضت کرکے میسر کیا جا سکتا ہے لیکن ہر ایک کے بس کی بات نہیں "قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے " ـــــ اس لحاظ سے جس کے بھاگ میں تھا نے وہی بھگوان کو جانے ۔ لیکن پیغام پہنچانے والے کا تو فرض یہی ہے کہ ہر ایک کے پاس اپنا پیغام پہنچا دے ۔ اس وقت میرا بائی کا ایک نہایت مشہور مگر سہانا گیت یاد آیا ۔ تفریح طبع کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دراصل عام زبان میں یہ اُسی تعلیم کا حامل ہے جس کو سوامی جی نے اپنے جذبات سے رنگین کرکے فلسفۂ ویدانت کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ وہ نغمہ یہ ہے :-

رام نام رس پی لے رے منوان   رام نام رس پی لے

تج کے کنگ ست سنگ بیٹھ نت — ہری چرچا سن لے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان — رام نام رس پی لے
کام کرودھ مد لوبھ موہ کو — چت سے مٹائی دیجئے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان — رام نام رس پی لے
میرا کے پربھو گردھر ناگر — تاہی کے رنگ میں بھیجے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان — رام نام رس پی لے

رام نام کا رس" یا عشق حقیقی کی کیفیت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو دل سے غصہ گرمی اور حرص و ہوس کے نقشے کو دُور کر سکے ۔ یہ " کام کرودھ اور مد لوبھ" ہی تو تعینات کی نہ گرنے والی دیواروں کا سبب ہیں ۔ بظاہر آج کل کی زندگی میں اس سے چارۂ کار نہیں ۔ پہلے بھی بڑے بڑے صوفیائے کرام اور پرم ہنس پیشوا زمانے کی رفتار کے موافق اپنے اپنے رنگ میں اس کے خلاف پرچار کرتے رہے ۔ کچھ لوگوں پر ان کی سعی کارگر بھی ہوئی مگر اس پروپیگنڈے کو عمومیت کبھی نہ حاصل ہوئی یہانتک کہ اب وہ زمانہ آیا کہ مہارشیوں نے تعینات کے پردوں ہی پر روحانی تعلیم کے نقش و نگار بنانے شروع کئے ۔ صرف اسلئے کہ مغرب کی مادیت مشرق کی روحانیت کو بالکل ہڑپ نہ کر لے ۔ اس میں شک نہیں کہ سوامی رام تیرتھ کے مشن نے اہلِ مغرب کے من کو بھی موہ لیا ۔ آج کل مہارشی ٹیگور کا " پیام سکون " نوجوان طبقے پر اعجاز ثابت ہو رہا ہے ۔ لیکن مہارشی موصوف نے روحانیت کو نیچر کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ایک دوسرے میں تمیز کرنا سخت مشکل ہے اور چونکہ ان میں یہ رنگِ مجاز زیادہ غالب ہے اس لئے بادی النظر میں ٹیگور کے پیام سکون پر روحانیت کا اطلاق ہی نہیں ہوتا تاوقتیکہ ہر موضوع پر مزید تشریح نہ کی جائے ۔ سوامی رام تیرتھ آرائش و زیبائش کی طرف زیادہ رجوع نہیں ہوتے وہ تو پھول کی خوشبو سے عطر بناتے اور زندگی کو اس سے معطر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس لئے ان کے یہاں روحانی تعلیم پیش پیش ہے ۔ وہ اس جذبہ کو شاعرانہ جذبات اور تلقینِ عمل سے شیر و شکر کر کے اس طرح دکھاتے ہیں کہ دل کو اس سے ایک قسم کا سکون ہی نہیں محسوس ہوتا بلکہ وہ ان کے پیام کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور خود بخود رو بہ اصلاح ہونے کا خواہاں ہو جاتا ہے ۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کے لیکچر کا ایک دلچسپ حصہ ہے جو اپنی دلفریبی کے لحاظ سے مہارشی ٹیگور کے افسانوں کی طرح ایک پیام سکون ہی نہیں بلکہ مصلح شیراز (سعدیؒ) کی حکایتوں کی طرح تعلیمِ اخلاق ہونے کے علاوہ کسی بڑے پرم ہنس پیشوا کی روحانی تعلیم بھی ہے اور عہد جدید کے کسی بڑے نقاد کی طرح مغربی تعلیم اخلاق پر ایک دلچسپ تنقید بھی ہے ۔

ظلمتِ شب کی کالی چادر چھا رہی ہے ۔ ستارے جگمگا رہے ہیں ۔ کسی کی مجال کیا کہ ان کی تعداد کا اندازہ لگا سکے ۔ بل بے کثرت ۔

ایک ہی پلنگ پر ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے دولہا دولہن آرام میں پڑے ہیں ۔ لیکن دولہا تو ٹاؤن ہال لاہور میں

امتحان کے پرچے لکھ رہا ہے اور دلہن اپنی دیورانی یا جٹھانی سے گِلہ اُلاہنا کی لین دین میں مصروف ہے۔ اے لو جنگ وجدل شروع ہوگئی۔ چپ رہ بی بی چپ رہ۔ تیرا شوہر امتحان کا پرچہ لکھ رہا ہے۔ اس کو ڈسٹرب مت کر۔ اے لو وہ چونک پڑا۔ نیند اُچاٹ ہوگئی۔ کیسا امتحان ؟ کس کا ٹاؤن ہال ؟ یہاں تو نا زمین ہے اور آپ ہے۔ کمرے کے باہر آکر دیکھا تو کہر ہی کُہر کے تودے لگ رہے ہیں۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا۔ صبح کا پیش خیمہ ابھی نظر نہیں آتا۔ اے زہرہ تیرا سرود ورقص کیا ہوا! تمہارے ہمدم وہمساز ستارے خوشی کو بھول گئے۔

دولہا میاں نے نوکر کو آواز دی۔ جواب ندارد۔ پاس جا کر دیکھا تو خواب خرگوش کے خرّاٹے بھر رہا ہے۔ ہمارے نوجوان کے چھوٹے سے سینے میں طوفان بپا ہوگیا۔ طبیعت میں ایک فوری جوش پیدا ہوا۔ چہرہ ڈراؤنی رات سے بھی زیادہ مہیب ہوگیا۔ نوکر کو بُری طرح جگایا۔ اور کان کھینچ کر تاکید کی کہ اب آنکھ نہ جھپکے۔ ہشیار رہے۔ رات بڑی ہولناک و بھیانک ہے۔ سب طرح کا ڈر ہے وغیرہ۔ اِدھر نوکر بیدار و بیزار ہوا اُدھر آقا صاحب پڑھنے کے کمرے میں گھُسے۔ لیمپ روشن کرکے بَین کا علم اخلاق پڑھنے لگے۔ کوئی ایک آدھ صفحہ پڑھا ہوگا کہ آنکھ لگ گئی۔ پَیر فرش پر۔ کمر کرسی پر اور سر کتاب کے اُوپر میز پر دھرے بیہوش پڑے ہیں۔ ان کو تو نیند کی گرم گود میں چھوڑو۔ اب باہر ٹھٹھرے ہوئے ملازم کی خبر لو۔ وہ بیچارہ سخت جدوجہد میں پڑا ہے بلکہ جنگ وجدل میں لگا ہے کسی سے لڑ رہا ہے۔ کیا چور گھر میں آگھُسے۔ نہیں خواب کے مقابلے پر اَڑا ہے۔ نیند سے زور آزمائی کر رہا ہے۔ آنکھیں ملتا ہے۔ جمائیاں آتی ہیں۔ انگڑائیاں لیتا ہے۔ ہائے کب پَو پھٹے گی تڑکا ہوگا۔ صبح مُنہ دکھائے گی۔ بار بار آسمان کو تکتا ہے۔ رات کٹتی ہی نہیں۔ کبھی ٹہلنا شروع کرتا ہے۔ پھر مارے ٹھنڈ کے چارپائی کی پناہ لیتا ہے۔ ہاں خوب سُوجھی۔ گانا شروع کرو۔ وقت معلوم نہ دے گا۔ ساتوں سُر ملے ہوئے آواز سے گانے لگا:۔

نیند تو ہے بیچونگی آلی   جے کوئی گاہک ہوئے
آئے تھے موہنا گھوم گئے انگنا   میں بیرن رہی سوئے
نیند تو ہے بیچونگی آلی
سورداس پربھو اب جو ملو گے   راکھوں گی نین سموئے
نیند تو ہے بیچونگی آلی"

گانے کی آواز سُن کر کمرے کے اندر بابو بھی جاگ پڑا اور پڑھنے لگا۔ نوکر لہرا لہرا کر گا رہا ہے۔ اپنی دھُن میں مست ہو رہا ہے۔ صبح اور شب کو بالکل بھُول بیٹھا۔"

یہ تمام عبارت سوامی جی کے اُس پیام کی تشریح ہے جس کو دوسری جگہ انہوں نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

"سزا دینا اور کینہ پروری وہ گدھ ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ تمہارے اندر جہل کا مُردار سڑ رہا ہے۔ بغیر مردار کے غصہ کا گدھ کبھی نہیں آتا۔"

متذکرۂ بالا تمثیل میں نوکر آقا کی ناراضی اور زجر و توبیخ سے بے نیاز ہو کر اپنی ہستی کو ہمہ تن نغمہ بنا دیتا ہے جو صبح کی لاہوتی فضا میں احساس الوہیت سے بالکل ہم آہنگ ہے یعنی اُس کی ہستی انسانیت کے درجے سے اس وقت بالاتر ہی نہیں بلکہ ہمہ اوست کی ایک خوابی تعبیر ہے۔

فلسفۂ ویدانت کے متعلق اہل علم میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی ہیں جو اواگون وغیرہ کے مسئلوں سے اور بھی زیادہ پیچیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ سوامی جی نے اوپر لکھی ہوئی مثالوں کی طرح اپنی انشا پردازی کے ذریعہ سے ہر قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اواگون محض ایک نام ہے جس کو دوزخ و بہشت کی طرح ایک تمثیلی ذریعۂ تعلیم سمجھنا چاہئے۔ دراصل خواہش اور لوبھ کا نشہ ہی انسان کو دیکھنا نہیں ہونے دیتا اور جس وقت یہ نشہ آرزو دل و دماغ سے بالکل نسیاً منسیا ہو جاتا ہے (جس طرح اوپر لکھی ہوئی تمثیل میں نوکر کیف نغمہ میں کچھ دیر کے لئے بالکل نے ہو گیا) اس وقت روح اپنے اُس سرمدی مرکز کی طرف خود بخود کھنچ جاتی ہے جس نے اس کو بظاہر آزمائش کی آلائش میں مقید کر رکھا ہے۔ پس بقول سوامی جی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:۔

"کوئی بھی شخص دراصل نہ تو مقید ہوتا ہے نہ نجات پاتا ہے۔ نہ آواگون کے ماتحت ہوتا ہے۔ پرکرتی ہی سب پُرشوں کے آگے پھنستی ہے آزاد ہوتی ہے اور تناسخ میں گھرتی ہے۔"

فلسفۂ ویدانت میں عموماً اسباب و اوقات کے تعین اور احساس و خواہشات کی تلقین ہی کو دوسرے معنی میں مایا جال کہا گیا ہے۔ جس کی مثال عام زندگی میں سوامی جی نے اس طرح بہم پہنچائی ہے:۔

"جب تم کسی دقیق معاملہ کی چھان بین میں مستغرق ہوتے ہو تو گو آنکھیں کھلی ہوں سامنے سے کیا کچھ گزر جائے دکھائی نہیں دیتا۔ کان بند نہ ہوں پر شور و غل سنائی نہیں دیتا۔ وجہ یہ ہے کہ تم نے توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ تمہاری طرف سے "کُن" نہیں ارشاد ہوا۔"

المختصر سوامی جی کا پیام فلسفۂ ویدانت کی تشریح کے اعتبار سے اردو زبان میں ایک خاص اہمیت اس وجہ سے رکھتا ہے کہ آج تک اس زبان میں اس سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کسی نے اس کو پیش نہیں کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود اُردو زبان کے علماء اور شعراء اس کو نظر انداز کرتے رہے۔ کوئی مذہب کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہا اور کوئی زلف گرہ گیر کی گتھی سلجھانے میں ہمہ تن مصروف رہا جس سے نہ کچھ حاصل نہ بحصول منفعت میں تضیع اوقات ہوتی رہی۔ اِن باتوں کا خیال کر کے اُردو زبان فلسفۂ ویدانت سے مالا مال ہو کر سوامی جی کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے کم ہے کیونکہ سوامی جی کے پیام میں خشک فلسفہ ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں انشا پردازی اور ادب کا کمال اس طرح ظاہر کیا گیا ہے جو اردو زبان کے بڑے بڑے ادیبوں کے دلوں کو بھی مسخر کر لے۔

زندگی کے آخری ایام میں سوامی جی بہت ہی زیادہ رقیق القلب ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے ان کی نثر نے نظم کا پہلو اختیار کیا جو ہندی پنجابی، اردو، اور انگریزی ہر زبان میں اسی آن بان کے ساتھ موجود ہے جو کسی اہل زبان میں ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظم میں کہیں کہیں عروض کی غلطیاں ہر زبان میں رہ گئی ہیں مگر زیادہ نمایاں نہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور شاعر تو تھے نہیں نہ ان کو شاعر کہلانے کی آرزو تھی، ان کا کلام جذبات کا ایک دریا تھا جس کا دھارا سطح زمین کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ تیز یا دھیما ہو جایا کرتا تھا۔ غرض اردو زبان میں وہ ایک کامیاب ادیب کہلانے کے مستحق ہیں اس اعتبار سے ان کی نظم کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک اکتسابی اور فطری جذبے میں کیا فرق ہے۔ ذیل کے مسدس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دیکھئے ایک صوفی ویدانتی نیچر کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے:۔

پہاڑوں کا ہر سمت خاموش سونا   دو شالہ وہ گنجان پیڑوں کا ہونا
وہ دامن میں سبزے کی مخمل بچھونا   ندی کا بچھونے کی جھالر پرونا

یہ راحت مجسم یہ آرام میں ہوں
کہاں کوہ و دریا یہاں میں ہی میں ہوں

یہ پربت کی چھاتی پہ بادل کا پھرنا   وہ دم بھر میں بادل سے پربت کا گھرنا
کڑکنا، گرجنا، چمکنا، نکھرنا   چھما چھم چھما چھم وہ بوندوں کا گرنا

عروس فلک کا وہ ہنسنا وہ رونا
مرے ہی لئے ہے فقط جان کھونا

یہ وادی کا رنگیں گلوں سے لہکنا   فضا کا یہ خوشبو سے ہر سو مہکنا
یہ بلبل سے خنداں لبوں کا چہکنا   وہ آواز سننے کا ہر سو لپکنا

گلوں کی یہ کثرت ارم رو برو ہے
یہ میری ہی رنگت یہ میری ہی بو ہے

.. ..

چڑھائی مصیبت اترنا یہ مشکل   پھسلنی برف تس پہ آفت یہ بادل
قیامت یہ سردی کہ بچنا ہے باطل   یہ بو بوٹیوں کی کہ گھبرا گیا دل

یہ دل لینا جاں لینا کس کی ادا ہے
مری جاں کی جاں جس پہ شوخی فدا ہے

عجب لطف ہے کوہ پر چاندنی کا — بہ نیچر نے اوڑھا ہے جالی دوپٹہ
دکھاتا ہے آدھا چھپاتا ہے آدھا — دوپٹے نے جوبن کیا ہے دوبالا

نشے میں جوانی کے معشوقِ نیچر
ہے لیٹی ہوئی رآم سے مست ہو کر

اردو غزل نے کس کے دل کو مسخر نہیں کیا لیکن ہر وہ شخص جو اُردو ادب سے بخوبی آگاہ نہ ہو اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ سوامی رام تیرتھ نے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ نہ کیا ہو۔ غالباً اسی وجہ سے اُنہوں نے متعدد غزلیں لکھیں جو ان کے دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔ بطور تمثیل یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

سرود و رقص و شادی دمبدم ہے — تفکر دور ہے اور غم کو رم ہے
مبارک ہو طبیعت کا یہ کھلنا — یہ رس عیشِ اُدِ سنھا جامِ جم ہے
"مبارک" کہہ رہا ہے چاند جھک کر — سلاموں سے کمر میں اسکی خم ہے
رکھیں گے آگے کیا کیا ہم نہ اُمید — کہ مارا گرگِ غم یہلاق دم ہے
نہ کہتا تھا تمہیں کیا رآم پہلے — صباحِ عید آئی رات کم ہے

فارسی زبان کا حُسن سوامی جی کے دل کو مسخر کیئے رہتا تھا۔ وہ اکثر حضرت عثمان ہارونی رح کی وہ غزل پڑھا کرتے تھے جس کی ردیف "می رقصم" ہے۔ اربابِ تصوف میں یہ غزل بہت مشہور ہے۔ یہاں بطور حوالہ مطلع لکھا جاتا ہے:۔

نمی دانم کہ آخر چون دمِ دیدار می رقصم — مگر نازم برین ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم

وفورِ کیف کے عالم میں بے خود ہو کر سوامی جی اکثر یہ غزل پڑھتے اور ایک وجدانی کیفیت میں آہستہ آہستہ گھوما کرتے تھے۔ آپ نے اپنی پنجابی زبان میں اس غزل کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے۔ یہاں ان کی مَن ترنگ لفظ بلفظ لکھی جاتی ہے جو شاید اسی غزل سے مستفاد ہے۔ اردو اور پنجابی یا یہ کہ ہندوستانی اور پنجابی اس میں باہم شیر و شکر ہیں[1] :۔

ناچوں میں نٹ راج رے — ناچوں میں مہاراج

سُورج ناچوں تارے ناچوں — ناچوں بن مہتاب رے
تَن تیرے میں مَن ہو ناچوں — ناچوں ناڑی ناڑ رے

---

[1] یہ نظم راقم کو اچھی طرح یاد نہیں۔ خصوصاً ساتویں شعر کی بابت کچھ شک ہے۔ ابتدائی اشعار بالکل صحیح ہیں۔

بادر ناچوں بایو ناچوں ناچوں ندی ارناپ رے
قطرہ ناچوں سمندر ناچوں ناچوں موگھر کاج رے
مدھوالب بدمستی والا ناچوں پی پی آج رے
گھر لاگو رنگ رنگ گھر لاگو ناچوں پا پا داج رے
راگ گیت سب ہوت ہردم ناچوں بلورا ساج رے
رآم ہی ناچت رآم ہی باچت ناچوں ہو نرلاج رے
ناچوں میں مہاراج !

کیا فیثا غورث کے نظریۂ "سرودِ انجم" کا تصوّر اس نظم سے نہیں ہوسکتا؛ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ اجرام فلکی کے درمیان "دہرہ" رقص اور کیف کے عالم میں اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے کہ میرا رقص اس پروانے کے رقص سے جو شمع کے گرد ہو بڑے اسکیل پر بالکل مطابق ہے سہ

تپش چوں حالتے آرد بروے شعلہ می رقصم خلش چوں لذتے بخشد بنوکِ خار می رقصم

الغرض اسی طرح ہر زبان میں سوامی جی نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ اردو زبان میں سوامی جی کو خواجہ میر درؔد دہلوی کا کلام بہت پسند تھا وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے کہ :-

باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں گروار ہیں تو ہم ہیں اور یار ہیں تو ہم ہیں

یہ وہ بہت پڑھا کرتے تھے۔ ان کا کوئی لیکچر اس غزل کے اشعار سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ علامۂ اقبال کی نظم سے سوامی جی کو ایک خاص دلچسپی تھی۔ خصوصاً یہ اشعار تو وہ اپنی من ترنگ کے عالم میں اکثر پڑھا کرتے تھے :-

بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

علاوہ ان حضرات کے سوامی جی کے لیکچروں میں میر ضامن علی جلاؔل لکھنوی کا کلام بھی نظر آتا ہے خصوصاً یہ اشعار:-

شوق اللہ رے اس چشمِ تماشائی کا حوصلہ تنگ ہوا جاتا ہے بینائی کا
آج کچھ پلٹے ہی جاتے ہیں وہ آئینے سے نشہ بیخود کئے دیتا ہے خود آرائی کا

بے نشاں سنگ در یار ہی کو کرنا تھا　　　دل پہ اِک داغ ہے کمبخت جبیں سائی کا

اور یہ شعر تو متعدد دلکھروں میں دیکھا گیا:۔

جلاؔل اُس بُت کا بندہ دل سے ہو جاؤں جو بتلا دے　　　یہ کیا جھگڑا لئے پھرتے ہیں سشیخ و برہمن اپنا

ہندی زبان میں ان کو ایسا ہی ملکہ تھا جس طرح کہ اردو میں۔ مگر ہندی شعرا میں سور داس جی اور کبیر صاحب کے کلام سے ان کو زیادہ رغبت تھی۔ اور بُلھا شاہ کی کافیاں تو ہر روز وردِ زباں رہتی تھیں جن کے متعلق اگر ممکن ہُوا تو علیحدہ کچھ لکھنے کی کوشش کی جائیگی زندگی کے آخری ایام میں ان کے قلب کی وجدانی کیفیت میں زیادتی ہوتی گئی اس لئے ان کی نظم سے عروض کی پابندی بالکل اُٹھ گئی اور وہ جو کچھ لکھتے تھے ایک آزاد نغمہ ہوتا تھا۔ اس وقت کا ذکر ان کے ایک شاگرد نے اس طرح کیا ہے:۔

"ایک بلند پہاڑی پر رام بھگوان کی کٹیا سے قریب ایک فرلانگ پر میدان ہے..... کٹیا کی لمبائی تقریباً ۱۳ گز اور چوڑائی ۶ گز ہوگی..... اس کے اندر کیا رکھا ہے؛ پانچ چھ چھوٹے بڑے صندوق ہیں جن میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہیں۔ چاروں وید..... ویدانت کی مشہور کتابیں جو آج تک سنسکرت میں لکھی گئیں۔ اور مولینا روم و شمس تبریز و فارسی میں اور ایمرسن اور والٹ وہٹ مین انگریزی میں..... ایک بکس میں رام بھگوان کے ہاتھ کی لکھی کتابیں تھیں جو دو تین فلسکیپ کے ریم سے کم نہ ہونگی..... ہوا دھیمی دھیمی چال سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس وقت رام کے دل میں ایشور کے پریم کا سمندر اُمڈا اور رام نے لیٹے ہوئے یہ گایا:۔

ہے رو کر یہ تکرارِ الفت تو تجھ سے　　　مرے جسم و جاں میں ہو حرکت تو تجھ سے

اُڑے مامنی کی وہ شرکت تو تجھ سے　　　ملے صدقہ ہونے کی عزت تو تجھ سے

سدا ایک رہنے کی لذت تو تجھ سے　　　رفیقوں میں گر ہے مسرت تو تجھ سے

عزیزوں میں گر ہے محبت تو تجھ سے　　　خزانوں میں جو کچھ ہے دولت تو تجھ سے

امیروں میں ہے جاہ و دولت تو تجھ سے　　　حکیموں میں ہے علم و حکمت تو تجھ سے

ہے رونق جہاں یا ہے برکت تو تجھ سے

بعد ازاں بلھا شاہ کی وہ کافیاں جو کہ اس نے اپنے پیر شاہ عنایت کی مفارقت میں کہی ہیں دل چیرنے والے لہجے میں سنائیں۔ ایسا آنند اُمڈا کہ ہم لوگ بے سُدھ ہو گئے اور رام بھگوان کو بھی گاتے گاتے یہ خیال نہ رہا کہ کیا وقت ہے اور ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں" (رسالہ ست اُپدیش)

اس بڑے اہلِ دل مہارشی پر جتنا بھی لکھئے کم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دُنیا کی زندگی اس کے نزدیک مایا کا جال تھی جس میں یہ طائرِ قدسی زیادہ عرصہ تک مقید نہ رہ سکتا تھا۔ آخر اس کو توڑ کر وہ اپنے اُس آشیانہ میں جا بیٹھا جو محبت کے گنبدِ نور کے پاس ہی کسی فردوسی شجر کی شاخوں پر بنایا گیا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ اُس گنبد میں داخلہ کی اجازت اس کو ہوئی یا نہیں اس کے متعلق کچھ

لکھنا ابھی خیالِ خام ہے کیونکہ دارالسلام کی طرف بُلانے والے کی دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔

لیکن سوامی جی ہم میں اور آپ میں اب بھی موجود ہیں اور بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ :۔

در سخن پنہاں شدم چوں بوئے گل در برگ گل — ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس لئے لازم ہے کہ آخر میں سوامی جی کے پیام سے چند خاص خاص اقتباسات اور بھی لکھیں اور اس مضمون کو اُن کی زبان سے ادا کئے ہوئے الفاظ ہی کے ساتھ ختم کریں :۔

"اے انسان تیرے اندر وہ دولتِ عظیم اور طاقتِ لاانتہا ہے کہ اس کا باقاعدہ اظہار ہی ملکِ دنیا اور خدا تک کو خوش کر سکتا ہے۔ اے گلِ نوبہار تُو اپنی ذات میں خنداں تو ہو۔ اس بیج کے فرض ادا کرنے میں تیرے باقی سب فرض ادا ہو جائیں گے"۔

"پرمیشور ان کی سہایتا کرنے کو حاضر ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کو تیار ہوں۔ جب آدمی پورا ادھیکاری (مستحق) ہوگا تو اس کا ادھکار (حق) ہی اس کو خود بخود ڈھونڈھ لے گا"۔

"میرے پیارے نوجوانانِ ہند تم گئی گزری اٹھارہویں صدی کے ڈیوڈ ہیوم وغیرہ کے بھرتے میں آکر جہل کا نام علم مت رکھو"۔

"پیارے ہندیو اپنے دل میں خلوص کو جگہ دو۔ اکبر بادشاہ کا سا دل پیدا کرو۔ یہی زندہ ولی ہے۔ . . . تحصیل معرفت دو طرح پر ہو سکتی ہے (۱) تحصیل نظری (Theoretical) اور (۲) تحصیل عملی (Practical)۔ علم کیمیا کا پڑھنے والا اگر ساتھ ساتھ تجربہ کرتا جائے تو کبھی اس علم سے حظ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہی حال علم الٰہی کا ہے جس کے ساتھ ساتھ عمل درکار ہے"۔

مَیں نے مانا دہر کو حق نے کیا پیدا ولے
مَیں وہ خالق ہوں مری کُن سے خدا پیدا ہُوا

سیّد مقبول حسین احمد پوری

جامِ شکستہ

جب سے تُو پیارے جام ٹوٹ گیا — میکشوں کا نصیب پھوٹ گیا

تجھ میں اے جام اب وہ مَے نہ رہی — کیف کی میرے کوئی شے نہ رہی

آج اے جام تجھ کو رو بیٹھے — لطفِ ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھے

تجھ سے ملتی تھی مجھ کو مدہوشی — تجھ سے حاصل تھی خود فراموشی

وجد کا حال تجھ سے تھا دل میں — سحر پنہاں تھا ساغرِ گل میں

بے خودوں کو کبھی جگاتا تھا — آبِ حیواں کبھی پلاتا تھا

تھا تُو ہمراز مَے پرستوں کا — تھا تُو دمساز مجھ سے مستوں کا

تجھ میں کیا بیخودی کے ساماں تھے — راز مستی کے تجھ میں پنہاں تھے

دیکھنے میں تو ساغرِ گل تھا — پر حقیقت میں جانِ محفل تھا

تیرا اِس طرح ہاتھ سے جانا — بھر گیا ہے ہمارا پیمانہ

تو نہیں ٹوٹا جی ہی چھوٹ گیا — رشتۂ زندگی ہی ٹوٹ گیا

شیشۂ دل میں تجھ سے مستی تھی — اُجڑی منزل یہ تجھ سے بستی تھی
اب کسے کوئی مُنہ لگائے گا — پھُول سا ہاتھ میں اُٹھائے گا

تُو نے بخشی نہ صرف بیہوشی — بارِ غم سے ملی سبکدوشی
آنکھ تجھ پر تھی بادہ خواروں کی — زندگی تجھ سے نوبہاروں کی

دردِ سینے کا تُو مٹاتا تھا — آتشِ دل کو تُو بجھاتا تھا
صُبح پیتے تھے شام پیتے تھے — تیرے صدقہ میں رند جیتے تھے

ہم زمیں پر نہ پاؤں دھرتے تھے — آسمانوں کی سیر کرتے تھے
دم قدم کا یہ تیرے تھا صدقہ — ہم زمیں پر۔ دماغ عرش پہ تھا

اب کہاں دلِ گدازیاں تیری — اور مہماں نوازیاں تیری
اہلِ محفل کو تجھ سے آس نہیں — تجھ کو تشنہ لبوں کا پاس نہیں

جب تُو پھرتا تھا شان تھی دُونی — وہی محفل پڑی ہے اب سُونی
جامِ جم سے سوا تھی تیری شان — خاکساروں کا رکھتا تھا تُو مان

مست ناشاد کو بنا دے پھر
راگ وحدت کا تو سنا دے پھر

رام پرشاد ناشاد

اُمّید و بیم

"ذیل کا افسانہ ایڈگر ایلن پو کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے۔ وہ اپنی مزاحیہ نگاری کے باوجود درد انگیز جذبات کا دلدادہ ہے، اس کی ہنسی ظریفانہ ہنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ فکر و تردّد کی حامل ہے۔ وہ محض واقعات کا غیر جانبدار اور بے حِس شاہد ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی ہمدردی اس کی فطرت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُس کا اعتقاد ہے کہ "ظرافت" اور "رقّت طرازی" زندگی کا تار و پود ہیں اور ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات دِل پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔" (ح-ل)

وہ پیدائشی اندھا تھا۔ اُس وقت سے لے کر جب اُس کی محروم بصارت آنکھیں جن کی گہرائی میں بچپن کی معصومانہ بے بسی اور بے چارگی جھلک رہی تھی، ماں کے چہرے پر پہلی دفعہ پڑتی ہوئی دکھائی دیں، وہ اپنی تنہائی کے لمحے تاریکی کی ایک بھیانک دنیا میں بسر کرتا رہا، لیکن یہ کوئی موروثی عارضہ نہ تھا جس نے اُسے گہوارۂ طفلی سے لے کر آغوشِ لحد تک اپنی زندگی کے دِن رنج و غم کے اُس ناگزیر عالم میں بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس میں روشنی کا گذر تک نہ تھا۔ اُس کی ماں کسانوں کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، وہ ایک خوبصورت سیم تن اور سلیم الطبع عورت تھی جس کی آنکھیں نیلی اور ٹھوڑی عمیق تھی۔ اُس کا باپ ایک قدیم عالی خاندان کا فرد تھا جس کی شہرت پر کبھی بے بصری کا بدنما دھبّا نہیں آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ دردناک مصیبت فطرت کے اُن ناقابلِ فہم اور بعید از قیاس واقعات میں سے ہے جو سائنس کی محیّر العقول تحقیقات کا مضحکہ اڑانے کے لئے وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں +

لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ وہ اندھا تھا +

اُس کے لئے سُورج کی نرم روشنی حرارت کے زندگی بخش احساس سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اُس کے ذہن میں پُھول کا تصوّر ایک دلنشین مہک تک محدود تھا۔ اُس کے احباب چند ہمدردانہ آوازوں اور نگاہوں سے اوجھل جسموں پر مشتمل تھے جن کے ہاتھوں اور ہونٹوں کا لمس اُسے پیغامِ محبت دیتا تھا اور جن کی آنکھوں سے کبھی کبھی گرم آنسو ڈھلک کر اُس کے کُملائے عارض کو پژمردہ کر دیتے تھے۔ اُس کی تاریک دُنیا اُن صبر آزما تکلیفوں اور شدید رُکاوٹوں سے معمور تھی جو اُس کے جسم کو چُور چُور کئے دیتی تھیں شور و غل سے دل میں خلش پیدا ہوتی تھی۔ اس کی حسّاس انگلیاں چیزوں کی ناملائم سطحوں کو مس نہیں کر سکتی تھیں۔ روشنی اور تاریکی، دن اور رات، رنگ اور صُورت، فاصلہ اور تناسب، خوبصورتی اور بدصُورتی، یہ ایسے الفاظ تھے جو کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوئے تھے

اگر روپیہ سے مراد دولت ہے تو وہ متمول بھی تھا۔ لیکن ذاتی ضروریات کی بہ نسبت اپنی ماں اور بہن کے آرام و آسائش کیلئے وہ زیادہ فراخ دلی سے خرچ کرتا تھا۔ اُس کا باپ جس کے دل میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بڑی بڑی آرزوئیں تھیں، اس کے عہدِ طفلی ہی میں مایوس ہو کر مر چکا تھا۔ بچّہ ہوتے ہوتے حسین اور تنومند نوجوان ہو گیا اور آخر کار ایک زبردست اور مضبوط انسان بنا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش طبع اور رقیق القلب آدمی تھا جس کے جسم میں قوی روح اور پہلو میں دردمند دل تھا۔ موسیقی جو اس کی زندگی کا سرمایۂ ناز تھی اس کے تاریک ترین لمحوں کو تسکین آمیز اور تسلی بخش تانوں سے روشن کرتی، اور انتہائی یاس کے وقت اس کے زخم رسیدہ دل کے لئے مرہم کا کام دیتی۔ جب وہ گاتا تو اس کی آواز بانسری کی سُریلی آواز معلوم ہوتی، اس کے علاوہ پیانو، آرگن، بربط اور وائلن خوب بجاتا تھا، اُسے ادبیات کا صحیح ذوق تھا، اور اوائل عمر ہی میں اس نے اپنے آپ کو رومان کی طلسمی دنیا سے آزاد کر لیا تھا، اچھی صحبت، عمدہ شراب، لذیذ کھانے، تحمّل، دل کے اتھاہ سمندر سے لہروں کی طرح اُمنڈتی ہوئی ہنسی، حقیقی دلسوزی اور غیر مصنوعی ہمدردی۔ غرضیکہ انقلاب آبادِ عالم کی ہر چیز میں وہ بے حد سرور حاصل کرتا تھا۔ وہ ایک مکمل انسان تھا اور اکثر خوش رہتا تھا، ہاں کبھی کبھی اس کی دائمی تکلیف کوئی ناگوار مزاحمت پیدا کر کے اُس کے دل میں کمزوری کا ہلاکت انگیز احساس از سرِ نو تازہ کر دیتی تھی۔

وہ زیادہ تر سمندر کے کنارے ایک پُرانے مکان میں رہتا تھا۔ مد و جزر کے راگ، اور پانی کی ملاحت آمیز شیرینی سے لُطف اندوز ہوتا تھا، شہروں سے خوف کھاتا تھا اگرچہ اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا، گھروں میں اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا گلیوں میں آمد و رفت کا لا متناہی شور اس کے خوف زدہ کانوں کے لئے ایک عذاب تھا اور بدبُو سے ناک میں دم آتا تھا+

کبھی کبھی وہ پہاڑوں پر بھی جا کر رہتا تھا۔ پہلے پہل فطرت کی ان غیر فانی اور استوار یادگاروں کا جادو دائی سکون اُس کی بیقرار قوتِ حس کو تسکین دیتا رہا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ اس بے لطف اور غیر دلچسپ خاموشی سے تنگ آگیا، وہ تنہائی سے گھبرانے لگا کیونکہ اب اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے پوشیدہ خیالات جرس کی دُور دراز اور مبہم آواز کی طرح اُس کے کانوں میں گونج رہے ہیں، پس وہ دوبارہ سمندر پر جانے کے لئے مجبور ہو گیا، موجوں کے تلاطم، ساحل سے ٹکرا کر واپس جاتی ہوئی لہروں کے جلترنگ اور روئی کے گالوں کی طرح اُڑ کر چہرے پر پڑتے ہوئے خنک جھاگ سے پھر وہی اطمینان حاصل ہوا+

اس طرح اس کی زندگی کے چوبیس برس گزر گئے، لیکن اس دَوران میں کوئی خاص واقعہ نمودار نہ ہوا، وہ زمین، آسمان، اور سمندر کے عجائبات دیکھنے سے بالکل مایوس ہو چکا تھا، بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرینِ امراضِ چشم اس فطرتی نقص کی وجہ دریافت کرنے کے لئے آ چکے تھے، لیکن سب اس بات پر متفق ہو کر واپس چلے گئے تھے کہ اُس کی بیماری انسانی عقل سے بالاتر ہے! وہ اپنے اعزّہ و اقارب کی خاطر جیل و حجّت کے بغیر اپنے آپ کو ان یاس انگیز آزمائشوں کے سپرد کرتا رہا۔ لیکن آخر کار اُس سے

دل میں کوئی اُمید باقی نہ رہی، وہ کمزور انسان نہیں تھا، قوی دل تھا، اس لئے اب اُس نے محسوس کیا کہ جھوٹی امیدوں کے فریب میں آنا نا اُمیدی کو دعوت دینا ہے، اور اطمینانِ قلب صرف تسلیم و رضا ہی میں حاصل ہو سکتا ہے"۔

جب پچیس برس کا ہُوا تو اُس نے سُنا کہ اٹلی میں ایک ڈاکٹر ہے جو بہت سے پیدائشی اندھوں کو بینا کر چکا ہے۔ اُس نے اپنے ایک معتبر دوست وانی ہین کو جو خود امراضِ چشم کا ماہر تھا اس خبر کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے اٹلی بھیجا۔

واپس آکر وانی ہین نے کہا "پریرا کوئی اتنا اچھا آدمی نہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ خاص قابلیت کا ڈاکٹر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حاسد معاصرین دنیا کے سامنے اُسے معمولی حیثیت میں پیش کر رہے ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے . . . . "

اس کے بعد اس نے اطالوی ڈاکٹر کے طبی معجزے بیان کرنے شروع کئے "وہ فرڈی ننڈ کا علاج کرنے کے لئے تیار ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ"!

"وہ کیا؟" ماں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کہتا ہے کہ اگر فرڈی ننڈ واقعی پیدائشی اندھا ہے تو میں اس کی صحت یابی کی کوئی اُمید نہیں دلا سکتا"۔

اس موقعہ پر عورتوں کے آرزومند چہرے یاس کی تصویریں بن کر رہ گئے۔

"ہاں ——— وہ پیدائشی اندھا ہے" ماں نے رُک رُک کر کہا۔

"پریرا اگرچہ اُس نے فرڈی ننڈ کو نہیں دیکھا) کہتا ہے کہ غالباً ایسا نہیں ہُوا ہوگا۔ اس کا خیال ہے اور مجھے خود اس کا یقین ہے کہ انسان کا اندھا پیدا ہونا نادر ترین واقعات سے ہے، اُس کے قیاس کے مطابق فرڈی ننڈ بینا رہ چکا ہے، خواہ پیدائش کے بعد صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی کیوں نہ ہو"۔

"دراصل ہمیں بھی اس بات کی خبر نہیں تھی، مجھے خود دو روز تک اس دردانگیز حقیقت کا گمان تک بھی نہ تھا، اور اس عرصہ میں میری نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی رہیں"۔

"پریرا اپنی خدمات کو تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہے" وانی ہین نے کہا "اور اتنے بڑے آدمی کے لئے یہ بات بہت غیر معمولی ہے لیکن میرے خیال میں وہ کچھ طامع ہے، گذشتہ ایام میں وہ بڑی مصیبت میں مبتلا رہا ہے، اور آج کل جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، غیر معتقد اور بے وقوف لوگوں کی ایک کثیر تعداد اس پر ہنس رہی ہے جس کی وجہ سے اُس کی زندگی تلخ ہوگئی ہے"۔

"اگر وہ فرڈی ننڈ کو تندرست کردے تو ہر ممکن طریقہ سے ہم اس کی امداد کے لئے تیار ہیں" ماں نے کہا "فوراً اُسے تار دے دو۔ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہُوا۔ تو نقصان تو نہ ہوگا"۔

اطالوی ڈاکٹر کو پیغام بھیجا گیا، ماں اور بہن اس کے علاج کے لئے تیاریاں کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

"کیا ابھی کوئی اور ڈاکٹر ہے؟" فرڈی ننڈ نے حیرت زدہ ہو کر غم آمیز ہنسی سے دریافت کیا، "میرا خیال تھا کہ اب اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے"۔

لیکن جب دو ہفتہ کے بعد پریرا آیا تو اپنے آپ کو انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ اُس نے اِس معجزہ گر کے سپرد کر دیا۔

ابتدائی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا "صحت یابی کا بہت امکان ہے"۔ اس کے بعد اُس نے ایک علمی تقریر شروع کی جس میں چند غیر مانوس طبی اصطلاحیں تھیں۔ فرڈی ننڈ اُن کی تکرار سے تنگ آ گیا، لیکن اس کے باوجود پریرا نے اس کے دِل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ ڈینگ نہیں مارتا تھا اور نہ اُسے غیب دانی کا دعویٰ تھا، اُسے کامیابی کا کامل یقین نہ تھا آخر اس نے اپنی گفتگو کو ان الفاظ پر ختم کیا "معاف کرنا، مجھے اُمید ہے کہ تم ایسے آدمی نہیں کہ اگر تمہارے متعلق کوئی سچی بات کہی جائے تو برداشت نہ کرسکو"۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے" فرڈی ننڈ نے کہا۔

"کیا تم اُس مایوسی کو برداشت کرسکو گے؟"

"ہاں۔ اس سے پہلے میں اکثر برداشت کرتا رہا ہوں"۔

پھر ڈاکٹر نے کہا "میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بصارت ٹھیک ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ——————"

اب وہ ذرا خاموش ہو گیا۔

"ہاں کہئے؟" فرڈی ننڈ نے جواب دیا'

"میں تم سے حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا، اور وہ یہ کہ تمہاری صحت یابی کے صرف عارضی ہونے کا امکان بھی ہے، اطالوی نے ایک تازہ بحث چھیڑ دی، مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ بینائی ٹھیک ہو جائے گی لیکن ممکن ہے یہ صرف تھوڑے عرصہ کے لئے ہو، کیا تم یہ برداشت کرسکو گے؟"

"بہت مشکل ہے" فرڈی ننڈ نے جواب دیا "لیکن خیر میں برداشت کر لوں گا"

"تم میری بات کو اچھی طرح سمجھتے ہو" اطالوی نے کہا "تم جانتے ہو کہ عارضی بینائی کا کیا مطلب ہے؟ موجودہ حالت میں تمہیں محرومیِ بصارت کا پورا مفہوم معلوم نہیں، کیونکہ تم نے اپنی آنکھوں کا مطلق استعمال نہیں کیا، لیکن اگر تم اچانک دیکھنے لگ جاؤ خواہ وہ چند گھنٹوں کے لئے ہو یا چند لمحوں کے لئے، اور اس کے بعد پھر اندھے ہو جاؤ، ہمیشہ کیلئے نابینا ——"

وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کی خاموشی معنی خیز تھی'

اُس کے ہاتھوں کو پٹیاں کھولنے سے باز رکھا، زندگی میں پہلی دفعہ انسانوں کی عجیب وغریب دُنیا کو دیکھ کر خُدا جانے اس پر کیا گزرے، یا اس کے برعکس آنکھوں کے نابینا ہونے کا ناقابلِ برداشت صدمہ بچانے اس کے دل پر کیا اثر کرے!

ماں اور بہن اُس کے تشریح طلب تامل پر حیرت زدہ ہو کر بے صبری سے کسی بات کا انتظار کر رہی تھیں۔

"نہیں" اُس نے آہستہ سے کہا" میں یہ جرأت نہیں کر سکتا، مجھے ـــــــ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ماں! آہ، بہتر تھا کہ میں اس خطرناک آزمائش میں نہ پڑتا، اس سے پہلے میں خوش تھا، ہر طرح سے بالکل خوش! لیکن اگر ان سب کوششوں کے باوجود میری قسمت میں اندھیری دُنیا ہے، تو میں کبھی خوش نہیں ہو سکوں گا"

اُس کی ماں نے اپنا ہاتھ تسکین کے طور پر اس کے سر پر رکھا، اُس نے اُسے پکڑ کر چوما۔

"یہی میری تباہی کا باعث ہے" اس نے ماں کے ہاتھ کو چھوتے ہوئے کہا" ایملی اور تم میری جوانی کو برباد کر رہی ہو" اس نے اپنا سر جھکا لیا اور سوچنے لگ گیا" میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ بات مجھ پر اب کیا اثر کر رہی ہے۔ اس نے گنگناتے ہوئے کہا جیسے وہ اپنے جی سے باتیں کر رہا ہو۔ "تم موہوم طور پر بھی یہ نہیں جانتیں کہ میرے لئے اس کا کیا مطلب ہے نہیں۔ تم کیسے جان سکتی ہو، میں نے تمہیں پرندوں، پھولوں، رنگوں، چلتی پھرتی چیزوں، بچوں، سورج، چاند، ستاروں اور سمندر کا ذکر کرتے سُنا ہے۔ لیکن آہ، میں اس قدیم سمندر کو پہچان سکتا ہوں اس کی آواز سُن سکتا ہوں، میں اس سے کبھی خوف نہیں کھاؤں گا لیکن ماں ـــــــ ذرا سوچو تو سہی" یہ کہہ کر وہ کانپتا ہوا کرسی پر جا گرا" شاید میں اسے برداشت نہ کر سکوں، لیکن اگر مجھے ایک انسان کی طرح یہ سب کچھ سہنا ہے" تھوڑے سے وقفہ کے بعد اس نے اُمید افزا لہجہ میں کہا" تو تنہائی میں سہنا پسند کروں گا"

"تنہائی میں!" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں نہیں! ـــ تنہائی میں انسان بہترین طور پر دُعا کر سکتا ہے اور خدا کے نزدیک ترین ہوتا ہے۔ اس لئے میں تنہائی پسند کرتا ہوں، کچھ عرصہ ہوا میں نے دُعا کی تھی اور یہ آوازِ غیب اُس کا جواب ہے۔ خُدا کو یہی منظور ہے کہ میں اس سختی کو اکیلا جھیلوں ـــ ہاں ـــ ہاں" اس نے آہستہ سے کہا" یہ بہترین طریقہ ہے، اور میں نے اب اس کا مصمم ارادہ کر لیا ہے ماں اور ایملی! اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں صرف اسی طرح اپنی ہمت اور جرأت کے امتحان کا مقابلہ کر سکتا ہوں"

وہ اُس کو چمٹ گئیں، اور بہت گریہ وزاری کی کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ہر چند اس بات کی التجا کی کہ وہ انہیں اپنے پاس رہنے دے لیکن اُس نے ایک نہ مانی، اُن کے آنسو اور نیازمندانہ منتیں رائگاں ثابت ہوئیں۔

"میں اکیلا رہوں گا" اس نے رُوکھے پن سے کہا" جب تک پہلی مرتبہ تمہارے پیارے چہرے دیکھنے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ میں اکیلا رہوں گا جب تک میں نہ کہوں تمہیں یہاں نہیں آنا ہوگا، تمہیں دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے میں

اِسے تالا لگا دُونگا تمہیں انتظار کرنا پڑے گا (خیال کرو میں نے کتنا عرصہ انتظار کیا ہے!) جب تک میں خود نہ بلاؤں!"

"لیکن، فرڈی ننڈ ————" ماں نے پھر التجا کی۔

"ماں"! اس نے ذرا تلخی سے جواب دیا "کیا آپ سب مجھے اپنے سامنے شرمسار کرنا چاہتی ہیں؛ میرے رونے اور کراہنے سے کسی کو کیا مطلب؛ میں نہیں چاہتا کہ جن لوگوں کو مجھ سے ذرا بھی محبت ہے، وہ اپنی آنکھوں سے مجھے دکھ اور تکلیف میں دیکھیں نہیں۔ میں اکیلا رہوں گا۔ یہ ملاقات ہم سب کے لئے رنجدہ ہے، اب ہمیں جدا ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو ساری طاقت اسی جھگڑے میں ختم ہو جائے"

وہ اُس کی مرضی کے آگے جھک جانے کی اس قدر عادی تھیں کہ اُس کے الفاظ سُنتے ہی فوراً علیحدہ ہو گئیں۔ وہ دروازے تک اُن کے پیچھے پیچھے گیا، جب وہ چلی گئیں تو اُس نے بند کر کے تالا لگا دیا۔

"یاد رکھو! جب تک میں طلب نہ کروں" اُن کے جانے کے بعد یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

جب اُس نے اپنے آپ کو تنہا پایا تو فوراً پٹیاں کھینچنی شروع کر دیں، لیکن اُس کی اُنگلیاں کانپتی تھیں، اور ہاتھ کمزور تھے، اس لئے پہلی کوشش میں وہ پٹیاں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکا، وہ جس نے پچیس برس تک صبر و استقلال کے ساتھ زندگی بسر کی تھی اب اضطراب اور بےچینی سے کراہنے لگا۔ اس کشمکش کے دوران میں اُس کا سر کمرے کی کسی چیز سے ٹکرا گیا، اور وہ درد کے مارے بچوں کی طرح رونے لگا حالانکہ وہ معمولی تکلیفوں کی پروا نہیں کیا کرتا تھا،

آخر کار اُس نے پٹیاں کھول ڈالیں۔

اس کے بعد ایک مبہم سی چیخ سنائی دی۔

وہ دیکھ سکتا تھا!

اُس کے پپوٹے جو بُری طرح سے زخمی تھے، اوپر نیچے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، وہ اس قدر سخت ہو چکے تھے کہ ہلنے سے کڑکڑانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی، لیکن وہ دیکھتا تھا! ———— وہ دیکھ رہا تھا! اس دل افروز اور حیرت انگیز حقیقت میں کوئی شک نہ تھا، وہ دیکھ رہا تھا!

پہلے اُسے ایک ہلکا سا دھندلکا دکھائی دیا جس میں بھورے رنگ کی بڑی بڑی بے سر و پا اور بے ڈول شکلیں آہستہ آہستہ بہ رہی تھیں، جب اس کی نظر ذرا صاف ہو گئی تو یہ اور بھی واضح ہو گئیں۔ اُن میں ایک قسم کا امتزاج پیدا ہو گیا، ہوتے ہوتے یہ ایسے اجسام میں تبدیل ہو گئیں جو قوت لامسہ سے محسوس کئے جا سکتے تھے۔

اُس کا سر چکرانے لگا اور پاؤں ڈگمگانے لگے، اُن بےشمار آفتوں سے بچنے کے لئے جو اُسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے

تھیں اُس نے بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے، اب وہ کھڑکی کی آڑ میں ایک چھوٹی سی چوکی پر گر پڑا اور ڈر کے مارے اکٹھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ بے حد خائف تھا، لیکن جیسا کہ اُسے پہلے سے ہی خطرہ تھا، انتہائے یاس نے اُسے بالکل نڈر بنا دیا تھا، وہ دروازے کی طرف دوڑنے کے لئے بے قرار تھا، لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اردگرد کے عجائبات میں سے کونسی چیز دروازہ ہے، وہ چاہتا تھا کہ ماں اور بہن کو بُلانے کے لئے اُسے کھٹکھٹائے، اور زور سے چلّائے، اگر افسردگی کی ایک زبردست لہر اعضا کو بے حس کر کے اُسے اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے مجبور نہ کر دیتی تو وہ اس بے چینی کی حالت میں دروازے کی طرف دوڑ کر ہمیشہ کے لئے خود داری سے ہاتھ دھو بیٹھتا، لیکن اب اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا کہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کو حیرت زدہ ہو کر دیکھے اور اپنی رگوں میں خون کے کھولنے اور دل کی تیز اور بے پناہ دھڑکن کی آوازیں سُنتا رہے۔

فضا پُرسکون تھی، مطلع ابر آلود تھا، سمندر اور آسمان دونوں دُھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے، صرف ساحل کا ایک تکونی حصّہ جہاں پاؤں تلے روندی ہوئی سیاہ ریت کے تودوں کے سوا کچھ نہ تھا، کھڑکی میں سے نظر آ رہا تھا، ایک جہاز بادبانوں کو پوری طرح پھیلائے ہوئے سامنے سے گذرا، وہ اس کی ہئیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیا یہ پرندہ ہے؟ پھر اُس نے مرغابیوں کا ایک جھنڈ دیکھا، میلے اور گرد و غبار میں اٹے ہوئے آسمان کے بالمقابل سیاہ دھبّے! لیکن وہ سفید، تیرتی ہوئی بلند چیز کیا ہے؟ ناواقف کتابی کیڑوں کی طرح جہازوں کے متعلق اُسے سب خیالی معلومات حاصل تھیں۔ لیکن وہ اس جہاز کو بالکل نہ پہچان سکا۔ اگرچہ تصوّر میں کئی بار اس نے جہاز کو آندھی سے بچانے کے لئے بادبانوں کو لپیٹا ہو گا۔

لمحۂ انکشاف کے اس مختصر عرصہ میں اُس کی دُنیا کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔

اُس کا خوف سُرعت کے ساتھ دُور ہو رہا تھا، اس کی بے حسی ختم ہو چکی تھی، لیکن اب ماں اور بہن کو اپنے پاس بُلانے کی کوئی خواہش نہ تھی، قوائے حس پر مسرت کا پُرجوش مگر دُنیا جہان سے بے نیاز کر دینے والا احساس غالب آ چکا تھا، دماغ ناکارہ ہو چکا تھا قوّتِ فکر نے جواب دے دیا تھا، وہ اپنے ابتدائی تاثرات کو منضبط نہیں کر سکتا تھا، یہاں تک کہ اس کے بعد بھی وہ انہیں کبھی بیان نہ کر سکا۔

ایک اخبار ہوا کے جھونکے سے اُڑ کر اُس کے سامنے سے گزرا، کیا یہ آدمی ہے؟ وہ حیران تھا! پانی کے چڑھاؤ سے بل کھاتی ہوئی موجیں ریتلے کنارے سے ٹکرا کر بالائی سے جھاگ میں تبدیل ہو رہی تھیں اور اُن کی آواز اُس کے کانوں میں صاف طور پر آ رہی تھی، اُس نے سمندر کو پہچان لیا! لیکن کیا سمندر صرف ان تھپیڑے کھاتی ہوئی کف در دہاں لہروں کے سلسلے کا نام ہے یا اس میں وہ ناپیدا کنار اور قلابازیاں کھاتی ہوئی وسیع سطح بھی شامل ہے جو پہلے اوپر کو چڑھتی ہے پھر دُور جا کر ارغوانی اُفق

میں غائب ہوجاتی ہے، اس کے بعد رنگ بدل کر گنبدوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے اور زمین و آسمان کو نیم رنگین اور غبار آمیز دُھند سے معمور کر دیتی ہے!

ایک پتلا سا کمزور لڑکا بالو پر دوڑتا ہوا دکھائی دیا، اور روپوش ہوگیا! کیا وہ آدمی ہے؛ وہ پھر کانپنے لگا۔

اُس کے دل میں آئینہ کا کوئی تصور نہ تھا۔ اور اگر وہ اُسے دیکھنا بھی چاہتا تو ایسا نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ پریرا نے اپنی عام ہدایات میں اس بات پر غیر معمولی زور دیا تھا کہ جب تک فرڈی ننڈ اپنی نو یافتہ حس کو اچھی طرح استعمال کرنے کا عادی نہ ہو جائے اور اشیاء کے باہمی فاصلوں اور انتشارِ نور کے ابتدائی اصولوں کو نہ سمجھے اُسے دیر تک آئینہ دیکھنے کی اجازت نہ دی جائے، پریرا نے اکثر آدمیوں کو آئینہ پر پہلی دفعہ نظر ڈالنے سے دیوانہ ہوتے ہوئے سنا تھا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بھی ایسا دیکھا تھا!

اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا،

اب اُس کی ماں جس کی پریشانی دیگر خیالات پر سبقت لے جا رہی تھی دبے پاؤں دروازے کے پاس آئی، اور آہستہ سے کھٹکھٹانا شروع کیا، اس نے آواز سُنی اور مطلب سمجھ گیا، اب اُسے معلوم ہوگیا کہ یہ دروازہ ہے۔ وہ اُسے غور اور تعجب سے دیکھنے لگا، کیونکہ یہ پہلا راز تھا جو شعور کی حالت میں اُس پر کھلا، ماں نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا اور اُس نے آواز پہچان لی۔

"نہیں۔ ابھی نہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دیکھ سکتا ہوں" اس نے ماں کو فرطِ انبساط میں چیخ مارتے ہوئے سُنا "لیکن ـــــ ابھی نہیں"۔

جب وہ چلی گئی اور اُس کے پاؤں کی آہٹ بھی جاتی رہی تو وہ احتیاط سے اُٹھا اور سیدھا کھڑا ہوگیا، لیکن وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا، وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور گھسٹتا ہوا صوفے کی طرف چلا گیا، اور وہاں ٹھٹک کر بیٹھ گیا، اب اُس پر ایک نیا خوف طاری ہو رہا تھا،

خوف پھر جاتا رہا، اس نے پہلے ہی یہ سب کچھ سوچ رکھا تھا، اس لئے اب قطعاً بے ہراس تھا، جب تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا بالکل محفوظ تھا، صحیح الحواسی اس کی رعشہ براندامی پر ہنسنے لگی۔ اب اُس کے ہوش و حواس ٹھکانے ہو رہے تھے، اگر اس کی جگہ کوئی کمزور دل اور غیر مستقل مزاج آدمی ہوتا تو ان اوہام کے اثرات سے کبھی جانبر نہ ہو سکتا، لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زندگی کے اس نازک ترین وقت میں اگر وہ لمحے بھر کے لئے بھی کمزوری کا ثبوت دے گا تو ممکن ہے کہ بصیرت اور شعور سے بھی محروم ہو جائے، اُسے معلوم تھا کہ یہ محرومی بے بصری سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

جس طرح آفتاب زدہ پھولوں پر آہستہ آہستہ اوس پڑنے لگتی ہے اسی طرح اس کی رُوح پر امن اور تسکین کی فرحت افزا بارش

شروع ہوئی۔ جب اس معجزے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اُسے مکمل احساس ہوا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

اُس کی کنپٹیاں تپک رہی تھیں، حلق کوئلے کی طرح خشک تھا، سانس دانتوں میں سے سیٹیاں بجاتا ہوا باہر آتا تھا، اور سینے میں پھیپھڑوں کے گڑگڑانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

ماں نے پھر دروازے پر دستک دی۔ اور اس نے پھر وہی جواب دیا، "نہیں ——— ابھی تھوڑی سی دیر ہے"۔

اس نے ماں کو انتہائی محبت کے ساتھ اپنا نام گنگناتے ہوئے سُنا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ابھی اُسے دیکھنے کا مناسب وقت نہیں آیا، نجانے پیاری اور خوبصورت ماں کا پہلا نظارہ اس پر کیا اثر کرے، اس آنے والی خوشی کے تصور سے اُس کا دل دہلتا تھا۔

ایک دفعہ پھر اس نے سمندر اور آسمان کو حیرت زدہ ہو کر دیکھنا شروع کیا،

تقریباً دو گھنٹے اس از خود رفتگی کی حالت میں گزر گئے۔ نئی حس کی ہولناک تیزی کچھ کم ہو گئی تھی اسرت کے احساس نے اس کی قوتِ ارادی کو معطل کر دیا تھا، چنانچہ نقاہت کی وجہ سے صوفے میں دُبک کر بیٹھ گیا، اُس کی ماں دو دفعہ اور دروازہ کھٹکھٹا چکی تھی، لیکن وہ نہایت سرد مہری سے اُسے ناکام واپس بھیجتا رہا۔ وہ ہر مرتبہ بے دلی سے اس کا حکم مانتی رہی، اور آخری بار اس ظلم کی بنا پر اس نے نرڈ می نند کو بُرا بھلا بھی کہا تھا۔

"اگلی دفعہ" اس نے اپنے جی میں کہا۔ اور فرطِ شوق سے مسکرایا، لیکن اُس کے چہرے سے مسکراہٹ جلدی غائب ہو گئی، جیسے کسی تازہ صدمہ سے!

یہ کیا تھا ؛

اُس نے اپنے دونو ہاتھ اُٹھائے اور آنکھیں ملنے لگ گیا، ان میں درد اور جلن تھی، وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور بیرونی منظر کو ٹکٹکی باندھ کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیا اُس کے دوبارہ نابینا ہو جانے کا امکان تھا؟ اس نے اپنے جلتے ہوئے پپوٹوں کو بند کیا اور پھر کھولا، سمندر اور آسمان کی ہم آہنگ سیاہی مائل رنگت مدھم پڑ چکی تھی، چیزیں ظاہری شکل و صورت میں دھندلی اور موہوم ہو رہی تھیں۔ اب اُسے اس بات میں کوئی شک نہ تھا، کچھ عرصہ پہلے ریتے پر گھاس کا ایک سرسبز قطعہ اُسے صاف طور پر نظر آ رہا تھا، لیکن اب بالکل بے رنگ ہو گیا تھا، اور تاریک میدان پر ایک نامعلوم دھبے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا، اور وہ اُٹھتی ہوئی موجیں! اُن کا یکساں اُتار چڑھاؤ، بڑھتی ہوئی تیزی، اور کنارے سے ٹکرا کر اچانک جھاگ میں تبدیل ہونا، وہ یہ سب باتیں دیکھ چکا تھا، لیکن اب ———

وہ صوفے سے کمر لگائے خاموش ہو کر لیٹا رہا، اُس کی آنکھیں مضطربانہ انداز میں کمرے کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں، دیواری کاغذوں اور غالیچوں کے نقش و نگار، دروازے کے منقش پردے، چھت اور سامانِ آرائش سب غیر محسوس طور پر

مانند پڑ رہے تھے ۔

پھر اُسے اطالوی ڈاکٹر کی تنبیہ یاد آگئی، کہ ممکن ہے میری بصارت صرف عارضی طور پر بحال ہو! "شاید چند گھنٹوں کے لئے یا صرف چند لمحوں کے لئے!" خوشی کی ترنگ میں وہ اس بات کے یاس آفرین امکان کو بھول چکا تھا، اب یہ اندوہناک حقیقت ایک سیاہ اور غم انگیز بادل بن کر اُس پر چھا رہی تھی، اُس کی اُمیدیں خاک میں مل رہی تھیں، زرّیں مستقبل کے خوابوں کی تعبیر اُس کے سامنے تھی! وہ اپنے آپ کو تاریکی کے سپرد کرنے گا؟ کیا وہ پھر اُسی اندھیری دُنیا میں چلا جائے گا؟ اس دُنیا کی ایک جھلک اور بس! زمین کے اسرار و عجائب کے انکشاف کا ایک مختصر وقفہ اور پھر موت تک گہرا اندھیرا!

وہ درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اُس کی آنکھیں جلدی جلدی روشنی کھو رہی تھیں، بختِ ناساز گار عیش و راحت کی زندگی سے لذت آشنا کرنے کے بعد اسے عین کامگاری کے وقت اس نعمت سے مایوس کر رہا تھا، اس ناقابلِ بیان ستم ظریفی اور ناساعدت پر اُس کی رُوح کی گہرائی سے بددُعائیں نکلنے لگیں ۔

اُس نے زور سے ایک چیخ ماری، اُٹھا اور بے دھڑک ہو کر بڑھتی ہوئی تاریکی میں جس سے وہ مدتوں آشنا رہا تھا، دروازے کا راستہ ٹٹولنا شروع کیا، آخر چابی پھیری اور کواڑ کھول دیئے، اُس کی دردانگیز آواز مہیب خاموشی میں گونجتی ہوئی سنائی دی ۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

ہوش میں آیا تو اُس نے سمجھا کہ میں یقیناً موت کی سرحد سے گزر چکا ہوں اور قبر کے اُس پار کی دُنیا میں آباد ہوں ۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بینائی پھر درست ہوگئی ہے ۔ اگرچہ معمولی سے بالکل مختلف طور پر، ایک ہلکی سی سنہری ٹمٹماہٹ اور اور ایک نرالی اور دلنشیں چمک سے فضا معمور ہوگئی، ماں کا چہرہ جو اُسے صرف ایک پُرہول شکل بن کر دکھائی دے رہا تھا، اُس کے سامنے تھا،

"پیارے! اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں ۔ اب میں مر چکا ہوں اور پھر اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہوگیا ہوں" اس نے جواب دیا ۔ ماں نے جھک کر اُسے چوما ۔

"پیارے فرڈی ننڈ!" اس نے آہستہ سے کہا "تم زندہ ہو ۔ تم ابھی اُسی رنگین پرانی دُنیا میں ہو ۔ تم ــــــ نہیں، نہیں، تمہیں شک نہیں کرنا چاہیئے، ہم پر اعتبار کرو ۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں تم کو اِس کام کے لئے تیار رکھنا چاہئے تھا ــــــ لیکن ہم پیشین گوئی کیسے کر سکتے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں دیکھ سکتا تھا" اُس نے آہستہ سے کہا "لیکن شاید وہ ایک خواب تھا، اور اب میں دوبارہ اندھا ہو گیا ہوں"۔

"نہیں" اُس نے چلّا کر کہا" تم اب بھی دیکھ سکتے ہو۔ اور تم آئندہ بھی ہمیشہ کے لئے دیکھ سکو گے"۔ پیچھے سے والدین کی آواز آئی۔

"ہاں" ماں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا" اب ہمیشہ کے لئے تمہاری نظر درست ہو گئی ہے۔ یہ غلط ہے کہ بے بصری لوٹ آئی ہے۔ میں نہیں کس طرح سمجھا سکتی ہوں، اُس وقت شام ہو رہی تھی، قاعدہ ہے کہ جُوں جُوں رات نزدیک آتی ہے روشنی زائل ہوتی جاتی ہے اور روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیارے! یہ وہ سماں تھا جس کو "دونو وقت ملتے ہیں" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں"!

بہت سے گھنٹے گزر گئے، تب کہیں جا کر یہ بات اُس کی سمجھ میں آئی، لیکن وہ بھی نامکمل طور پر!

(حفیظ ہوشیارپوری)

میں نے دیکھا دیکھتی آنکھوں
چہکنے والی چڑیاں پیاری پیاری
دوکانوں میں بکتی
لوگوں کے کھانے کو
بکتی، دوکانوں میں
حماقت بازار کی!
میں نے دیکھا خواب میں
گیہوں میں کیڑا
اور دوکانوں میں کچھ نہیں
لوگوں کے کھانے کو
دوکانیں خالی
حماقت بازار کی!

گلچیں

غزل

پھر مہرباں ہو کے پریشاں نہ کیجیے
اب میری مشکلات کو آساں نہ کیجیے

اب مسکرا کے شرم سے آنکھیں نہ پھیریے
ذوقِ وفا کو اور پریشاں نہ کیجیے

افسردہ دل میں عشق کی وہ آگ اب کہاں
پھر حسرتوں کے داغ فروزاں نہ کیجیے

پھر چشمِ التفات سے مجھ کو نہ دیکھیے
رہ رہ کے پھر تہیۂ پیماں نہ کیجیے

پھر خلوتِ فراق میں ملنے نہ آئیے
اب ہو سکے تو ہمتِ احساں نہ کیجیے

اب دولتِ سکون و تحمل نہ چھینیے
پھر خواہشِ متاعِ دل و جاں نہ کیجیے

پھر کہہ رہی ہیں آپ مسیحا نفس ہوں میں
یوں دلفریب موت کا ساماں نہ کیجیے

اب آ چلا ہے صبر و سکوں کچھ جلالؔ کو
پھر مہرباں ہو کے پریشاں نہ کیجیے

(جلالؔ)

بوڑھے شاہ بلوط کا آخری خواب

جنگل میں ڈھلواں کنارے سے بہت اُوپر اور فراخ ساحل کے قریب شاہ بلوط کا ایک بہت بڑا درخت کھڑا تھا۔ یہ پُورے تین سو پینسٹھ سال کا تھا۔ درخت کے لئے دنوں کی گنتی کی یہ لمبی مُدّت ہو بہُو ویسی ہی تھی جیسی ہمارے لئے ہوسکتی ہے۔ ہم دن کو جاگتے، رات کو سوتے اور خواب دیکھتے ہیں لیکن نیند کے معاملے میں درخت ہم سے مختلف ہے۔ وہ سال کے تین حِصّے برابر جاگتے رہنے پر مجبور ہے اور جاڑا آنے تک ذرا بھی نہیں سو سکتا۔ جاڑا اس کے آرام کا موسم ہے۔ اس کی رات موسم بہار، موسم گرما اور خزاں کے لمبے دن کے بعد ہوتی ہے۔

موسم گرما میں اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ کچھ یک روزہ پتنگے جو دُنیا میں صرف ایک دن کے لئے پیدا ہوتے ہیں زندگی کا لُطف اُٹھاتے اور مسرت محسوس کرتے ہوئے بوڑھے شاہ بلوط کے گرد پھڑپھڑانے لگتے اور اگر لحہ بھر کے لئے اِس چھوٹی مخلوق میں سے کوئی فرد درخت کے بڑے بڑے سرسبز پتوں میں سے کسی پتے پر بیٹھ جاتا تو درخت ہمیشہ بول اُٹھتا "بے چاری ننھی مخلوق! تیری تمام عمر ایک دن پر مشتمل ہے۔ اُف! اس قدر تھوڑی! یقیناً یہ نہایت المناک بات ہے"۔

چھوٹی مخلوق کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا "المناک! تمہارا مطلب کیا ہے۔ میرے آس پاس کی ہر چیز اس قدر حیرت انگیز طور پر چمکدار اور تاباں اور خوبصورت ہے کہ مجھے مگن بنا رہی ہے"۔

درخت کہتا "لیکن صرف ایک دن کے لئے اور پھر فنا"۔

پتنگا جواب دیتا "فنا! فنا کے معنے کیا ہیں؟ کیا تم بھی فنا ہو جاؤ گے"۔

"نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ میں تمہارے اس ایک دن جیسے ہزاروں دنوں تک زندہ رہوں۔ میرا دن تمام موسموں جتنا لمبا ہے۔ یقیناً اس قدر لمبا کہ تم لوگ اس کا حساب کبھی نہیں کرسکتے"۔

"اُونہہ ہوں! تب میں تمہیں نہیں سمجھ سکتا۔ تمہیں میرے ایک دن جیسے ہزاروں دن حاصل ہیں۔ لیکن مجھے اپنے ایک دن میں ہزاروں لمحے ایسے میسّر ہیں جن میں مَیں خوش اور لُطف اندوز ہوسکتا ہوں۔ کیا جب تم مروگے دنیا کی تمام خوبصورتی ختم ہو جائے گی"؟

درخت جواب دیتا "نہیں دنیا کی خوبصورتی ضرور بہت طویل عرصے تک رہے گی بے انتہا طویل عرصے تک جس کا میں خیال

بھی نہیں کر سکتا"۔

ننھا پتنگا کہتا "خوب خوب۔ پھر تو ہمیں جینے کے لئے برابر کا وقت ملا ہے۔ صرف ہم اس کا مختلف طریقہ سے حساب کر رہے ہیں"۔ یہ کہہ کر ننھا پتنگا اپنے نرم و نازک مخملیں بازوؤں سے لطف اُٹھاتے ہوئے ناچتا، اُچھلتا اور ہوا میں تیرتا۔ گھاس کے خوشبودار کھیتوں، جنگلی پھولوں، بڑے بڑے شگوفوں، باغ کی جھاڑیوں، بسنتی گلابوں سے معطر نسیموں اور پودینے وغیرہ کی خوشبو سے تفریح کرتے ہوئے وہ ناچتا، گاتا اور اُڑتا۔ یہ تمام خوشبوئیں اتنی تیز ہوتیں کہ ان کے چھوٹے ننھے پتنگے کو تقریباً مدہوش کر دیتے۔

لمبا اور خوبصورت دن اس قدر شیریں خوشبوؤں اور تفریحوں سے لبریز ہوتا کہ جب سورج ڈوب جاتا تو پتنگا اپنی تمام خوشیوں اور تفریحوں میں تھکان سی محسوس کرنے لگتا۔ اس کے بازو اُسے زیادہ عرصہ تکلیف نہ دے سکتے۔ اور اُسے نرمی اور آہستگی سے نرم نرم گھاس کی لہرائی ہوئی پتیوں پر دھکیل دیتے۔ اس کا ننھا سا سر بہت آسانی سے نیچے کو جھک جاتا اور وہ نہایت امن سے شیریں نیند سو جاتا۔ پتنگا مر چکا ہوتا۔

شاہ بلوط کہتا "آہ غریب چھوٹا کیڑا! اس کی زندگی میں کتنا ہیبت ناک اختصار ہے"۔

یونہی ہر موسم گرما میں ہر روز ننھے پتنگوں کا ناچ ہوتا رہا۔ وہی سوال کئے جاتے وہی جواب دیئے جاتے۔ یکروزہ پتنگوں کے بہت سے خاندانوں میں یہی رسم جاری رہی۔ وہ تمام ایسی ہی خوشی اور ایسی ہی مسرت محسوس کرتے رہے۔

شاہ بلوط موسم بہار کی صبح موسم گرما کی دوپہر اور موسم خزاں کی شام میں برابر جاگتا رہا ——— اب اس کی رات، اُس کے آرام لینے کا وقت قریب آگیا۔ سردیاں آ رہی تھیں۔

آندھیاں پہلے ہی سے گیت گانے لگیں "شب بخیر۔ شب بخیر"۔ کوئی پتّہ ادھر گرتا تھا کوئی پتّہ اُدھر پڑتا تھا۔ آندھیاں بولیں "ہم تجھے جھلائیں گے، تھپک تھپک کر سُلائیں گے، سو جا، سو جا، ہم تیرے لئے خواب آور گیت گائیں گے، تجھے سُلانے کے لئے تھپکیاں دیں گے۔ اس سے تیری پرانی شاخیں اچھی ہو جائیں گی اور فرط خوشی سے کڑکڑائیں گی ——— میٹھی نیند سو جا، میٹھی نیند سو جا۔ یہ تیری تین سو پینسٹھویں رات ہے۔ در حقیقت تو دنیا میں ابھی ایک لونڈا ہی تو ہے۔ میٹھی نیند سو جا۔ بادل تجھ پر برف اُٹھائیں گے جو بالکل ایک گرم رضائی ہوگی تیرے پیروں کو ڈھانپ لینے والی۔ تجھے میٹھی نیند اور سہانے روح افزا خواب مبارک ہوں"۔

اپنے تمام پتے کھو کر اب شاہ بلوط تنہا کھڑا تھا۔ طویل موسم سرما کے دوران میں پوری طرح آرام پانے کے لئے اور بہت سے خواب دیکھنے کے لئے۔ اُن واقعات کے خواب جو اس کی زندگی میں گزر چکے تھے۔ ویسے ہی واقعات جو انسانی خوابوں میں گزرتے ہیں۔

یہ بہت بڑا درخت کسی زمانہ میں بہت چھوٹا سا تھا اور یقیناً شاہ بلوط کے ایک پھل کی صورت میں اپنے شاخوں کے ہنڈولے میں جھولا کرتا تھا ——— لیکن اس وقت وہ انسانی حساب کے مطابق اپنی زندگی کی چوتھی صدی میں سے گزر رہا تھا۔ جنگل میں یہ سب سے بڑا اور عظیم الشان درخت تھا۔ اس کی چوٹی تمام دوسرے درختوں سے اونچی چلی گئی تھی۔ دُور اِسمندر پار سے نظر آسکتی تھی، اُسے دیکھ کر جہاز رانوں کو فوراً پتہ چل جاتا کہ ساحل قریب ہے ——— وہ اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ کس قدر آنکھیں اس کی طرف مشتاقانہ دیکھ چکی تھیں۔

اُس کی اُونچی اُونچی شاخوں میں جنگلی کبوتر اپنے گھونسلے بناتے۔ کوئل کُوک کُوک کر ابدی سوز و ساز کی خدمت بجالاتی۔ کوئل کے مشہور گیتوں کی گونج اُس کی شاخوں سے ٹکراتی ——— اور خزاں میں جب اس کے پتے تانبے کی چمکتی ہوئی تھالیوں کی طرح نظر آنے لگتے، مسافر پرندے آتے اور اپنی سمندر پار کی اُڑان سے پہلے ان شاخوں میں آرام لیتے۔

لیکن اب سردیاں تھیں درخت بے برگ و بار اور عریاں کھڑا تھا۔ تاکہ ہر کوئی دیکھ سکے کہ کتنی ٹیڑھی، بینگی اور جھکی ہوئی شاخیں تنے سے نکل کر آگے کو بڑھ رہی ہیں۔ کوّے چیلیں دَورہ کرتے ہوئے آتے اور ٹیڑھی ٹیڑھی ننگی شاخوں پر بیٹھ جاتے۔ اور اس کٹھن زمانے کے متعلق گفتگو کرتے جس کی ابتدا ہو رہی تھی۔ وہ کہتے "سردیوں میں خوراک حاصل کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہے"۔

کرسمس کے مقدس دنوں میں درخت نے ایک خواب دیکھا! ——— اُس کو کچھ احساس سا ہونے لگا کہ مسرت کا وقت آن پہنچا ہے۔ اپنے خواب کے تصوّر میں اُس نے گرد و نواح کے گرجوں میں گھنٹیاں بجتی سُنیں۔ اُسے یہ دن گرمیوں کا ایک خوبصورت دن معلوم ہوا شیریں اور تاباں دن۔ اُس کی اُونچی اُونچی چوٹیاں سرسبز پتوں اور تازہ پھولوں سے ڈھنپ گئیں۔ سُورج کی کرنیں پتوں اور شاخوں میں کھیل رہی تھیں۔ ہوا پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ رنگین تتلیاں ایک دوسری کا پیچھا کر رہی تھیں۔ فصل ربیع کے پتنگے درخت کے آس پاس یوں ناچنے کودنے لگے گویا خدا نے ناچنا اور خوش ہونا انہیں کے لئے بنایا ہے۔ درخت کی عمر کے ہر سال میں جو جو پُر مسرت ملاقات گذرا کرتے تھے اسے خواب میں تمام دوبارہ گذرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے پُرانے وقتوں کے بہادر سرداروں اور معزز خاتونوں کو جنگل میں اپنے خوبصورت جنگی گھوڑوں پر سوار دیکھا جن کی ٹوپیوں کے طُرّے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور جن کی کلائیوں پر شاہین بیٹھے تھے۔ شکار کے بگل کی آواز سنائی دی اور کُتّے بھونکنے لگے۔ اُس نے نیزوں اور بھالوں والے بہادر جنگ جُوؤں کو رنگین وردیوں اور چمکدار زرہ بکتر میں ملبوس اپنے خیمے لگاتے اور جنگ کرتے دیکھا۔

حفاظت کے نشان کی آگ جابجا روشن ہوئی۔ لوگوں نے گیت گائے اور درخت کے مہمان نواز سائے میں سو گئے۔ اس نے چاندنی رات میں اپنے قریب محبت کرنے والوں کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ملتے اور تنے کی بھوری سبز چھال پر اپنے ناموں کا پہلا حرف کندہ کرتے دیکھا۔

کئی سال گزرے خوشدل راہگیروں نے ہواؤں کے دیوتا کے ستار اور چنگ و رباب اُس کی شاخوں کے ساتھ لٹکائے تھے۔ اب وہ دوبارہ وہاں لٹکے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور وہ اُن کی عجیب و غریب آوازیں سُن سکتا تھا۔ جنگلی کبوتر غرغوں غرغوں کر رہے تھے جیسے وہ درخت کے احساسات کی تشریح کر رہے ہوں۔ اور کوئل اُسے یہ بتانے کے لئے کہ کتنے بہار کے دن ہنوز وہ جیئے گا کوک رہی تھی۔

اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی جڑوں میں، تنے میں رگ رگ اور پتے پتے میں یہانتک کہ بلند ترین شاخوں میں بھی نئی روح بیدار ہو کر سنسناہٹ پیدا کر رہی ہے۔ جب زمین کے اندر جڑوں میں زندگی کی پُرجوش لہر دوڑی درخت نے اپنے آپ کو تنتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ جوں جوں بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ اُونچا ہی اُونچا ہوتا گیا اس کی بلند ترین ٹہنیاں خوب پھیلتی اور پتّوں سے بھرتی گئیں۔ اُس کے جوشِ نمو کی مناسبت سے اس کا دلی اطمینان بہت بڑھ گیا۔ اور ساتھ ہی اس کی رُوح میں بلند سے بلند تر ہو جانے کی دلخوش کُن آرزو اُٹھی تاباں اور درخشاں سُورج تک پہنچ جانے کی آرزو۔ پہلے بھی اس کی اُونچی اُونچی شاخیں اُن بادلوں میں دھنس رہی تھیں جو سیلانی پرندوں کے جھنڈ یا بڑے بڑے سفید راج ہنسوں کی طرح نیلے آسمان میں تیر رہے تھے۔

ہر پتہ اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے دیدۂ بینا رکھتا ہو۔ پتے اس طرح معلوم ہوتے گویا دن کی کشادہ روشنی میں بڑے بڑے چمکدار ستارے نمودار ہیں۔

روشن اور شیریں نظر آنکھوں کے سے ستارے ـــــ وہ ایک بچے کی آنکھوں کی جانی پہچانی ہوئی نظر یا اُن محبت کرنے والوں کی آنکھوں کی یاد دلاتے تھے جو ایک دفعہ شاہ بلوط کے نیچے ملے تھے۔

بوڑھے درخت کے لئے یہ لمحے حیرت انگیز اور امن و مسرت سے لبریز لمحے تھے ـــــ تاہم اس تمام شادمانی کے باوجود درخت نے ایک پُرشوق تمنّا یا آرزو محسوس کی اور وہ یہ تھی کہ اس کے نیچے کے تمام دوسرے درخت، جھاڑیاں، جڑی بوٹیاں، پھول وغیرہ بھی اس کی شان و شوکت شہرت اور برابر کی خوشی دیکھنے کے لئے اُتنے ہی اُونچے ہو جائیں جتنا اونچا وہ خود ہے ـــ بلند مرتبہ شاہ بلوط اپنی تفریحوں کے درمیان اکیلا ذرا بھی خوش نہ ہو سکتا تھا۔ باقی تمام چھوٹے بڑے پودے اُس کے برابر نہ تھے۔ اُس کا یہ پُرشوق جذبہ اور احساس اس کی ہر شاخ اور ہر پتے کے ریشے ریشے میں ایسی گرمجوشی اور تیزی سے کانپا جیسے ایک انسانی دِل کی رگوں میں کانپے۔

درخت کی چوٹی اِدھر اُدھر لہرائی اور نیچے کی طرف جھکی۔ گویا اپنی خاموش آرزو کی دُھن میں وہ کسی بات کی تلاش میں سرگرداں ہے ـــــ یکایک اس کو جنگلی بنفشہ کی خوشبو، نیلوفر اور گلاب کی تیز خوشبو کے ساتھ مل کر آنے لگی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ کوئل کی کوک سُن

رہا ہے۔ اُس کی تمنا تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ جنگل کے درختوں کی سرسبز چوٹیاں بادلوں تک پہنچ گئیں۔ شاہ بلوط نے ان کو اپنے نشیب سے اُٹھتے اور اونچا ہی اونچا ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں تیزی سے اُوپر کی طرف اُٹھیں۔ بعض نے نہایت تیزی سے بڑھ جانے کی ترنگ میں اپنی جڑیں بھی توڑ لیں ——— بید کا درخت ان سب میں سے زیادہ جلد باز نکلا۔ اس کا پتلا تنا ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر کی شکل میں بجلی کے ایک شعلے کی مانند اُوپر کو اُٹھا۔ شاخیں اس کے گرد سبز پرنیان کی جھنڈیوں کی طرح پھیل گئیں۔ جب پرندے اپنے نغموں سمیت ہوا میں بلند ہونے لگے تو جنگل کی تمام پیداوار یہاں تک کہ سبز اور رُطوبت دار ناگر موتھے بھی جنگل کے باقی پودوں سمیت بڑھ گئے۔ گھاس کی ایک پتی پر جو ایک لمبے سبز تار کی طرح ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی ایک ٹڈا بیٹھا اپنے بازوؤں کو اپنی ٹانگوں کے ساتھ صاف کر رہا تھا۔

ہر کوئی اپنے اپنے طریقے سے گا رہا تھا۔ بھونرے گنگنائے۔ شہد کی مکھیاں بھنبھنائیں۔ پرندے چہچہائے۔ ہوا نغموں کی آواز اور طرب و انبساط سے معمور ہوگئی۔

شاہ بلوط بولا" ہائیں! ننھا نیلا پھول کہاں ہے۔ وہ جو کنارِ آب اُگ رہا تھا اور ارغوانی عشق پیچہ اور ڈیزی؟" شاہ بلوط ان سب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک مترنم آواز آئی "ہم یہ ہیں ہم یہ ہیں"۔

"لیکن آخر گرما کا حسین خوشبودار نازبُو! وہ کہاں ہے۔ اور وادی کے نرگس کہاں ہیں؟ جنہوں نے پچھلے سال اپنی گدراہٹ سے تختۂ زمین کو ڈھانپ دیا تھا؟ وہ پیارے پیارے پھولوں والا جنگلی سیب کا درخت؟ اور جنگل کے وہ تمام نازنین جو ہر سال اٹھلایا کرتے تھے؟ کیا وہ فی الفور اور یک بیک کونپلیں نکال کر ہمارے ہم پایہ ہو سکتے ہیں؟"

اوج ہوا سے آوازیں آئیں "ہم ادھر ہیں۔ ہم ادھر ہیں" گویا وہ پیشتر ہی سے اتنے رفعت پذیر تھے اور پہلے بھی اسی بلندی میں لہرایا کرتے تھے۔

شاہ بلوط نے مسرت بھری آواز میں کہا" اوہو! تمام چھوٹے بڑے موجود ہیں۔ ایک بھی نہیں بُھلایا گیا۔ یقیناً یہ اچھی بات ہے بہت ہی اچھی بات۔ کیا ایسی بےنظیر مسرت کا تصوّر کیا جا سکتا ہے؟ تقریباً ناممکن نظر آتا ہے"۔

ہوا میں سے جواب سنائی دیا" آسمانوں میں ہمیشہ رہنے والے خدا کی جناب سے ایسا ہونے کا تصوّر کیا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے"۔

بوڑھے درخت نے جواب تک اوج ہی اوج حاصل کرتا چلا جا رہا تھا محسوس کیا کہ اس کی جڑیں اپنے آپ کو زمین میں سے اکھاڑ رہی ہیں ———

درخت بولا" یہ بالکل ٹھیک ہے اور نہایت اچھا ہے۔ اب مجھے پابندیاں نہیں جکڑ سکیں گی۔ میں نور اور شہرت

کے بلند ترین درجوں میں پہنچ جاؤں گا۔ تمام چھوٹے بڑے جن سے میں محبّت کرتا ہوں میرے ساتھ ہیں۔ تمام ــــ تمام یہیں ہیں "

ایسا تھا بوڑھے شاہ بلوط کا خواب۔

جب وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ بحروبر میں ایک بہت بڑا طوفان برپا ہوا۔ سمندر بڑی بڑی لہروں میں کنارے کی طرف اُچھلا۔ درخت میں سے کڑکنے اور کچلے جانے کی آوازیں سُنی گئیں۔ جڑیں زمین کے اندر سے اُکھڑ گئیں۔ ٹھیک اسی لمحہ میں جب اس نے خواب میں محسوس کیا تھا کہ وہ زمین سے اُکھڑ رہا ہے۔

وہ گر پڑا ــــ اس کے تین سَو پینسٹھ سال گذر چکے تھے چھوٹے پتنگے کے ایک ہی دن کی طرح ــــ

کرسمس کی صبح کو جب سُورج نکلا، طوفان تھم چکا تھا۔ تمام کلیساؤں میں خوشی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اور ڈروئڈ (ایک قدیم محافظِ دین پادری) کی قربان گاہ پر عید کی نیاز کے دھوئیں کی طرح ہر چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑی کے چُولہے میں سے دھواں نکل نکل کر نیلے آسمان پر جانے لگا ــــ سمندر رفتہ رفتہ خاموش ہو گیا۔ ایک شاندار جہاز کے تختے پر جس نے رات خوفناک طوفان کا مقابلہ کیا تھا خوشی اور شادمانی میں تمام جھنڈے لہرانے لگے۔ ملّاح چلّا اُٹھے "آہ! درخت تباہ ہو گیا! پُرانا شاہ بلوط ــــ ہمارا سمندر پر سے زمین دکھانے والا مینار ــــ اس کی جگہ اب کون کام آسکے گا ــــ افسوس! کوئی بھی نہیں ــ

بوڑھے درخت پر یہ ایک ماتمی تقریر تھی ــــ چھوٹی سی مگر پُر معنی ــــ یہاں یہ ساحل کے قریب برف سے ڈھنپے ہوئے کنارے پر پھیلا پڑا تھا۔ اور اس پر جہاز میں سے ابدی زندگی اور انسانی رُوح کی نجات کا ایک پُرانا گیت کرسمس کی خوشی میں گایا جا رہا تھا۔

"اِس مسرُور صبح میں بلند آہنگی سے گاؤ
سب کچھ تکمیل کو پہنچ گیا کیونکہ نبی پیدا ہُوا ہے۔
ہمیں مسرّت کے گیت بلند آوازی سے گانے دو
اپنے نبی اپنے بادشاہ کی تعریفوں میں

اہلِ جہاز میں سے ہر کسی نے اس گیت اور دُعا کے درمیان اپنے خیالات بلند تر ہوتے ہوئے محسوس کئے۔ ہُو بہُو اُسی طرح جس طرح بوڑھے درخت نے کرسمس کی صبح کو اپنے خوبصورت خواب میں رفیع الشّان ہو جانا محسوس کیا تھا۔

ــــــــــــــــــــ

ح۔ ب

(ترجمہ)

محسوساتِ ماہرؔ

اصول کے فریب کیوں ضوابط و قیود کیا
نمازِ عشق کیلئے رکوع کیا سجود کیا

جنوں کی خامیوں کے دو فراق و وصل نام ہیں
اگر کمالِ عشق ہی تو غیب کیا شہود کیا

نمائشِ جہاں نہیں طلسم ہے طلسم ہے
عروج کیا زوال کیا، ہبوط کیا صعود کیا

تلونِ جمال کی عیاں ہیں چند صورتیں
وگرنہ کائنات کی اساس کیا نمود کیا

ہوس پرست کیا کہا، مآلِ عشق یاس ہے
سرور و غم سے کیا غرض یہاں زیان و سود کیا

ثباتِ عشق کی قسم فریب ہے فریب ہے
وجودِ دہر کچھ نہیں، نمودِ ہست و بود کیا

نشاط و غم کی حس نہیں نہو بلا سے دل تو ہے
گلہ ہو بیحسی کا کیوں، شکایتِ جمود کیا

حیاتِ ماہرِؔ حزیں، رہینِ دردِ عشق ہے
وگرنہ مشتِ خاک کی بساط کیا نمود کیا

منظور حسین ماہرؔ القادری

حُسن کاری اور افسانہ نویسی

ذیل کا مضمون ہندی کے مشہور افسانہ نویس پنڈت بشمبر ناتھ کوشک کے مضمون کا ترجمہ ہے:-

قبل اس کے کہ فن افسانہ نویسی کے متعلق کچھ لکھا جائے، میں اس بارے میں اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حسن کاری کیا چیز ہے؟ اس امر کی اس لئے ضرورت ہے کہ فی زماننا وہ حضرات جن کے دماغوں میں مغربی تہذیب اور لٹریچر کے تاثرات کچھ اس قدر ضرورت سے زیادہ مرتسم ہو گئے ہیں کہ وہ اُن کے بالکل ہی اندھا دُھند پرستار بن گئے ہیں کہہ دیا کرتے ہیں کہ "حسن کاری کا مقصد صرف حسن کاری ہے (Art for art's sake)" اس مقولے کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ کوئی ایسا مائی کا لال مِلا جو مجھے اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھا سکے۔ اس قول کے حامیوں سے بھی جب کبھی اس پر بحث مباحثہ ہؤا تو اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ وہ مجھے سمجھانے سے قاصر رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ خود بھی اس کا ٹھیک مطلب سمجھ نہیں سکتے۔

سنسکرت ادب کے رو سے حسن کاری کی چونسٹھ اقسام قرار پائی ہیں۔ ان میں گانا، بجانا، ناچنا اور مصوری وغیرہ وغیرہ داخل ہیں۔ حسن کاری کی علامت یہ ہے کہ فراموش شدنی نہ ہو۔ شاستر اور ادب کو انسان فراموش کر سکتا ہے لیکن حسن کاری کو ایک دفعہ سیکھ لینے کے بعد پھر کبھی نہیں بھول سکتا۔ آدمی یہ بھول سکتا ہے کہ پندرہ پنجے کتنے ہوتے ہیں۔ لیکن پیرنا کبھی بھول نہیں سکتا۔ گھوڑے کی سواری ہرگز بھول نہیں سکتا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ حُسن کاری کا نصب العین کیا ہے؟ حسن کاری کے دو مقاصد ہیں۔ ایک اپنا مطلب دوسرا پرایا مطلب یا دوسروں کی بہبودی۔ مصور جب تصویر بناتا ہے تو فقط یہی دو مقاصد اس کے پیش نظر رہتے ہیں یعنی خود کی دل بہلائی یا روپیہ پیسہ کمانا یا دوسروں کو خوش کرنا۔ کوئی مصور صرف اس لئے تصویر نہیں بناتا کہ تصویر بنانی ایک حُسن کاری ہے۔ لہذا تصویر بنانی ہی چاہئے۔ اگر وہ تصویر نہیں بنائیگا تو مصوری حسن کاری نہیں رہے گی۔ یا تصویر بنانی اس کی عادت میں داخل ہو گئی ہے۔ انسان کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرتا جس سے نہ تو خود اس کی تفریح طبع ہو اور نہ دوسروں ہی کی۔ جن کا دماغ مختل ہو جاتا ہے۔ وہ پاگل اکثر ایسے کام کیا کرتے ہیں جو بظاہر دیکھنے والوں کو لغو اور اوٹ پٹانگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن سے پاگل کا دل بہلتا ہے۔ اگر اس کا دل نہ بہلے تو وہ کبھی ایسی حرکتیں نہ کرے۔ غرض پاگل بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو مطلب سے خالی ہو پھر صاحب ہوش وحواس انسان کا کیا پوچھنا "حسن کاری حسن کاری کے سئے" کے علمبردار فرماتے ہیں کہ حسن کاری وہ ہے جس میں فقط حسن وجمال ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ

اس میں افادیت بھی ہو۔ بعض تو یہاں تک بڑھ کر کہنے لگتے ہیں کہ حسن کاری میں اگر کوئی مقصد یا افادیت مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا حسن و جمال غارت ہو جاتا ہے۔ وہ حسن کاری نہیں رہتی۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے کوئی کہے کہ اگر کوئی اس خیال سے تیرنا سیکھتا ہے یا تیرنے کے لئے پانی میں کُودتا ہے کہ وہ کبھی ڈوبتے ہوئے کی جان بچائے گا تو اس کا تیرنا حسن کاری نہیں سمجھا جائیگا۔ یا اگر کوئی مصور اس لئے تصویر بناتا ہے کہ اس کو فروخت کرکے اپنے اہل و عیال کی شکم پروری کرے تو اس کی بنائی ہوئی تصویر حسن کاری کے دائرے سے خارج کر دی جائے گی۔ اگر حسن کاری سے افادیت خارج کر دی جائے گی تو حسن کاری بالکل بیکار چیز ہو جائے گی۔

بڑے حسن و جمال میں بھی افادیت موجود ہے۔ اگر کوئی چیز حسین و جمیل ہے تو وہ نظر بازوں کا دل خوش کرتی ہے یہی اس کی افادیت ہے جس حسن و جمال میں ناظرین کے دلوں کو مسرور کرنے کی قوت نہ ہو حسن و جمال نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا حسن کاری میں حسن و جمال کی تخلیق کے ساتھ افادیت بھی آجاتی ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ حسن کاری میں افادیت غیر ضروری چیز ہے یا یہ کہ وہ ہونی ہی نہیں چاہئے بالکل لغو سی بات ہے۔ درحقیقت حسن کاری اس وقت منتہائے کمال کو پہنچتی ہے جبکہ وہ جمیل ہونے کے علاوہ انسان کے لئے مطمح نظر بن کر مفید ہو جاتی ہے۔

اس قول کے حامیوں کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ناظرین کو چاہئے کہ وہ حسن کاری کو حسن کاری کی نظر سے دیکھیں۔ اس میں افادیت یا نصب العین یا تعلیم کو نہیں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کسی مصور نے ایک آدمی کی تصویر بنائی تو ناظرین کو فقط یہ دیکھنا چاہئے کہ تصویر میں ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ ہیں یا نہیں بس۔ اگر یہ سب ہیں تو مصوری ختم شد۔ اب اگر کوئی ناظر مصور سے یہ کہے کہ "استاد ناک تم نے ذرا لمبی بنا دی، اگر ذرا چھوٹی ہوتی تو زیادہ خوبصورت ہوتی" تو مصور اُسے جھڑک کر کہے "کیا بکتے ہو، صرف یہ دیکھو کہ یہ ناک ہے یا نہیں" ناظر بچارا جواب دیتا ہے "ہاں ناک تو ضرور ہے"۔ اس پر مصور کہے "تو بس جھگڑا ختم ہے آگے تمہیں کچھ کہنے کا اختیار نہیں۔ ناک کو صرف ناک کی نظر سے دیکھو۔ کیا لمبی ناک والے آدمی دُنیا میں نہیں ہوتے؟" دوسرا ناظر کہتا ہے "بھئی تم نے پیشانی پر جو تل بنایا ہے وہ ٹھیک نہیں جچتا۔ تمہیں گال پر تل بنانا چاہئے تھے۔ کیونکہ تل اکثر گال پر ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے"۔ اس پر مصور کہتا ہے "بیوقوف ہو، تل کو تل کی نظر سے دیکھو۔ انسان کے جسم پر سب جگہ تل ہو سکتا ہے۔ کیا دُنیا میں کسی کی پیشانی پر تل نہیں ہوتا؟"

"حسن کاری حسن کاری کے لئے" کے مؤیدین کی کچھ عجیب سی حالت ہوتی ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ناک کی جگہ ناک ہے یا نہیں۔ اگر موٹی ہے تب بھی ٹھیک ہے۔ کیونکہ موٹی ناک بھی ہوتی ہے۔ اگر لمبی ہے تب بھی ٹھیک ہے کیونکہ لمبی ناک بھی ہوتی ہے۔ اگر چپٹی ہے تب بھی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ چپٹی ناک بھی ہوتی ہے۔ جو لوگ ناک میں حسن تلاش کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ ناک اسی طرح کی اچھی ہوتی ہے۔ اس سے بڑی، چھوٹی، موٹی یا پتلی اچھی نہیں ہوتی وہ حسن کاری کو نہیں سمجھتے۔ خوبصورت

اور سڈول ناکیں دنیا میں بہت تھوڑی نکلیں گی۔ کثرت تو بے ڈول ناکوں ہی کی ہے۔ لہذا ان کی مصوری ہی فطرت و حسن کاری ہے۔
اب فن افسانہ نویسی کو بھی مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں جانچنا چاہئے کہ افسانہ نویسی کی حقیقت کیا ہے۔ افسانے کا پہلا مقصد یہ ہے کہ اس میں قاری یا سامع کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ اگلے زمانے میں جب کتابیں بمشکل دستیاب ہوتی تھیں راجاؤں مہاراجوں اور متمول لوگوں کے ہاں داستان گو رہتے تھے۔ وہ رات کے وقت کہانیاں کہا کرتے تھے۔ بچے بالطبع کہانیاں سننے کے شوقین ہوتے ہیں اور رات میں بغیر کہانی سنے انہیں نیند نہیں آتی۔ افسانوں کی اس قدر کثرت اشاعت اس لئے ہے کہ ان سے عوام کا دل بہلتا ہے۔ جی خوش ہوتا ہے۔ لہذا افسانے میں دلچسپی کی خوبی کا ہونا ضروری ہے۔ جس کہانی میں یہ گُن نہ ہو اس کے پڑھنے یا سننے سے دل بہلنے کی بجائے اُکتا جاتا ہے۔ وہ کہانی نہیں کہی جا سکتی۔ جب تک انسان کا دماغ پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک اُس پر تعلیم یافتہ کا صحیح اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں کہانی کی محض اِسی صفت کی بدولت دِل بہلائی ہوتی ہے چنانچہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو طوطا مینا، حاتم طائی، الف لیلہ اور دیو پریوں کے قصّوں کے ذریعہ ہی تفریح طبع حاصل ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم اور تجربہ بڑھ جانے پر انسان کہانیوں میں دِل بہلاوا کے سوا کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ کہانیوں میں درس وعبرت، پند و نصیحت ڈھونڈتا ہے۔ سمجھ دار انسان پند و نصیحت سے خالی کہانیوں کو سُن کر یا پڑھ کر بول اُٹھتا ہے" آخر اس کہانی کا مطلب کیا نکلا؟" کچھ لوگ جو فن افسانہ نویسی کو ضرورت سے زیادہ سمجھتے ہیں اس پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو ایسا کہتے ہیں وہ حسن کاری سے محض بے بہرہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بیوقوف ہیں لیکن وہ بیچارے مجبور ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنے جذبہ و وجدان کے ماتحت کہتے ہیں۔ ان کا دل نری گپ شپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ چاہے افسانہ نگار اپنی حسن کاری افسانے کے خاکے (پلاٹ) اور کردار نگاری میں صرف کر ڈالے۔ لیکن وہ ان کے دِل کو متأثر نہیں کر سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تصویر کا پورا ڈھانچہ خوبصورت بنایا گیا ہے۔ مصوّر نے اپنی ساری حسن کاری صَرف کر دی ہے۔ حسن کار اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ کیونکہ خطوط بھی ٹھیک ہیں۔ رنگ بھی چوکھا ہے۔ تناسب بھی موزون ہے۔ لیکن ناظر کا دل جو حسن کاری کی نظر سے نہ خطوط کو سمجھتا ہے نہ رنگ کے اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہے یہ کہتا ہے کہ" اگر اس کی ٹھوڑی پر ایک تِل بنا دیا جاتا تو یہ تصویر کس قدر خوبصورت ہو جاتی۔ مصوّر نے تِل نہیں بنایا یہ بُرا کیا" حسن کاری کے ماہرین اس پر ہنس کر یہ کہہ سکتے ہیں" تل بنانا ضروری نہیں ہے۔ اگر تل نہیں بنا تو کیا اس سے تصویر خراب ہو جائے گی؟" اس میں کلام نہیں کہ تصویر خراب نہیں ہوئی۔ لیکن یہ تو ماننا پڑے گا کہ اس کی خوبصورتی میں کچھ کمی ضرور رہ گئی جس کو ناظرین نے محسوس کیا۔ اگر مصوّر ناظرین کو بے وقوف سمجھتا ہے تو تصویر کو چھپائے رکھے اور اُسے صرف حُسن کاروں ہی کو دکھلائے۔
قصّہ کہانیوں کا پرچار زیادہ ہوتا ہے اور لوگ انہیں شوق سے سنتے یا پڑھتے ہیں۔ پند و نصیحت کا کام جس خوش اسلوبی سے اور جس قدر زیادہ کہانیوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور کسی ترکیب سے ممکن نہیں۔ اس لئے اس بات کو سمجھ کر عقلمندوں نے تعلیم و تلقین کے لئے کہانیوں

کا پیرایہ اختیار کیا۔ چنانچہ پوران امثال و اخبار کا مجموعہ ہے۔ اس طرح سینکڑوں سبق آموز کہانیوں کی ابتدا ہوئی۔ ہندوؤں میں ست نارائن کتھا کا جو گھر گھر چرچا ہے وہ بھی ایک کہانی ہی ہے لیکن نری گپ شپ نہیں۔ اس میں مذہبی تعلیم و تلقین ہدایت و موعظت شامل ہے۔ لہٰذا یہ کہانی ہندوؤں کے مذہب کا ایک جزو بن گئی۔ ست نارائن کتھا کا مصنف دراصل افسانہ نویسی کا بڑا ماہر تھا۔ تلسی داس کی رامائن بھی تو ایک کہانی ہے لوگ کہا بھی کرتے ہیں کہ رامائن میں ہے کیا" والے واکی سیتا ہری، والے واکی لنکا جاری" بس رامائن ختم۔ اگر تلسی اس بھی رامائن کو اسی طرح سادگی سے لکھ جاتے تو کیا آج رامائن کو اس قدر ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوتی؟ ہرگز نہیں۔ رامائن کا چرچا اس لئے ہے کہ وہ بے شمار ہدایات و مواعظ، ان گنت سیاسی حقائق بیسیوں امثال و نظائر کا گنجینہ ہے۔ اس سے صرف رام چندر جی کی سرگذشت حیات ہی نہیں معلوم ہوتی۔ سیتا کی سیرت و کردار ہی کا مطالعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں اس میں سب کے لئے مسالہ موجود ہے حسن کاروں کے لئے بھی اور عوام کے لئے بھی۔

اگر افسانہ نگار فی الواقع حسن کار ہے تو وہ ایسا افسانہ لکھے گا جو خواندہ اور ناخواندہ، جاہل اور عقلمند، حسن کاری کے نقاد اور حسن کاری سے بے بہرہ سب لوگوں کے پسندِ خاطر ہو سب کی تفریح طبع کا باعث ہو۔ سب کے دلوں کو خوش کر سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں ضرور نقص ہے وہ افسانہ کی تعریف و اصطلاح سے محض نابلد ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ لچر پوچ گندے، شرمناک اور شہوانی قصے لکھ کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ قارئین ان کے گندے پن کو حسن کاری سمجھ کر ان کی مدح سرائی کریں۔ ان کے خلاف ایک حرف زبان سے نہ نکالیں۔ اور اگر کچھ کہتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نرے اُلو ہیں۔ وہ حسن کاری کے معنی و مطلب سے محض عاری ہیں۔ وہ حسن کاری کو حسن کاری کی نظر سے دیکھنا نہیں جانتے۔ خوب! عجیب و غریب حسن کاری کی بیچ میں منطق بھی انوکھی ہے۔ سڑی اور گندی گلی میں لے جا کر کوئی کہے کہ " ہیں ناک کیوں دابتے ہو، منہ کیوں بناتے ہو؟ یہ بھی خالق کائنات کی حسن کاری کا ایک نمونہ ہے۔ اسے اسی نقطہ نظر سے دیکھو" اس وقت شاید کوئی خدا رسیدہ یہ کہہ سکتا ہے" ٹھیک کہتے ہو! یہ بھی پیارے محبوب کا پیارا نظارہ ہے۔" عوام تو یہی کہیں گے" بھئی باز آئے ہم ایسی حسن کاری سے۔ ہم غیر حسن کار ہی اچھے ہیں۔ اس حسن کاری نے تو ہماری حسن کاری کو بگاڑ دیا۔ محض ادب کو کوئی ماہر ادبیات ہی حسن کاری کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ عوام سے یہ توقع رکھنا عین حماقت ہے۔ شرمناک برہنہ تصویر بنانے اور فروخت کرنے والے یہ اُمید رکھیں کہ سب لوگ ان کی تصویروں کو خریدیں اور ان کو سراہیں تو یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر کچھ لوگ ایسی تصویروں کی تلاش میں رہتے ہوں اور اُن کو بڑے شوق سے خریدتے ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ تصویریں مصوری کے نقطۂ نگاہ سے بہترین ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ مصوری کے نقطۂ نظر سے بہترین بھی ہوں تو وہ ترک کرنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ وہ ناظرین کے دلوں میں روگ پیدا کرتی ہیں۔ طوائف چاہے کیسی ہی حسین و جمیل ہو۔ لیکن وہ قابلِ عزت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں بیماری پیدا کرتی ہے۔ حسن کاری کا کام انسان

نے دلمیں بیماری پیدا کرنا اور اُسے سماجی، اخلاقی ادبار اور پستی کی طرف لے جانا نہیں ہے بلکہ اس کا کام معراج انسانیت ہے۔ جس کہانی کو پڑھ کر قاری کا دل خوش نہیں ہوتا اس کو کوئی اخلاقی سبق نہیں ملتا۔ زندگی کے کسی مسئلہ کو سُلجھانے میں اس سے مدد نہیں ملتی۔ اس کے پیش نظر کوئی نصب العین قرار نہیں پاتا۔ وہ کہانی کبھی بہترین اور حُسن کاری کا اعلےٰ نمونہ نہیں سمجھی جاسکتی بعض لوگ جو فطرت پسند ہیں کہہ دیا کرتے ہیں کہ افسانہ نگاروں کو دُنیا کی سچی تصویر پیش کرنی چاہئے۔ دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو من وعن ظاہر کرنا چاہئے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بالکل نقالی ہے نہ اس میں کچھ اپج ہے اور نہ حسن کاری۔ لوگ جو باتیں رات دن دیکھتے سنتے ہیں وہی اگر ان کے سامنے پیش کی جائیں تو ان سے نہ دلچسپی ہی ہوسکتی ہے اور نہ کوئی نفسیاتی اور روحانی ارتقا کا امکان۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان کے رُوبرُو کوئی نئی چیز پیش کی جائے۔ ایسی چیز ہو جو آسانی سے مہیا نہ ہوسکے۔ جس حُسن کاری میں جدت اور اُپج نہیں وہ نقالی ہے۔ خواہ وہ آہنی قلم کی ہو، خواہ مُو قلم کی۔ مصوری کے نقطۂ نظر سے عکاسی (فوٹوگرافی) میں کونسی حسن کاری ہے؟ حسن کاری تو مُو قلم سے متاثر کرنے والی تصویر بنانے میں ہے۔ دُنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ اس بات کو ظاہر کرنے میں کوئی حُسن کاری نہیں ہے۔ یہ کام تو ہر ایک آدمی کرسکتا ہے۔ اور کرتا ہے۔ حُسن کاری تو یہ ظاہر کرنے میں ہے کہ دُنیا میں کیا کیا ہونا چاہئے اور کس بات کی کمی ہے۔ کسی حسین چیز کو دیکھ کر اس کے حُسن وجمال کی نمائش کرنے میں اس قدر حُسن کاری نہیں ہے جس قدر یہ ظاہر کرنے میں کہ اُس چیز کی خوبصورتی میں کیا نقص ہے اور اس میں کس قسم کا اضافہ ممکن ہے۔ آخر میں صرف اتنا عرض کرکے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے کہ حسن کاری حسن کاری کے لئے نہیں بلکہ حُسن کاری بہبود خلائق کے لئے یعنی اس کی ترقی وکمال کے لئے ہے جس افسانے میں خاکے کی جدت اور اپج، کردار کی ندرت اور خوبصورتی کے علاوہ قاری کو شاہراہِ ترقی کی طرف رہنمائی کرنے والے خیالات موجود ہوں وہی افسانہ حُسن کاری کے نقطۂ نظر سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔

بشمبر ناتھ کوشک

مترجمہ غلام رسول حیدرآبادی

محفلِ ادب

ترجمہ کے متعلق چند اصولی باتیں

چونکہ اُردو زبان ابھی تک دَورِ تراجم سے نہیں گزری ہے، اس لئے یہ بحث کبھی نہ کبھی ضرور دیکھنے میں آجاتی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ کس اصول سے کیا جائے ―――― کوئی کہتا ہے کہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کوئی عربی و فارسی سے مدد لینا ضروری سمجھتا ہے ―――― اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صرف معمولی قصّے کہانی کی کتابوں کا تعلق ہے۔ آپ بہ آسانی ہندی بھاشا سے کام نکال سکتے ہیں، لیکن جس وقت سوال علمی کتابوں کا آئے گا تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو عربی فارسی سے مدد لیں یا سنسکرت سے، جب غیر زبانوں کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُردو داں طبقہ پریشان ہوجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

ہر چند بعض کتابیں مصطلحاتِ علمیہ کی لکھی جاچکی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی اصولی گفتگو اس موضوع پر نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہوسکا جس کو سامنے رکھ کر ہم ترجمہ کی دشواریوں کو دور کرسکیں۔

انجمن ترقیِ اُردو اور جامعۂ عثمانیہ کی خدمات اس باب میں یقیناً قابلِ قدر ہیں اور اس وقت تک وہاں سے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہوچکا ہے لیکن افسوس ہے کہ تمام ترجمے کسی ایک اصول کے ماتحت نہیں کئے گئے اور اربابِ قلم کی وہ تشویش جو اصول سے متعلق تھی ہنوز باقی ہے۔

انجمن ترقی نے جو لغت مصطلحات کا مرتب کیا ہے وہ ناقص و نامکمل تو خیر ہے ہی، افسوس یہ ہے کہ جتنا کچھ اس میں ہے وہ بھی کسی اصل کے ماتحت نہیں ہے، کسی جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ لے لئے ہیں اور کسی جگہ عربی کے ثقیل مصطلحات لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ اُردو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ہم کو غیر زبانوں کے الفاظ لینا ضروری ہیں، اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ الفاظ کس زبان سے لئے جائیں عربی سے یا سنسکرت سے۔

سنسکرت سے مصطلحات مستعار لینا گناہ نہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس زبان سے تعلق نہیں رہا ہے۔ اور عربی سے وہ بڑی حد تک مانوس ہیں یہاں تک کہ دیہاتیوں کی زبان میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عربی سے مدد نہ لی جائے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ تصریفی آسانیوں کو دیکھیں گے تو لامحالہ سنسکرت پر عربی کو ترجیح دی جائیگی۔ اور یوں بھی اس وقت تک علوم و فنون کی جتنی کتابیں عربی میں آچکی ہیں، سنسکرت یا بھاشا میں منتقل نہیں ہوسکیں۔

بہرحال چونکہ ترجمہ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور میں نے ہمیشہ عربی سے مدد لینے کو مرجح سمجھا ہے اس لئے آج کی صحبت

میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں کہ خود عربی میں ترجمہ کے کیا اصول ہیں، ممکن ہے کسی حد تک مفید ثابت ہوں۔

پہلا اصول تو یہ ہے کہ جب تک انہیں عربی الفاظ ملتے ہیں وہ عجمی الفاظ کا ترجمہ اپنی ہی زبان کے مترادف الفاظ میں کرتے ہیں البتہ وہ عربی الفاظ میں اُن تمام الفاظ کو شامل کرتے ہیں جو اُن کے لغت و ادب میں اوزانِ عربیہ پر جاری ہیں خواہ اُن کی اصل کچھ ہو ۔۔۔ مثلاً قلم کہ دراصل یونانی لفظ ہے لیکن چونکہ اُن کے لغت میں رائج ہے اس لئے اُسے وہ عربی سمجھتے ہیں، یا ابریق کہ فارسی الاصل ہے، یا قیس کہ سریانی کا لفظ ہے یا سلطان کہ نبطی الاصل ہے یا مشکاۃ کہ حبشی الاصل ہے سب عربی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ اوزانِ عربیہ کا بھی زیادہ لحاظ نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر استعمال و رواج کو دیکھتے ہیں اور اسی لئے جند بید ستر، سالامندرا اور قنطاریون ایسے الفاظ بھی اُن کے نزدیک عربی کے الفاظ ہیں۔

اس قاعدہ میں ان کے یہاں بہت کم استثنائی مثالیں مِل سکیں گی اور افعال میں تو بالکل نہیں کیونکہ وہ غیر زبان کے افعال کبھی استعمال نہیں کرتے ۔۔۔ اسی طرح حروف میں بھی کوئی مستثنےٰ نہیں ہے بجز (de) فرانسیسی (of) انگریزی اور (von) جرمنی کے، کہ یہ سب حروفِ اضافی ہیں اور عربی میں ان کی ضرورت نہیں لیکن صرف اس لئے کہ التباس پیدا نہ ہو اور لوگ آسانی سمجھ سکیں؛ کیونکہ اگر بجائے پرنس آف ویلز کے پرنس ویلز لکھیں تو ممکن ہے لوگوں کو سمجھنے میں زحمت ہو۔

اسماء میں بیشک شواذ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بعض اعجمی الفاظ اس طرح داخل ہو چکے ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو اصل مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا مثلاً لفظ پرنس کو لیجئے، کہ اس کا ترجمہ عربی میں لفظ امیر سے کیا جاتا ہے لیکن پرنس آف ویلز کا ترجمہ امیر ویلز یا امیر آف ویلز نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح معنی پر صریح دلالت نہیں ہوتی چونکہ ترجمہ کا اصل مقصود یہ ہے کہ کم سے کم وقت اور الفاظ میں سامع ہمارے مدعا کو سمجھ سکے اس لئے عجمی الفاظ بجنسہٖ لے لینے میں وہ کبھی احتراز نہیں کرتے اگر ضرورت اس کی ناشی ہوتی ہے ۔۔۔ اب سے بہت پہلے ابن اثیر، ابن سینا اور ابن بیطار بھی ایسے اعجمی الفاظ کو جو کثرت سے رائج ہو گئے تھے اور جو اپنے مفہوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے تھے، لے لیتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں نہ کرتے تھے لیکن اگر کبھی التباس کا اندیشہ نہیں ہوتا تو بیشک عربی میں ترجمہ کرتے تھے اور اب بھی یہی دستور ہے چنانچہ "پرنسات اروبا" کبھی نہیں لکھیں گے بلکہ "امراء اوربا" لکھیں گے۔

الغرض ان کا مقصود ترجمہ سے یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا فوراً سمجھ لیا جائے اور اس غرض کے لئے وہ عجمی الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے مثلاً (Rheumatism) کو لیجئے کہ اب عربی میں زیادہ تر اس کو "روماتزم" کہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے عربی مرادف لفظ "داء المفاصل" یا "وجع المفاصل" موجود ہے، لیکن چونکہ داء المفاصل سے عام طور پر ہاتھ پاؤں کے جوڑوں کا درد سمجھ میں آتا ہے اور پیٹھ کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے اُنھوں نے روماتزم جوں کا توں اپنے یہاں لے لیا۔ اسی مصلحت سے وہ بجائے توتیا کے زنک اور بجائے نشادر کے امونیا لکھتے ہیں۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عجمی لفظ کا صحیح مترادف لفظ عربی میں نہیں ملتا ہے تو پھر یہ جستجو کی جاتی ہے کہ قریب تر مفہوم کس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا مل گیا تو اسے اختیار کر لیتے ہیں ———— مثلاً انگریزی لفظ "Mercenaries" ہے۔ اس سے مراد وہ افواج ہیں جو دوسرے ممالک سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اب انہوں نے سوچا کہ یہ رسم یقیناً عربوں میں بھی ہی ہوگی اور ضرور اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہوں گے، چنانچہ جستجو سے ان میں لفظ "مسترزقہ" ملا جو ایسی فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور وہ انہوں نے اختیار کر لیا ———— اسی طرح ایک اور انگریزی لفظ "Tributary" ہے جس سے مراد وہ چھوٹی ندی ہے جو کسی دریا میں جا کر گرتی ہے، اس کے لئے جب انہوں نے قدیم سفرنامے اپنے یہاں کے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے لفظ ناصر استعمال کیا گیا ہے جس کی جمع نواصر آتی ہے، اس لئے انہوں نے اس کو اختیار کر لیا ———— اگر کوئی ایسا عجمی یا عامی لفظ ہوتا ہے جس کی عربی زیادہ رائج نہیں ہے تو بدستور وہی لفظ باقی رکھا جاتا ہے مثلاً مصر میں لفظ لقادی کثرت سے مستعمل ہے اور عربی لفظ بذار کوئی استعمال نہیں کرتا، اسی طرح مذبح کو سلاخ بلدی کہنے کا رواج ہے اور زبل کوئی نہیں کہتا، یا پُل کو بجائے جسر کہنے کے کبری کہتے ہیں اور ڈاک کو بجائے برید کے بوسطہ، تو انہوں نے انہیں رواجی الفاظ کو لے لیا، کیونکہ وہ زیادہ قریب الفہم ہیں اور عام و خاص سب انہیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

تیسرا قاعدہ عجمی ناموں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ جو نام جس طرح سے عربی میں رائج ہیں ان کو بدستور اسی حال پر رکھا گیا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، مثلاً ابراہیم، یوسف، المانیا، امیرکا وغیرہ اور جو نام نئے آتے ہیں ان کو تلفظ کے لحاظ سے لکھتے ہیں ————
شہروں کے بعض نام ایسے ہیں جو زمانۂ قدیم سے عربی میں چلے آ رہے ہیں جیسے وینس کے لئے بندقیہ، سسلی کے لئے صقلیہ سو اس کے لئے انہوں نے یہ کیا ہے کہ جب وہ کسی واقعۂ تاریخی کا ذکر کریں گے تو وہی بندقیہ و صقلیہ استعمال کریں گے لیکن جب زراعت و صناعتِ حالیہ کے متعلق کچھ لکھنا ہوگا تو وہ وینس و سسلی ہی لکھیں گے، کیونکہ اہل حرفت و پیشہ میں یہی زیادہ رائج ہیں۔

بعض نام ایسے ہیں، جو فی الاصل عربی ہیں لیکن اہل مغرب نے ان کی صورت میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، سو ان کو اسی اصلی صورت میں لکھا جاتا ہے اور اہل افرنج کے تصرفات کو قبول نہیں کیا جاتا مثلاً قاہرہ، قرطبہ، اشبیلیہ کو اس کو کیرو، کارڈووا، اور سیویل وہ کبھی نہ لکھینگے۔

چوتھا قاعدہ، الفاظِ جدیدہ کا ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ اگر انہیں کوئی لفظ عربی کا ایسا مل جاتا ہے جو پہلے سے اس معنی میں رائج ہے تو پھر وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں مثلاً اکسیجن، ہیدروجین، نیتروجین اور نفسنفور وغیرہ بلکہ اسی سے افعال بھی بنا لیتے ہیں مثلاً مغنطیس سے انہوں نے مغنط فعل بنایا اور کہربا سے کہرب۔ لیکن اگر کوئی لفظ رائج شدہ انہیں نہیں ملتا تو وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ نئے لفظ کو اپنی زبان میں لے لیتے ہیں جیسے تلفون، فونوغراف، مکروفون، اتوموبیل اور کبھی کبھی کوئی دوسرا عربی لفظ بھی گھڑ لیتے ہیں جیسے اتوموبیل کے لئے سیارہ کہ اب عام طور پر یہی مستعمل ہے۔

اول اول جب بیروت میں بائسکل آئی تو اس کا ایک پہیہ بہت بڑا تھا، اور دوسرا بہت چھوٹا اور سوار ہونے میں بڑی زحمت ہوتی تھی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ٹرائیسکل (تین پہیوں والی گاڑی) کے مقابلہ میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے اس لئے اُنہوں نے لفظ بائیسکل اختیار کرنے سے احتراز کیا اور درّاجہ کا لفظ اختراع کیا، بعد کو جب دو پہیوں والی گاڑی کے لئے بائسکل اور تین پہیوں والی کے لئے ٹرائسکل کا لفظ وضع ہوا تو اہلِ مصر نے درّاجہ کو چھوڑ کر عجلہ کا لفظ وضع کیا جو دونوں پر حاوی تھا۔

مصطلحات علمی میں چونکہ تعریب کا بہت کم موقعہ ہے اور ذرا ذرا سے تغیر سے معنے میں بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اس لئے انہوں نے اس باب میں بھی علماء کا تتبع کیا اور ان کو جوں کا توں لے لیا۔

اب معنی کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ حقیقی ہوں گے یا مجازی، اور اہلِ عرب کے نزدیک مالوف ہوں گے یا غیر مالوف، پس اگر وہ حقیقی ہیں اور مالوف بھی ہیں (مثلاً گھوڑے پر چڑھنے کو وہ رکوب کہتے ہیں اور شراب پینے کو شُرب) تو اس قبیل کے معنے جہاں جہاں آئیں گے وہ یہی افعال استعمال کریں گے۔ اگر معنی حقیقی ہیں اور غیر مالوف تو ترجمہ لفظی کرتے ہیں۔ یا قریب قریب لفظی کے مثلاً بندوق سر کرنے کے لئے وہ لفظ اطلاق استعمال کرتے ہیں اور بم وغیرہ کے لئے رمی۔

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور مالوف تو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور اسے اختیار کر لیتے ہیں جیسے فتنہ جگانے کے لئے الفاظ الفتنہ :

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور غیر مالوف تو وہ اس قبیل کے استعارات کو اپنی زبان میں تلاش کرتے ہیں اگر قریب قریب اس کے مل گئے تو انہیں لے لیتے ہیں ورنہ پھر اس غیر زبان کے استعارہ کو استعمال کرنے لگتے ہیں ۔۔۔۔۔ الغرض اہلِ عرب کے تمام اصول ترجمہ کے متعلق آسانی کے خیال پر قائم کئے گئے ہیں اور وہ دوسری زبان کے الفاظ لینے میں بھی تامل نہیں کرتے، اس لئے اگر اردو میں بھی انہیں اصول پر کاربند ہوں تو کیا حرج ہے۔ یعنی غیر زبان کے وہ الفاظ جو رائج ہو چکے ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیں اور مصطلحاتِ علمیہ یا دوسرے بلند مفہوم کے الفاظ کا ترجمہ کرنے میں پہلے اپنی زبان میں جستجو کریں، اگر کوئی لفظ پورے معنی پر حاوی مل جائے تو لے لیں۔ اور اگر کسی غیر زبان سے استعارہ کی ضرورت ہے تو عربی فارسی سے مدد لیں۔

ہر چند اس صورت میں عربی فارسی کا علم ضروری ہوگا اور ہر شخص ترجمہ نہ کر سکے گا، لیکن اگر سنسکرت یا بھاشا کے ثقیل الفاظ لئے گئے سنسکرت دانی کی ضرورت ہوگی، اور یہ امر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فارسی عربی کا سیکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سنسکرت کا ۔۔۔۔۔

"نگار"

مطبوعات

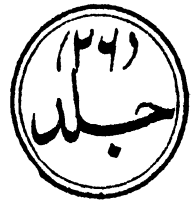
تاریخ سلطنت خداداد (میسور) مؤلفہ جناب محمود خاں صاحب محمود بنگلوری۔ یہ کتاب ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر نفیس کاغذ اور طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور اس میں چودہ ہاف ٹون بلاک کی تصاویر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب میسور کی ایک مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے۔ ابتدا میں نوابان ارکاٹ کا حال ہے۔ اس کے بعد تاریخ میسور اور تاریخ دکن و جنوبی ہند۔ کتاب کا زیادہ حصہ سلطان حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائیوں کا مفصل تذکرہ ہے۔ زوال سلطنت کے اسباب اور اسلامی ہند پر اُن کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو کی تاریخی تصانیف میں بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ قیمت چار روپے۔ پتہ:۔ جناب محمود خاں صاحب۔ ۲۶ ڈکنسن روڈ بنگلور۔

ریحانہ (عہد فاروقی کا ایک دلکش ناول) مصنفہ حضرت کوکب جوالاپوری مدیر حمایت اسلام لاہور۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جو شرر کے ناولوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا روشن صدیقی نے لکھا ہے۔ زبان اور انداز بیان دلکش اور پلاٹ دلچسپ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔ حجم ۱۴۴ صفحات قیمت ۸/ ریحانہ بک ڈپو۔ ولایت بلڈنگ، برکت علی روڈ سے منگوائیے۔

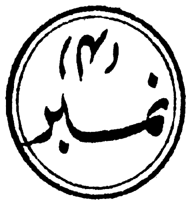
نقد الادب مصنفہ جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ یہ دو سو صفحات کی ایک مجلد کتاب ہے جو بہت حسن اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ اُردو زبان میں فن تنقید کے اصول پر شاید اس سے قبل اس محنت سے کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی۔ مصنف نے بہت تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ قیمت عہ/ مصنف سے گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے پتے سے منگوائیے۔

موتی۔ یہ دہلی کے نوجوان ادیب سید یوسف بخاری صاحب کی تالیف ہے جس میں اُنھوں نے زندگی اور اُس کے ہر شعبہ کے متعلق علم و حکمت کے کثیر التعداد اقوال جمع کردیے ہیں۔ ابتدا میں مولینا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور جناب اختر انصاری کی تعارفی تحریریں ہیں اس کے بعد یوسف صاحب نے اقوال کی اہمیت اور اُن کا فلسفہ وغیرہ بیان کیا ہے۔ تقریباً سو سے زائد صفحات پر اقوال پھیلے ہوئے ہیں جو بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ کتاب کا کاغذ کتابت اور طباعت بہت نفیس ہے۔ قیمت ۱۲/ مصنف سے گلی امام متصل جامع مسجد دہلی کے پتے سے منگوائیے۔

ساقی کا افسانہ نمبر۔ دہلی کے مشہور رسالے "ساقی" نے حال میں اپنا افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس کا حجم دو سو صفحات ہے۔ اور اس میں جدت یہ ہے کہ بارہ مشہور افسانہ نگار حضرات نے اس میں ایک ہی پلاٹ پر بارہ دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ یہ ایک دلچسپ نفسیاتی مطالعہ بھی ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف دماغ کس کس انداز میں اپنے تخیلات پیش کرتے ہیں۔ ہم جناب مولانا شاہد احمد صاحب کو اس کامیاب تجربے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ اس پرچے کی قیمت دس آنے ہے۔ پتہ دفتر رسالہ ساقی دہلی



فہرست مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۴ء

تصویر :- دریائی گھوڑے

چندہ سالانہ ۶ؔ مع محصول — ششماہی ۳ؔ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ؔ

بزمِ ہمایوں

یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو ہمایوں کا تیرھواں سالگرہ نمبر شائع ہوگا۔ اس پرچے کی ترتیب اب شروع ہو رہی ہے اسلئے جو حضرات اس کے لئے مضامین بھیجنا چاہیں وہ ذرا عجلت سے کام لیں۔ بعد از وقت آئے ہوئے بعض اچھے مضامین بھی "ہمایوں" میں شائع نہیں ہو سکتے۔ اُمید ہے کہ اہلِ قلم حضرات ہماری اس گذارش کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

ڈچ ایسٹ انڈیز سے ہمایوں کے ایک خریدار جناب عبدالسلام صاحب رفیقی نے ہمیں ذیل کا خط لکھا ہے جس میں صاحب موصوف نے اردو رسم الخط کے متعلق موجودہ جھگڑوں کو بہت اہمیت دی ہے اور ان کے نتائج کا نہایت خوفناک نقشہ کھینچا ہے فرماتے ہیں:-

"ہمایوں کی ترقی اردو علم ادب کی ترقی ہے جس کے رسم الخط کے متعلق مجھے عرصہ سے مایوسی ہے۔ ہندوستان کی زبان تو یقیناً ہندوستانی رہے گی لیکن اس طرح یقیناً رسم الخط کا جھگڑا کبھی ختم نہ ہوگا نتیجہ ظاہر ہے کہ ہندو ہندی اور مسلمان فارسی رسم الخط کے ساتھ رہیں گے۔ اور رومن رسم الخط سرکاری ہوجائے گا۔ بڑودہ میں اس کی ابتدا ہوئی۔ بعض اور ریاستیں بھی جلد یا بہ دیر اس میں شامل ہوں گی اور اس کے بعد تمام ہندوستان کی باری ہوگی۔ ایسا ہونا اُردو کے لئے موت ہے لیکن ایسا ہو کر رہے گا۔ میں نے اپنے زمانہ میں رنگون سے سب سے پہلا اردو کا موقت الشیوع پرچہ ماہانہ "الرفیق" جاری کیا۔ ان مشکلات کے ساتھ کہ چھپے یوپی میں اور نکلے رنگون سے۔ کئی سال تک مالی نقصان اُٹھا کر بند کرنا پڑا۔ یقین مانئے کہ ہمایوں کے اجرا میں جو رکاوٹیں آپ کو ہوں گی ہیں بخوبی سمجھ سکتا ہوں لیکن چوتھائی صدی قبل کے مقابلہ میں یقیناً وہ کم ہیں اور آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ انشاءاللہ"۔

رسم الخط کے موضوع پر ہمایوں کے اسی پرچہ میں کسی جگہ پروفیسر یعقوب الرحمٰن صاحب کا مضمون شائع ہو رہا ہے اُمید ہے کہ وہ جناب رفیقی کے ملاحظہ سے گزرے گا۔

"ہمایوں" کے متعلق وقتاً فوقتاً اس کے قارئین، اہلِ قلم اور معاصرین جس حسنِ ظن کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ ہمیشہ ہمارے لئے حوصلہ افزائی کا موجب ہوتا رہا ہے۔ آج ہم ناظرینِ "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے بعض آرا درج کرتے ہیں۔ معاصر "شاہجہاں" دہلی نے افسانہ نمبر کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں "ہمایوں" کی خدمات کی داد دی ہے جس کے لئے ہم اپنے معاصر کے شکر گذار ہیں:-

"کسی زبان میں عمدہ جرائد و رسائل کا شائع ہونا اُس زبان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اُردو زبان میں جتنے اچھے رسالے شائع ہو رہے ہیں، ہندوستان کی کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوتے۔ اسی سے اُردو کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پنجاب نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اور کر رہا ہے اس کا فیاضانہ اعتراف نہ کرنا تنگدلی کی بدترین مثال ہوگی۔ پنجاب نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے جہاں اور بہت سی راہیں نکالیں وہاں اعلےٰ درجے کے رسالے اور اخبارات بھی جاری کئے تاکہ ان محسوس یادگاروں سے اُردو کی شاندار ترقی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا رہے یہ دیکھنے کے لئے کہ پنجاب نے صحافتِ اُردو کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، آپ زیادہ دُور نہ جائیں صرف دس بارہ سال پہلے ہی آپ دیکھ لیں کہ ادبی رسائل کا کیسا کال پڑا تھا۔ پھر ہمایوں نکلا اور بڑی دھوم سے نکلا۔ اُس نے ایک خاص روش اختیار کی اور اس جمود کو توڑا جو صحافتِ اُردو پر طاری تھا۔ ہمایوں کا اجرا اُردو کے لئے ایک نیک شگون تھا اس کے بعد ہی اسی طرز کے اور کئی

[illegible]

نے ابتداءً اختیار کیا تھا۔ ادارۂ ہمایوں مستحقِ آفرین ہے کہ اس کے پائے استقلال میں اب تک کوئی لغزش نہیں آنے پائی۔ گذشتہ مہینے میں ہمایوں کا "افسانہ نمبر" شائع ہُوا جسے اگر ادبی کارنامہ سے موسوم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

ہندوستان کے نفیس ہفتہ وار اردو اخبار "ریاست" دہلی مورخہ ۱۰ ستمبر کے بہرۂ سوالات و جوابات میں ذیل کے الفاظ ہمیں نظر آئے۔

سوال۔ اُردو کے تمام رسائل میں سے کون سا بہترین رسالہ ہے؟ (عزیز الرحمٰن پونا) جواب۔ میرے خیال میں "ہمایوں" سب سے اچھا ہے۔ (ایڈیٹر)

اس قدر افزائی کے لئے ہم اپنے معاصر کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مسٹر عطاء اللہ کلیم ایم اے اپنے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمایوں" ماہ بماہ نظر سے گزرتا ہے۔ اس کی روز افزوں کامیابی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ جب عام پرچوں کا یہ حال ہے تو خاص پرچوں کے متعلق جتنی توقعات ہوں کم ہیں۔"

دہلوی معاصر "ساقی" نے جس کے ایڈیٹر اُردو کے محسن مولانا نذیر احمد خاں مرحوم کے قابل پوتے مسٹر شاہد احمد بی اے (آنرز) ہیں ذیل کے ستائش افزا الفاظ میں افسانہ نمبر کا ذکر کیا ہے:۔ "لاہور کے مشہور رسالہ "ہمایوں" کا "افسانہ نمبر" یکم اگست کو بڑی آب و تاب سے شائع ہُوا۔ حامد علی خاں صاحب ایک مشہور جرنلسٹ اور ادیب ہیں۔ ہمایوں کا صرف ایک خاص نمبر سالگرہ کے موقع پر شائع ہوتا تھا مگر اب ایک اور خاص نمبر حامد علی خاں صاحب کی مساعی سے شائع ہُوا ہے۔ ہمایوں اپنی سنجیدگی و متانت کے لئے مشہور ہے۔ افسانہ نمبر میں بھی یہ امتیازی شان برقرار رکھی گئی ہے۔" افسانہ نمبر میں جتنے افسانے ہیں اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے شوق سے نہ پڑھا جائے۔ تین افسانوں پر بڑے بڑے انعامات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے بہت کامیاب ہا۔ رنگین اور سادہ تصاویر سے بھی مزین ہے۔ بعض رنگ برنگ ورق کی وجہ سے افسانہ نمبر کو "عروس جمیل و لباس حریر" سمجھئے۔ اس میں صرف ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جناب حامد علی خاں صاحب کا کوئی ترجمہ اس میں شامل نہیں ہے۔ حامد علی خاں صاحب کے تراجم کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اصل سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ثبوت کے لئے آپ ورنہ جائیں "افسانہائے عشق" کا کوئی سا افسانہ دیکھ لیں۔ ناظرینِ ہمایوں اس کمی کو ضرور محسوس کرینگے۔"

حضرت حفیظ ہوشیارپوری افسانہ نمبر کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔ "ہوشیارپور میں افسانہ نمبر سرسری طور پر پڑھا تھا۔ آج پھر دوبارہ پڑھا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ آپ اپنی روش سے الگ ہو کر معاصرین کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ افسانہ نمبر میں وہ بیہودگیاں نظر نہیں آتیں جو عام طور پر رسالوں کے خاص نمبروں میں ہُوا کرتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا مقصد تجارتی مقصد سے اعلےٰ و ارفع ہے۔ افسانوں کا انتخاب اور حسنِ ترتیب قابلِ داد ہے۔ میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ فیاض محمود صاحب کا طلبہ اور افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ نظموں نے ایک خاص قسم کا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ آپ کی نظم "محبت" افسانہ نمبر کیلئے بہت موزوں معلوم ہوتی ہے۔"

جہاں نما

انڈین اکیڈمی آف سائنس

علمی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ میسور میں "انڈین اکیڈمی آف سائنس" کے نام سے حال ہی میں ایک علمی انجمن قائم ہوئی ہے۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے دیوان میسور مرزا سر اسمٰعیل نے نہ صرف ہندوستانی سائنس دانوں کو اشتراکِ عمل کی تلقین کی ہے بلکہ عوام اور حکومت سے بھی تعاون کی درخواست کی ہے۔

سر اسمٰعیل نے اس کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس مجلس علمیہ کی ہندوستان کے لئے وہی حیثیت ہوگی جو رائل سوسائٹی آف لنڈن کی انگلستان کے لئے اور سلطنت برطانیہ کی دوسری رائل سوسائٹیوں کی متعلقہ نوآبادیوں کے لئے ہے۔

گزشتہ مہینے بنگلور میں اس مجلس کے رفقاء کا ایک اجلاس ہوا جس میں حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے:-

صدر :- سر سی وی رامن۔

نائب صدر :- ڈاکٹر ای پی مٹکاف وائس چانسلر میسور یونیورسٹی۔ ڈاکٹر ٹی ایس ویلر پرنسپل رائل انسٹیٹیوٹ آف بمبئی۔ راؤ بہادر ٹی ایس وسوا ناتھ اور پروفیسر بی۔ کے سنگھ۔

خزانچی: ڈاکٹر وی سبرامنیم۔

سیکرٹری: پروفیسر سی آر نرائن راؤ اور راؤ بہادر بی ونکٹیسا چاری۔

کونسل کے اراکین حسب ذیل ہیں:-

پرنسپل ایم ادون۔ پروفیسر پی این گھوش۔ ڈاکٹر ایس چاؤلہ۔ ڈاکٹر ایس کے بنرجی۔ ڈاکٹر آر و دیاناتھ سوامی۔ ڈاکٹر ایس ایس جوشی۔ ڈاکٹر ایچ پرمیشورن۔ ڈاکٹر ایم سی پرتھا سارتھی آینگر۔ میجر ایس سی بھاٹیا۔ ڈاکٹر اے ایل نرائن۔ ڈاکٹر ایس سوبھاراؤ۔ ڈاکٹر بی کے نرائن راؤ۔ پروفیسر ایل رام راؤ۔ ڈاکٹر ٹی ایکبرم اور لفٹنٹ کرنل برکلے ہل۔

کونسل کے اراکین کے عہدے کی میعاد ایک سال اور دوسرے عہدہ داروں کی تین سال ہے۔

شہزادہ معظم جاہ کا دیوان۔ اعلیحضرت نظام دکن کے ایک فرمان سے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ اعظم جاہ ولی عہد دکن کے

چھوٹے بھائی شہزادہ معظم جاہ نے سات سو غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا ہے جو ملک الشعرائے دکن نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے ملاحظہ کے بعد طبع ہوگا۔ اس کا دیباچہ حضور نظام خود لکھیں گے۔ فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلوں کے اشعار اعلےٰ درجہ کے ہیں اور شہزادۂ معظم جاہ نے اپنے عالیجاہ اسلاف کے ادبی ترکے سے حصّۂ وافر پایا ہے۔

شاہانِ لنکا کا تخت

لنکا کے باشندوں کی خواہش کے مطابق ملک معظم نے شاہانِ لنکا کا طلائی تخت واپس لنکا بھیجنے کے احکام صادر کئے ہیں یہ تخت ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف گلوسٹر حکومتِ لنکا کے حوالے کریں گے، جہاں کچھ عرصے کے لئے یہ غالباً عوام کے دیکھنے کی غرض سے عجائب گھر میں رکھا جائے گا اور اس کے بعد گورنر کے محل میں رہے گا۔ ایک عرصے سے اہلِ لنکا کی یہ خواہش بھی رہی ہے کہ شاہانِ لنکا کا قدیم محل بھی انہیں واپس مل جائے۔ یہ محل ایک عرصے سے برطانی کلکٹر کی اقامت گاہ ہے۔ اب یہ محل بھی واپس کردیا جائے گا اور غالباً یہ قومی عجائب گھر میں تبدیل ہوجائے گا۔ تخت بھی بالآخر اسی محل میں منتقل کردیا جائے گا۔

شاہانِ لنکا کے شاہی نشانات تاج، تخت، عصا اور تلوار ۱۸۱۵ء میں لفٹننٹ جنرل سر رابرٹ براؤن رگ گورنر لنکا نے جارج چہارم کو جو اس وقت پرنس ریجنٹ تھا، نذر کئے تھے۔ اس وقت لنکا کا آخری تاجدار سری وکرما راجا اپنی راجدھانی کو چھوڑ چکا تھا اور سلطنت باقاعدہ طور پر انگریزوں کے حوالے کی جاچکی تھی۔ اس وقت جارج چہارم کارلٹن ہاؤس میں رہتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں جب اس نے کارلٹن ہاؤس کی سکونت ترک کی تو لنکا کے شاہی نشانات ونڈسر کاسل میں پہنچادیئے گئے۔

ٹراونکور میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم گاہیں

ٹراونکور کی تازہ ترین سرکاری رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی عورتوں کو بحیثیتِ مجموعی بہت آزادی حاصل ہے۔ اسی آزادی اور تعلیم کے صدقے میں وہاں کی عورتیں امورِ عامہ میں عملی حصّہ لینے کے قابل ہوگئی ہیں۔

ٹراونکور میں لڑکیوں کو لڑکوں کے تمام مدارس میں داخل ہونے کا حق حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکوں کے مدارس میں زنانہ مدارس کے مقابلے میں لڑکیوں کی بہت زیادہ تعداد تعلیم پارہی ہے۔

جن مضامین کی تعلیم زنانہ کالجوں میں نہیں دی جاتی، اُن کے پڑھنے کے لئے لڑکیوں کو ٹریونڈرم کے کالجوں میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ دس سال قبل لڑکیوں کے انگریزی مدارس میں ۱۹۱۲ اور لڑکیوں کے دیسی مدارس میں ۸۷،۲۲ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں گزشتہ سال یہ تعداد علے الترتیب ۶۳۲۰ اور ۱۵۶۹۷۰ تھی۔

مسلمانوں کے دیسی مدارس میں بھی مخلوط تعلیم کے رواج کی ترقی قابلِ توجہ ہے۔ اگر ٹراونکور میں مخلوط تعلیم کا رواج نہ ہوتا تو ان ۲۹۹۶۰ لڑکیوں کی تعلیم کے الگ انتظام کا مسئلہ جو اب ریاست میں زیرِ تعلیم ہیں حل کرنا مشکل ہو جاتا۔

جرمنی

وسطی یورپ پھر دُنیا کی دلچسپی کا مرکز بن گیا ہے۔ جرمنی اور آسٹریا دوبارہ سامنے آ گئے ہیں۔ گذشتہ سال جاپان دنیا کے لئے خطرناک بن رہا تھا لیکن اب صورتِ حالات نے ایک پلٹا کھایا ہے اور جرمنی وسطی یورپ کے لئے ایک معلق خطرہ بن گیا ہے۔

جنرل ہنڈن برگ کی موت نہایت نازک موقع پر واقع ہوئی ہے۔ اُس کے اثر نے مختلف قوتوں کو ضابطہ کی ایک زنجیر میں باندھ رکھا تھا۔ ہنڈن برگ کے بعد ہر قسم کی بے راہ روی اور زیادتی کا امکان ہے۔ ہٹلر اب جرمنی کا پریذیڈنٹ بھی ہے اور چانسلر بھی۔ جرمن قوم کا صدر ہونے کے ساتھ ہی وہ نازی پارٹی کا لیڈر بھی ہے۔ یورپ اب یہ دیکھنے کا منتظر ہے کہ یہ پریذیڈنٹ چانسلر اپنی قوت کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

آسٹریا

(ڈاکٹر ڈالفس کی موت کے اسباب)

ڈاکٹر ڈالفس کی ہلاکت آسٹریا کے لئے ایک عظیم الشان حادثہ ہے۔ اس کی زندگی پر اس سے قبل بھی حملے ہوتے رہے لیکن وہ ہر بار بچ گیا۔ افسوس کہ اس دفعہ موت نے راہ مفر نہ دی۔ ڈالفس کی موت کا ذمہ دار نازی پروپگنڈا ہی قرار دیا گیا ہے۔ جرمنی اپنے آپ کو دشمنوں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس لئے وہ یورپ کے وسط میں ایک مرکزی دفاعی قوت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نازی جماعت کی ہدایات کے زیر اثر ہے اس حکمتِ عملی کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش نازی کچھ عرصے سے برابر کر رہے ہیں۔ چنانچہ پولینڈ اور ڈینزگ میں اس کا پروپگنڈا کیا گیا اور حال ہی میں آسٹریا بھی اس پروپگنڈا کے لئے منتخب ہوا۔ اس ملک سے اس پراپیگنڈے کو قبول کرنے کی پوری توقع تھی کیونکہ گذشتہ جنگِ عظیم میں آسٹریا جرمنی کا وفادار حلیف رہ چکا ہے۔ اسکے علاوہ کئی آسٹروی نازی جماعت کے سچے حامی ہیں۔ اِن وجوہ سے جرمنی کو آسٹریا سے پورے تعاون کی توقع تھی۔

لیکن ڈاکٹر ڈالفس آسٹریا کی خود مختارانہ حیثیت کا علمبردار بن کر جرمنی کی راہ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک جرمنی کا ایک الحاقی حصہ بن جائے جس کی قسمت کی باگ جرمن نازی حکمتِ عملی کے ہاتھ میں ہو۔ اس بات میں ڈالفس کو عہد نامۂ ورسائی کی مدد بھی حاصل تھی جس کی ایک شرط یہ ہے کہ جرمنی اور آسٹریا کبھی متحد نہ ہو سکیں گے۔ اٹلی اور فرانس بھی جرمن اتحاد سے خائف ہونے کے

باعث ڈالفس کے حامی تھے۔ چنانچہ ڈالفس جرمنی کی بڑھتی ہوئی اُمیدوں کے راستے میں ایک سنگِ گراں سے کم نہ تھا۔ اگر پہلے جرمنی کی کامیابی کا کوئی شائبہ تھا بھی تو اب ڈالفس کی موت نے صورتِ حالات بدل دی ہے۔ ڈالفس نے نازی گولی سے ہلاک ہو کر گویا اپنے وطن کی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے جان دے دی۔ اگر دولِ یورپ نے جرمن نازیوں کو آسٹریا کے خالی کر دینے پر مجبور کر دیا تو ڈالفس کی قربانی رائگاں نہ جائے گی۔ ڈاکٹر کرٹ شنے جو آسٹریا کے نئے چانسلر اور پرنس سٹارہمبرگ نے جو جدید وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں عہد کیا ہے کہ آسٹریا کی خود مختاری برقرار رکھنے کے لئے ڈاکٹر ڈالفس کی حکمتِ عملی پر برابر قائم رہیں گے۔

سائنس اور اسلام

"ہندوستان ریویو" میں مولوی عبد الکریم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا مفاد ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

کینن ٹیلر نے اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نے دنیا کو مہذب بنانے کے لئے عیسائیت سے بہت زیادہ کام کیا ہے۔ اگر دُنیا کو پوری طرح معلوم ہو کہ یورپ کی تہذیب اور اس کی سائنس میں موجودہ غیر معمولی ترقی کہاں تک اسلام کی مرہونِ منت ہے تو وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جائے۔ بوسورتھ سمتھ لکھتا ہے کہ تاریخِ یورپ کے تاریک ترین زمانوں میں مسلمان پانچ سو سال تک علم و تہذیب کے شمع بردار رہے۔ آرتھر لیونارڈ نے سچ کہا ہے کہ اسلام دُنیا کے لئے ایک ایسا کام کر چکا ہے جس کی یاد صفحۂ عالم سے کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ایک وقت آئے گا جب دُنیا زیادہ دانا ہو جائے گی۔ اس وقت کھلے دل سے اسلام کی علمی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔ افسوس کہ فی الحال مذہبی تعصب اور نسلی تفاخر یورپ کو مشرق کی عظیم الشان علمی خدمات کا اعتراف کرنے سے مانع آتا ہے۔ ڈریپر نے خوب کہا ہے کہ "ہمالا لٹریچر نہایت باقاعدہ اور باضابطہ طریقے سے اُن علمی احسانات پر پردہ ڈالتا رہا ہے جو مسلمانوں نے ہم پر کئے ہیں۔ یہ احسانات زیادہ عرصے تک چھپے نہیں رہ سکتے۔ جو ناانصافی مذہبی تعصب اور نسلی غرور پر مبنی ہو ہمیشہ دُنیا کی آنکھوں میں خاک نہیں جھونک سکتی۔

اسلام کے ظہور سے قبل سائنس کی تعلیم کفر و الحاد قرار دی گئی تھی۔

شاہِ انگلستان کی نقرئی جبلی

۶ مئی کو ملک معظم کی نقرئی جُبلی کی تقریب پر بنک کی تعطیل ہو گی۔ سینٹ پال کے کلیسا کی دعا اس جُبلی کا ایک اہم حصہ ہو گی اور غالباً آلہ نشرِ صوت کے ذریعے سے اقصائے مملکت میں پہنچائی جائے گی۔ بادشاہ کا شاہی پیغام بھی کرسمس کے پیغام کی طرح ہو گا اور غالباً تمغے اور خطابات بھی دیئے جائیں گے۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہو گا کہ ایک بادشاہ اپنی نقرئی جُبلی منائے گا۔



جارج سوم علیل ہوگیا تھا اور ملکہ وکٹوریا پرنس کانسرٹ کے سوگ میں تھیں۔

دریائی گھوڑا

(مضمون متعلق تصویر)

دریائی گھوڑا مچھلی کی ایک قسم ہے جس کا تعلق پائپ[1] فش کی نوع سے ہے۔ یہ مچھلی کی ایک نہایت اہم قسم ہے۔ اس کا جسم ہڈیوں کی ایک زرہ میں محفوظ ہوتا ہے اور یہ بالکل سیدھا ہو کر اپنی دم کی مدد سے تیرتا ہے۔

اس جانور کی وضع قطع اور وہ طبعی حالات جو اس کو موجودہ صورت دینے کا باعث ہوئے انسان کی توجہ کو فوراً اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں۔ اس کا گاؤ دم جسم اور اس کا سبز رنگ اس کی زندگی میں ایک اہم حصہ لیتے ہیں۔ یہ زیادہ تر دریائی نباتات کی جڑوں اور پتوں میں رہتا ہے جہاں نباتات کی ہمرنگی کی وجہ سے یہ دشمن کی نگاہوں کو دھوکا دے کر بچا رہتا ہے ورنہ نہ تو اسے مقابلے کی طاقت ہے اور نہ بھاگ نکلنے کی ہمت۔

پائپ فش کے جسم سے دریائی گھوڑا بنانے میں قدرت کو زیادہ محنت نہیں پڑی۔ ظاہری صورت کے علاوہ دریائی گھوڑا ایک اور بات میں بھی دوسری مچھلیوں سے ممتاز ہے۔ وہ یہ کہ یہ اپنی دم کو انگلی کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اس سے دریائی گھاس کے ریشوں کو پکڑ کر حسب ضرورت لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ تیرتے وقت دم گھڑی کے سپرنگ کی طرح لپیٹ لی جاتی ہے اور اس وقت یہ جسم کو استادہ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس مچھلی کے سینے اور تھوتھنی کے غیر معمولی نشوونما اور اس کے استادہ رہنے کی عادت نے باہم مل کر اسے گھوڑے کے سر اور سینے سے گہری مشابہت دے دی ہے۔ اسی لئے اسے دریائی گھوڑا کہتے ہیں۔

گھوڑے کی سی شکل وصورت اس جانور کو بظاہر کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عجیب و غریب صورت اس مچھلی کے کس کام آتی ہے۔ دریائی نباتات کے درمیان البتہ اس کا جسم بالکل پہچانا نہیں جاتا اور مچھلی کا تو اس پر گمان تک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اس کی بو پانے کے باوجود اس کا کھوج لگانے میں ناکام رہتے ہیں۔

---

[1] ایک مچھلی جو سانپ کی ہم صورت ہوتی ہے۔

ہندوستان کی قومی زبان کا رسم الخط

اس سے قبل "ہندوستان کی قومی زبان" کے عنوان سے پروفیسر یعقوب الرحمٰن صاحب کا ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔ ذیل کا مضمون اس سلسلے کی دوسری قسط ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسی سلسلے کے دو اور مضامین بھیجنے کی اطلاع دی ہے۔ ان مضامین کی اہمیت ظاہر ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو و ادب کا ہر بہی خواہ انہیں دلچسپی سے پڑھے گا اور ان مضامین سے موضوع زیر بحث کے متعلق کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے میں مدد ملیگی۔ یعقوب الرحمٰن صاحب کا بے تعصبانہ اور بے لاگ استدلال اور سُلجھا ہُوا اندازِ بیان قابلِ ستائش ہے۔ "ہمایوں"

ہم نے اس سے پہلے مضمون "ہندوستان کی قومی زبان" میں اس حقیقت کو واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ صرف اُردو زبان ہی ہندوستان کی مشترکہ بین الاقوامی زبان ہے اور اس کے آخر میں اس زبان کے رسم الخط کی تبدیلی سے بھی اختصار کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس مضمون میں ہم رسم الخط کے متعلق ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں +

ہندوستان کی قومی زبان کے رسم الخط کے متعلق جہاں تک غور کیا گیا ہے تین قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں:-

(۱) رسم الخط اردو ہو (۲) رسم الخط ہندی ہو (۳) رسم الخط لاطینی ہو۔

مذکورہ بالا خیالات کی ہر ایک جماعت اپنا اپنا ایک انفرادی مقصد اور خاص مطمح نظر رکھتی ہے اور اسی مقصد اور مطمح نظر کے تحت اپنے اپنے دلایل پیش کرتی ہے۔ لیکن ان جماعتی براہین و دلائل کی معقولیت اور عدم معقولیت، صحت و عدم صحت کی گفتگو سے قبل اس اصُول اور اساس سے کیوں نہ بحث کرلی جائے جس کے زیر اثر یہ دلائل نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ جزئی بحثیں اکثر بے نتیجہ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اس قسم کی بحث و تکرار کبھی کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے نہیں دیتی۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ اوّل بحیثیت ایک محب وطن ہندوستانی ہونے کے اس بنیادی اور اساسی اصول کو تلاش کریں جو کسی قومی زبان اور بالخصوص ہندوستانی زبان کے لئے ملکی حالات کے لحاظ سے ضروری ہے اور جس کو کوئی قوم کسی وقت بھی فراموش نہیں کرسکتی۔

آپ تھوڑے سے غور کے بعد یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ اساسی اور بنیادی اصُول قومی زبان اور اس کے رسم الخط میں خصوصیات قومی کا موجود ہونا ہے جس رسم الخط سے ادبی اور تاریخی سرمایہ معرضِ خطر میں پڑجاتا ہو یا اس کے ادب خصوصی کے سرمائے کی حفاظت نہ ہوتی ہو وہ کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

اردو زبان ایک ایسی مستقل زبان ہے جو نہ صرف فارسی کی شاخ ہے اور نہ صرف ہندی کی بلکہ یہاں کی قوموں کے میل جول

اور امتزاج سے قدرۃً اور فطرۃً ایک زبان پیدا ہوگئی ہے جو خالص ہندی نژاد ہے اور ہند ہی میں ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔ اس کی ترقی اور نشو ونما میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی کا زبردست ہاتھ کام کرتا رہا ہے اس لحاظ سے اردو زبان اور رسم الخط میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی قوموں کی ادبی اور تاریخی خصوصیات کی حفاظت لازمی اور ضروری ہے۔

اس اصول کے تحت لاطینی رسم الخط کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ لاطینی رسم الخط کو ہندوؤں و مسلمانوں دونوں کی ادبی خصوصیات اور تاریخ و تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ ہندی رسم الخط زیر بحث آجاتا ہے کیونکہ اس رسم الخط میں ہندوستانی تہذیب اور ادب کی کسی نہ کسی درجہ میں حفاظت موجود ہے لیکن ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ رسم کے معنی طریقے کے اور خط کے معنی لکھنے کے ہیں اور ہر زبان کے لکھنے کا طریقہ اس زبان کے حروف ابجد پر موقوف ہے۔ ہندی کے حروف ابجد اردو زبان کے بیشتر ایسے الفاظ کے سرمایہ کی حفاظت سے قاصر ہیں جو مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب سے وابستہ ہیں۔ اردو میں جس قدر خاص عربی حرف ہیں۔ ہندی حروف ابجد ان کے لکھنے اور ادا کرنے سے ایک بڑی حد تک قاصر ہیں اور بہت سے الفاظ کا صحیح تلفظ بھی ہندی رسم الخط کی وجہ سے نہ ہوسکے گا اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ نہ نکلے گا کہ ایسے حروف ایک ایک کرکے اردو زبان سے خارج ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ حروف بول چال میں بھی باقی نہ رہیں گے ہندی رسم الخط کا اختیار کرنا مسلمانوں کی تہذیب و تمدن و ادب و علوم کی خصوصیت کو قومی زبان سے خارج کر دینا ہے اور اس کے برخلاف موجودہ رسم الخط میں ہندی ابجد کے جملہ حروف کی پوری پوری حفاظت و ضمانت موجود ہے اور اردو رسم الخط سے ہندی ادب کے سرمائے اور خصوصیات کے زوال کا اندیشہ نہیں بلکہ اس میں اس قدر لوچ اور وسعت موجود ہے کہ اس سے ہندی ادب اور اس کی خصوصیات کو اور فروغ دیا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کے بنیادی حروف (حروف ابجد) پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قومی رسم الخط کے بنیادی اصول موجود ہونے کے علاوہ ایسی جملہ خصوصیات بھی موجود ہیں جو کسی ملک کے مقبول اور بہترین قومی رسم الخط کے لئے درکار ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ رسم الخط فطری اور نیچرل اصول پر ہو۔ اردو زبان کا رسم الخط دائیں جانب سے شروع ہوکر بائیں جانب کو ختم ہوتا ہے یہ اس رسم الخط کی فطری روانی اور نیچرل حرکت ہے۔

آپ جب بغیر کسی مانع اور خصوصیت کے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہیں تو دائیں جانب سے شروع کرکے بائیں جانب کو ختم کرتے ہیں ہم اپنے روزمرہ کے کاموں میں دن رات اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ جب ہمارے چہرے پر کوئی مکھی یا مچھر آکر بیٹھ جاتا ہے یا جب ہم مارنے کے لئے بے اختیار ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ہمارے ہاتھ کی حرکت دائیں جانب سے بائیں جانب ہی کو ہوتی ہے اور یہ اقتضاء فطری ہے۔ لاطینی اور ہندی رسم الخط میں یہ بات کہاں ہے بلاکسی تعصب کے انصاف سے آپ غور فرمائینگے تو آپ کو فطری طریقہ غیر فطری طریقہ سے بہتر اور عمدہ معلوم ہوگا کیونکہ اس میں آسانی اور سہولت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مشق اور ضروریات

خلافِ فطرت طریقوں کو بھی رائج کر دیتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان اس غیر فطری طریقے کا عادی ہو کر اسی کو آسان اور سہل سمجھنے لگتا ہے لیکن ایسی مشق اور ضروریات یا رواج اور قبولیت سے کوئی غیر فطری طریقہ فطری نہیں بن سکتا۔

اس کے علاوہ دوسری چیز یہ ہے کہ اس رسم الخط کی ابجد میں ملک کی اکثر زبانوں کے حروف شامل ہیں اور اس لئے کسی زبان کا لفظ اور کسی زبان کی آواز کیوں نہ ہو اس میں صحت کے ساتھ ادا ہو سکتی ہے اور ہم تحریر میں صحت کے ساتھ اس لفظ یا آواز کو لا سکتے ہیں اس کی وجہ سے اُردو زبان میں وسعت اور لوچ پیدا ہو گیا ہے اس قسم کا لوچ ہندی میں موجود نہیں۔

اور سب سے بڑی اور جامع صفت اُردو رسم الخط میں یہ ہے کہ تحریر کے وقت جب حروف مل کر آتے ہیں تو تمام حروف کی شکل پوری پوری نہیں لکھی جاتی بلکہ صرف اشارے تحریر میں آتے ہیں جس کی وجہ سے اُردو تحریر بہت تھوڑی جگہ گھیرتی ہے، بڑے بڑے جملے تھوڑی سی جگہ میں سما جاتے ہیں اور ہم لمبی لمبی اور بڑی بڑی تقریروں کو بہت کم وقت اور جگہ میں جلد قلمبند کر سکتے ہیں۔

گویا یہ رسم الخط ایک بہترین "شارٹ ہینڈ" بھی ہے۔

علاوہ ازیں مطالعہ کے وقت دماغ اور آنکھوں پر ہندی اور لاطینی رسم الخط کے مقابلے میں بہت کم بار پڑتا ہے کیونکہ اس رسم الخط میں تحریر کی صورت میں ہر ہر حرف کی پوری پوری شکل کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ آنکھ اشارے پا کر عبارت کو معلوم کرتی اور دماغ سمجھتا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی اور قابلِ لحاظ خصوصیت ہے۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ برسوں اور قرنوں سے اس رسم الخط کو تمام ملک میں قبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ تقریر اور تحریر۔ درس اور تدریس تصنیف و تالیف۔ غرض ہر ہر شعبہ اس رسم الخط کو قبول کر چکا ہے۔ اب تک اس رسم الخط میں جس قدر سرمایہ فراہم ہو چکا ہے اسکو دوسرے رسم الخط میں منتقل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ایک فضول تکلیف اور لایعنی تکلف بھی ہے۔

مذکورہ بالا تشریحات کے بعد ہم اردو رسم الخط کی حسب ذیل خصوصیات معلوم کر سکتے ہیں:۔

(۱) اردو رسم الخط کا طرز فطری طریقے پر مبنی ہے۔

(۲) اردو رسم الخط سے مسلمان اور ہندو بلکہ اقوامِ ہند میں سے کسی ایک کی بھی تاریخ و ادب، تہذیب و شائستگی کو خطرہ نہیں ہے۔

(۳) اُردو رسم الخط میں اکثر ہندوستانی زبانوں کے حروف ابجد پائے جاتے ہیں۔

(۴) اُردو رسم الخط سے آنکھ اور دماغ پر کم بار پڑتا ہے۔

(۵) اُردو رسم الخط ایک بہترین شارٹ ہینڈ ہے۔

(۶) اردو رسم الخط بہترین اور ملک کا مقبول رسم الخط ہے۔

ان خصوصیات کے مدِ نظر جب ہم ملک کے اس طبقے کے خیالات پر غور کرتے ہیں جو آئے دن ہندوستانی زبان کے رسم الخط کو ہندی رسم الخط سے تبدیل کر دینے کی سعی اور کوشش میں مصروف رہتا ہے تو ہماری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کوئی محبِ وطن اور انصاف پسند ہندوستانی غور کرنے کے بعد اس تحریک کے علم برداروں کو متعصب اور نادان کہے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ ہندوستانی قومیت اور خود ہندوستان کے ساتھ اس سے بڑھکر اور کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے خیالات سے سوائے اس کے کہ مسلمانوں کو بدظن کیا جائے اور ان کی تہذیب اور ادبی خصوصیات کو ایک قسم کا چیلنج دیا جائے اور کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی قومی زبان کا وجود تو وجود تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر محبِ وطن و قوم ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس قسم کے خیالات اور تحریکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے کیونکہ دنیا میں تقریر سے زیادہ تحریر سے کام لیا جاتا ہے اور اردو زبان کی تو فی الحقیقت بنیاد ہی اس کے رسم الخط سے قائم ہوئی ہے اس وجہ سے رسم الخط کی بحث بہت زیادہ اہم ہے۔

افسوس ہے کہ اس خصوص میں جس قدر لکھا جاتا ہے اور بحث ہوتی ہے طباعت کی سہولت یا خوبصورتی کے مدِ نظر کی جاتی ہے بہت سے اشخاص ہندی رسم الخط کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ایک طرف ہندوؤں کا ایک طبقہ خوش ہو جائے گا تو دوسری طرف ایک مکمل بنا بنایا ٹائپ بھی میسّر آجائے گا اور اس طرح طباعت و اشاعت کی دشواریاں معدوم ہو جائیں گی۔ اس نقطۂ نظر سے بعض حضرات نے لاطینی رسم الخط کو ترجیح دی ہے اور فی الحقیقت اس نقطۂ نظر سے لاطینی رسم الخط کو بہت بڑی ترجیح حاصل بھی ہے دوسری جماعت اردو رسم الخط کی خوبصورتی اور اختصار پر فدا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر ایسی اہم بحث میں کوئی وقعت نہیں رکھتا اس لئے ہم نے اس اساسی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے جو واقعی اور حقیقی طور سے مسئلۂ زیرِ بحث میں اساس و بنیاد ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یعقوب الرحمٰن عثمانی

*

دعوتِ شوق

آ کہ پھر آج ہم آہنگ ہوئی ہے لبِ جُو
نے کی لے، چاند کی تنویر، چمن کی خوشبُو

برہمن مجھ سا نہیں بُتکدۂ عالم میں
ایک دُزدیدہ نظر اے صنمِ غالیہ مُو

دہر کیا، عالمِ ارواح میں ہلچل پڑ جائے
اِس تکلّف سے لہک غنچۂ آئینہ رُو

جان لینا ہو تو کچھ کہہ کے جھکا لے آنکھیں
دِل اُڑانا ہو تو زِہ کر لے کمانِ ابرُو

منعقد پھر سے کروں محفلِ جمشید و قبادُ
دو گھڑی صدر نشینی پہ جو آمادہ ہو تُو

وقتِ "کُن" جو دلِ یزداں میں ہُوا تھا بیدار
میرے دِل میں بھی وہی آ کے جگا دے جادُو

کفر سجدے میں گرے، دین کی نبضیں چھُٹ جائیں
آج آ دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسُو

میں ہُوں وہ رند جسے دیکھ کے کہتے ہیں ملک
آفریں باد بر ایں خلوتِ جام و سبُو

عقل حیراں ہے کہ کس طرح میسّر ہو گا
عشق کہتا ہے کہ فردوس ہے تیرا پہلُو

کیفِ مستی میں گہر بار کر اُن آنکھوں کو
غمِ ہستی سے ٹپکتے نہیں جن کے آنسُو

آ! پلا پھر سے مئے اسرارِ سکُون و جُنبش
اے بہ تمکیں حرمِ قدس و بہ شوخی آہُو

آج یوں دل میں لطافت سے ہے ارماں بے چین
جیسے طاعت میں بدلتے ہیں فرشتے پہلُو

خاک مست، آب رواں، تند ہوائیں سرشار
آج اپنے پہ عناصر کو نہیں ہے قابُو

آج اے نُورِ نگاہِ قمر و بنتِ سحاب
کاش میرا سرِ شوریدہ ہو تیرا زانُو

پُرسشِ چند نفس، اے مرے سرمایۂ شوق
زحمتِ چند قدم، اے مرے سروِ دلجُو

آج اے جوشؔ ترے رنگِ غزل گوئی سے
قندِ پارس کا مزا ہے بہ زبانِ اُردو

جوشؔ

سوشیلا یا سرلا؟

میرے والد بھاگلپور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کا نام سریندر ناتھ تھا۔ میرا نام امرناتھ ہے۔ میرے مکان کے پاس ہی میرے والد کے ایک دوست وکیل چندر ناتھ رہتے تھے، میں بچپن میں ان کے مکان میں روزانہ کھیلنے جایا کرتا تھا۔ چندر ناتھ صاحب کو میں چچا جان، اور ان کی اہلیہ کو چچی اماں کہا کرتا تھا۔ چچی اماں کے اس وقت تک کوئی آل اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں، مجھے گود میں بٹھا کر مٹھائی کھلاتی تھیں، منہ دھو دیتی تھیں، بالوں میں کنگھی کر دیتی تھیں، جب میں گھر لوٹنے لگتا تھا تو وہ میرا منہ چوم کر کہتی تھیں ـــــ "کل پھر آنا بیٹا!" ماں جب کبھی مجھے مارتی تھیں تو میں چچی اماں کے پاس جا کر چغلی کھاتا تھا۔

مگر چچی اماں کے ہاں میری توقیر کچھ دنوں بعد گھٹ گئی۔ کیونکہ جب میری عمر سات سال کی تھی ان کے ہاں دو لڑکیاں توام پیدا ہوئیں، اس وقت میں اسکول میں بھرتی کرایا گیا تھا۔

چچی اماں کی دونوں لڑکیاں دن پر دن بڑی ہونے لگیں۔ میں بھی ایک درجے سے دوسرے درجے میں پاس ہو کر جانے لگا میں نے چچی اماں کے ہاں آنا جانا کم کر دیا تھا، البتہ ان کی دونوں لڑکیاں میرے ہاں آ کر کھیلا کرتی تھیں۔ ایک لڑکی کا نام سوشیلا دوسری کا نام سرلا تھا۔ توام ہونے کے باعث دونوں لڑکیاں یکساں نظر آتی تھیں۔ کون سوشیلا اور کون سرلا ہے، یہ پہچاننا لوگوں کے لئے بہت مشکل تھا پھر طرہ یہ کہ چچی اماں دونوں کو یکساں پوشاک پہناتی تھیں، دونوں کے بال ایک ہی طرز سے سنوارے جاتے تھے، ایک ہی وضع اور رنگ کے فراک، ایک ہی قسم کے موزے، ایک ہی رنگ کے جوتے انہیں پہنائے جاتے تھے۔ ہمارے مکان میں دونو ایک ساتھ آتی تھیں۔ اگر اتفاق سے ان میں سے کوئی اکیلی آتی تو گھر کے سب لوگ سوال کئے بغیر نہ رہتے "تم سوشیلا ہو یا سرلا؟" تب وہ اپنا نام بتاتی تھی۔

ہمارے مکان کے پیچھے باغیچہ تھا۔ ایک طرف پھولوں کے تختے تھے دوسری طرف پھلوں کے جھاڑ۔ میں کبھی سوشیلا کو کبھی سرلا کو، کبھی دونوں کو باغیچے میں لے جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے ہاتھ سے امرود توڑنا چاہتی تھیں، جب بہت ضد کرتیں تو میں یکے بعد دیگرے اپنے کندھے پر انہیں بٹھا کر ان کے ہاتھ سے امرود تڑواتا تھا، اس وقت وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ سوشیلا اور سرلا کی عمر پانچ سال کی تھی۔ ایک دن میرے سامنے چچی اماں نے میری والدہ سے کہا ـــــ "بہن سوشیلا یا سرلا دونوں میں سے کسی ایک کی شادی امرناتھ کے ساتھ کرنی ہوگی"۔ اماں جان نے کہا ـــــ "اچھا کر لوں گی، اب تک تم چچی رہیں اب

ساس ہوجاؤ گی'!

بارہ سال کے سب لڑکے اس بات کو سمجھتے ہیں یا نہیں مجھے خبر نہیں ہے، مگر میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا، شاید بچپن میں وقت کے پہلے ہی میں پکا ہوا تھا۔ دوسرے دن میں نے اسکول میں جاکر اپنے ہم سبق اور دلی دوست ہری سے کہا ——"میری شادی ہوگی"۔

ہری نے پوچھا —— کب

میں نے کہا —— یہ تو میں نہیں جانتا، شاید بڑے ہوجانے پر جب میں بی اے پاس کرلوں گا۔

ہری نے کہا —— تب بہت دیر ہے، اچھا کس کے ساتھ؟

میں نے کہا —— چندر ناتھ صاحب وکیل کی لڑکی کے ساتھ۔

اس نے پوچھا —— کون؟ وہی سوشیلا سرلا؟

میں نے کہا —— ہاں۔

اس نے پوچھا —— مگر ان میں سے کس کے ساتھ؟

میں نے کہا —— یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ دونوں میں سے کسی سے بھی۔

وہ کہنے لگا —— تم کسے پسند کرتے ہو؟

میں نے کہا —— یہ میں کیسے کہوں۔ دونو ایک ہی سی تو ہیں۔

ہری مجھ سے دو تین سال بڑا تھا، وہ اس وقت چوری سے سگریٹ پیتا تھا، اور ناول اور افسانے پڑھا کرتا تھا، ان معاملوں کی اسے مجھ سے بہت زیادہ معلومات تھیں۔ اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا —— "تمہارے ماں باپ اگر تم سے دریافت کریں کہ تم سوشیلا سے شادی کرنی چاہتے ہو یا سرلا سے تو تم کیا جواب دو گے؟"

میں نے کہا —— ہاں! کیا جواب دوں، بھائی تم ہی مجھے بتاؤ کہ کیا جواب دینا چاہئے؟

ہری نے کچھ دیر تک سوچ کر کہا —— اس معاملے میں سب سے زیادہ دھیان دینے کے قابل بات پریم ہے۔ میں نے کئی ناولوں میں پڑھا ہے کہ بغیر محبت کی شادی سے لوگ شادکام نہیں ہوتے۔ اب تمہیں یہ پتہ لگانا چاہئے کہ سرلا اور سوشیلا دونوں میں سے کون تم سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ جو زیادہ محبت کرے اسی کے ساتھ شادی کرنا"۔

"اچھا" کہکر میں پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

دوسرے دن اتوار تھا، سوشیلا اور سرلا کے آنے پر میں ان لوگوں کو لے کر باغ میں پہنچا، پھول توڑ کر دیئے اور پوچھا۔

"تم میں سے کونسی مجھے زیادہ پیار کرتی ہے، جو مجھے زیادہ پیار کرے گی اس سے میں اپنی شادی کروں گا۔"
سرلا نے منت زا آواز میں کہا —— میں زیادہ پیار کرتی ہوں، امرناتھ بھیا تم مجھی سے شادی کرو؛
سوشیلا بولی —— نہیں بھیا تم اس سے شادی مت کرنا میں زیادہ پیار کرتی ہوں۔ تم مجھ سے شادی کرنا!"
سرلا بولی —— ہاں تجھ سے کیوں شادی کریں گے۔ تو نے اس دن امر بھیا کو کاٹ کھایا تھا۔ یاد نہیں ہے امر بھیا کے پاؤں میں اب تک اس کا نشان ہے۔
سوشیلا نے بڑی عاجزی اور انفعال کے ساتھ کہا —— اب میں کبھی تمہیں نہیں کاٹوں گی امر بھیا۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں تم مجھ سے شادی کرو!
سوشیلا پر سرلا جو الزام لگا رہی تھی اس کی اصلیت یہ ہے —— قریب دو مہینے پہلے امرود توڑنے کے لئے میں نے سوشیلا کو اپنے کاندھوں پر چڑھایا تھا۔ اسے اُتارتے کے وقت میری لاپروائی سے وہ گر پڑی۔ گر پڑنے پر وہ بہت ناراض ہوئی اور میرے پیر کے پٹھے میں بڑے زور سے کاٹ لیا۔ اس کے تیز دانت اندر گڑ گئے تھے اور خون نکل آیا تھا۔
مجھ سے شادی کرنے کے لئے دونوں بہنوں میں لڑائی ہونے لگی۔ آخر میں سوشیلا رو پڑی۔ میں نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا —— تم لوگ مت روؤ۔ میں تم دونوں سے شادی کروں گا!

(۲)

سولہ سال کی عمر میں میں نے میٹریکولیشن پاس کیا۔ تب تک بھاگل پور میں کالج نہیں کھلا تھا۔ مجھے کلکتہ میں ایف اے پڑھنے کے لئے جانا پڑا۔ ٹھیک وقت پر میں نے بی اے اور ایم اے پاس کیا، پھر قانون پڑھنے لگا۔
تعطیلات میں گھر آکر دیکھتا تھا، سوشیلا اور سرلا ایک ہی طرح کی ہیں، کون سوشیلا اور کون سرلا ہے یہ پہچاننا سخت دقت طلب تھا۔ دس گیارہ سال کی ہو جانے پر انہوں نے فراک پہننا چھوڑ دیا تھا، اب ساری باندھتی تھیں، لیکن اب بھی ان کی ماں انہیں ایک ہی قسم کی، ایک ہی کنار کی ساری پہناتی تھیں، اور ایک ہی قسم کے بلوز، وہ دونوں وہاں کے کالج میں پڑھتی تھیں۔
کئی سال تک سوشیلا اور سرلا مجھ سے پہلے کی طرح ملتی جلتی رہیں مگر بڑی ہو جانے کے ساتھ ساتھ ان کا آنا جانا کم ہوتا گیا۔ میں شروع شروع میں، کلکتے سے جب گھر آنے لگتا تو ان کے واسطے کھلونے اور تصویروں کی کتابیں لایا کرتا تھا، اگر پھر بند کر دیا۔ اب ان کے والدین ان لوگوں کو مکان سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔ جب کبھی وہ میرے گھر آتی تھیں تو والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھا کرتی تھیں، میں کبھی ان کے مکان میں جاتا تو چچی اماں سے باتیں کر کے چلا آتا۔
دسہرے کی چھٹی ختم ہونے میں دو ایک دن باقی تھے، دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں ایک ناول پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا

جب سو کر اُٹھا تو والدہ صاحبہ میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ دو چار باتوں کے بعد کہا ـــــ بیٹا بچپن سے تمہاری چچی اماں کی یہ آرزو ہے کہ سوشیلا یا سرلا سے تمہاری شادی ہو۔ یہ تم بھی جانتے ہی ہوگے، بارہا ہم لوگ اس کے متعلق گفتگو کرتے رہے ہیں۔

میں نے کہا ـــــ جی ہاں مجھے معلوم ہے۔

والدہ صاحبہ بولیں ـــــ تمہیں اس معاملے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟

میں نے کہا ـــــ میری خوشی یا ناخوشی کا آپ کیوں خیال کرتی ہیں! آپ کی مرضی پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔

والدہ کہنے لگیں ـــــ بیٹا یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم بڑے فرمانبردار ہو مگر ہاں ایک بات تم سے پوچھنا ہے۔ تمہارے وکیل چچا نے ایک بر پسند کیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک لڑکی تم پسند کرلو تو پھر دوسری وہاں بیاہ دی جائے سوشیلا اور سرلا میں سے تمہیں کونسی پسند ہے؟

میں نے پہلے ہی سے اپنے دل میں ایک کو پسند کر رکھا تھا، پھر بھی والدہ صاحبہ کی رائے معلوم کرنے کے لئے میں نے پوچھا ـــــ دیکھنے میں دونوں یکساں لگتی ہیں آپ کسے پسند کرتی ہیں۔

والدہ کہنے لگیں ـــــ دونو یکساں لگتی ہیں، ساتھ ہی ان کا مزاج اور طرزِ گفتگو بھی ایک سا ہے۔ میں تو ان کو جنم سے دیکھتی آرہی ہوں۔ عیب و ہنر میں دونو یکساں ہیں، مگر شاید سرلا کا مزاج درشت ہے۔

میں نے پہلے ہی اپنے دل میں طے کر رکھا تھا کہ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنی پڑی تو میں سوشیلا کے ساتھ شادی کروں گا۔ بچپن میں اسی نے مجھے کاٹ لیا تھا اور اس کے دانتوں کا نشان ابھی تک میرے پاؤں میں تھا، ایک طرح اس نے گویا نشان لگا کر مجھ پر اپنا دعوےٰ ثابت کر دیا تھا، اس کے علاوہ کاٹ لینے کے جرم میں اس سے شادی کرنا نامنظور نہ کروں اس ڈر سے وہ پانچ برس کی عمر میں نہ جانے کتنی گھبرا کر روئی تھی، اس وقت کی سوشیلا کی گریہ وزاری مجھے فراموش نہیں ہوئی تھی میں نے والدہ صاحبہ سے عرض کیا ـــــ آپ سوشیلا کو مانگئے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا ـــــ اچھا۔

میرے سوشیلا کو پسند کرنے کے بعد بر کے والد سرلا کو دیکھنے آئے، پسند کر لیا، شادی کی تاریخ معیّن ہوئی، چچی صاحبہ دونو لڑکیوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی تھیں۔ ایسا ہی ہوا۔ جن صاحب سے سرلا منسوب تھی وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال بڑے تھے، ان کا نام سروج تھا۔ وہ پٹنہ میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کا کام کرتے تھے۔

میری آرزو تھی کہ شادی کی پہلی رات کو جب میری شریکِ حیات میرے سامنے آئے گی تو میں پوچھوں گا "تم سوشیلا ہو یا سرلا؟" مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ بہو اکیلی نہیں آتی، اس کے ساتھ کئی عورتیں بھی کمرے میں آتی ہیں، اس لئے کچھ دیر تک یہ سوال نہ کر سکا۔ جب کمرے سے سب چلی گئیں تو میں نے اپنی رفیقۂ حیات کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "اجی تم سوشیلا ہو یا سرلا؟"

جو بچپن میں کاندھے پر چڑھا کر امرود کھلاتا تھا اور جسے کاٹ کر خون بہا دیا تھا، نئی بہو ہونے کے باوجود اس سے شرمانا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ مطلق نہ شرمائی، میرا مذاقیہ سوال سُن کر اس نے بھی مذاق کیا ---- "کس کے ملنے پر تمہیں زیادہ خوشی ہوتی؟"

میں نے مسکرا کر کہا ---- سرلا کے!

سوشیلا بولی ---- اسے تو کوا لے گیا، اب ہائے ہائے کرنے سے کیا ہوتا ہے!

سروج قدرے سیاہ فام تھا، اسی لئے سوشیلا نے "کوا" کہکر اس کی پھبتی اڑاتی تھی۔

(۳)

دوسرے سال میں وکالت پاس کر کے بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگا۔

سوشیلا ہمارے ہی گھر زیادہ رہتی تھی، کبھی کبھی ماں کے پاس بھی رہتی تھی۔ دونو بہنوں کے اکٹھا ہونے پر چچی اماں یا میری ساس ان کو اب یکساں لباس نہیں پہناتی تھیں مبادا سروج اور میں مغالطے میں پڑ جائیں، میں اسی محلے میں رہنے والا داماد تھا، اور اکثر سسرال جاتا تھا اور مغالطے میں شاید سرلا کو سوشیلا سمجھ بیٹھوں اس خوف سے وہ ہمیشہ سوشیلا کو میرے گھر کا لباس پہناتی تھیں۔ مگر ساس کو زیادہ دنوں تک خبردار رہنے کی ضرورت نہ رہی، ایک دن پٹنے سے تار آگیا کہ سروج ہیضے میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔

سرلا بیوہ عورتوں کے لباس میں ملبس ہو کر میکے آئی، دو توام بہنوں کی پوشش کا یہ فرق دیکھنے والوں کو مغموم بنانے لگا اور ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سال بھر میں والد صاحب نے معلوم کر لیا کہ میں وکالت نہیں کر سکتا، چنانچہ ان کے حسب ارشاد میں نے منصفی کے لئے درخواست دے دی۔

سرلا کے بیوہ ہونے کے ایک سال بعد پٹنہ میں بڑے زور کی پلیگ نمودار ہوئی اور اسی میں میری ماں اور میرے باپ دونو ایک ہی ہفتہ میں اس فانی دنیا سے رحلت کر گئے۔ اس غم سے میں مہینہ بھر پاگل سا رہا۔ اس کے بعد گزٹ میں میرے منصف ہو جانے کی اطلاع شائع ہوئی۔ پہلے تو میں ملازمت کے لئے تیار نہ ہوتا تھا لیکن سسر صاحب کے سمجھانے پر رضامند ہو گیا۔ کچھ اسباب فروخت کر دیا، کچھ مکان کے ایک کمرے میں بند کر کے مکان کرائے پر دے دیا اور منصفی کے عہدے کا چارج لینے کے لئے میں سوشیلا کو ہمراہ لے کر موتی ہاری چلا گیا۔

اس نئی جگہ پر سوشیلا کی خدمت گزاری اور دلدہی سے، آس پاس کے خوبصورت مرغزاروں سے، اور آب و ہوا کی تبدیلی سے میرے آلام میں بہت تخفیف ہوتی گئی اور میں چند روز میں اپنی اصلی حالت پر آگیا، نوکری میں میری تعریف ہونے لگی۔ تعطیل کے دنوں میں جب میں بھاگلپور جاتا تو اپنے سسر کے مکان پر ٹھہرتا تھا۔

اس سال دسہرے کی چھٹیوں میں بھاگلپور جا کر دیکھا سسر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے وزیگاپٹم میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور جانے کی تیاری کر رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ایک ماہ وہاں رہ کر لوٹ آئیں گے مگر ساس کی ضد تھی کہ اوائل دسمبر تک وہاں رہیں گے مجھ کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہنے لگے۔ میں راضی ہو گیا، جس جگہ ہم لوگوں نے مکان لیا تھا وہ بالکل سنسان تھی شہر سے ایک میل دور، صبح اور شام ہم لوگ ٹہلنے نکلتے تھے یہاں آکر ساس نے سرلا کو عمدہ عمدہ ساریاں اور دو چار زیور بھی بنائے۔

تعطیل ختم ہو گئی، موتی ہاری کی معاودت کا میں سامان کرنے لگا، سوشیلا آکر بولی ــــ ماں اور بابو کی یہ آرزو ہے کہ میں دو مہینے اور یہاں رہوں مگر ان میں تم سے کہنے کا حوصلہ نہیں ہے۔

میں نے کہا ــــ تمہاری کیا خواہش ہے؟

سوشیلا بولی ــــ وہاں تنہا رہنے میں تمہیں تکلیف ہو گی۔ ورنہ دو مہینے میں یہاں رہتی . . . . "

میں نے محسوس کیا کہ سوشیلا کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ دو ماہ اپنے والدین کے پاس رہے، میں نے مسکرا کر کہا ــــ نہیں مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ دو مہینے یہاں رہو۔ انہی کے ہمراہ واپس آجانا۔ میں کسی اتوار کو بھاگلپور آکر تمہیں لے جاؤں گا۔

سوشیلا کہنے لگی ــــ تب میں اماں سے کہنے جا رہی ہوں کہ آپ مجھے چھوڑ جانے پر رضامند ہیں۔

(۴)

میں موتی ہاری لوٹ آیا۔

موتی ہاری ضلع میں کئی بڑے بڑے بن ہیں۔ میرے مکان میں بھی میری معشوقہ کے نہ رہنے سے بن کا سا سناٹا طاری رہتا تھا میں نے بڑے دکھ سے دو مہینے کاٹے، ہر پانچ چھ دن کے بعد سوشیلا کا خط آتا تھا، اس سے میرا دکھ کچھ کم ہو جاتا تھا۔ میں اس کے واپس آنے کا انتظار کرتا اور بہت بیقرار رہتا تھا۔

دسمبر کے پہلے ہفتے میں سسر صاحب کا ایک خط موصول ہوا، جس میں مرقوم تھا:۔

"بیٹا! افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ جمعہ کے دن شام کو تین دن بخار میں مبتلا رہ کر، سرلا کا انتقال ہو گیا۔ اس جوانا مرگ کی بے وقت موت سے ہم لوگ دیوانے ہو گئے ہیں۔ طے کیا ہے کہ کچھ دن کے لئے بنارس چلے جائیں۔ آئندہ اتوار کو آٹھ بجے شب کے ہم لوگ موکاما جنکشن سے گزریں گے، تم اگر چند روز کی رخصت لے کر ہمارے ساتھ چلو تو ہم لوگ بہت ممنون ہوں گے بیٹا! اس رنج وغم کے عالم میں اگر تم ہمارے پاس چند روز رہو گے تو ہمیں بہت تسکین ہو گی۔ اس معاملے میں زیادہ لکھنا فضول ہے۔"

خط پڑھ کر میں ایک سکتے کے عالم میں رہ گیا، دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے، بچپن میں ان دونوں بہنوں میں

کتنی باہمی موانست تھی۔ ایک کو بخار آنے پر دوسری کو بھی بخار آجاتا تھا۔ بڑی ہونے پر اتنی موانست تو نہیں تھی، مگر کیا ہوا یہ موت کا معاملہ ہے! اگر میری سوشیلا کی موت ہوجائے۔ . . . میں تو زندہ درگور ہوجاؤں گا۔ اُف! . . . . .‘‘

بڑے دن کی چھٹی ہونے میں ابھی دیر تھی، کچہری جاکر میں نے جج صاحب سے استدعا کی کہ پیر کے دن سے بڑے دن کی چھٹی شروع ہونے تک مجھے رخصت مرحمت فرمائی جائے۔ رخصت منظور ہوگئی۔ میں نے سسر صاحب کو تار دے دیا۔

مقررہ دن موکاما جنکشن پر سسر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک سکینڈ کلاس کا کمرہ ریزرو کرکے جارہے تھے۔ میں بھی اسی کمرے میں بیٹھ گیا۔ ساس مجھے دیکھ کر آنکھیں ساری کے پلو میں چھپا کر آہ وزاری کرنے لگیں، سوشیلا بھی رو رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے ڈھارس بندھاؤں۔ اس کے گوہریں آنسو پونچھ دوں، مگر ساس سسر کے روبرو یہ محال تھا۔ سسر صاحب آنکھیں صاف کرکے سرلا کی بیماری اور اس کے علاج کا ذکر فرمانے لگے۔

دانا پور اسٹیشن پر پوری مٹھائی خریدی گئی، سسر صاحب نے کہا ــــ بیٹی سوشیلا! دیکھو تو ڈبیا میں پان ہیں یا نہیں، نہ ہوں تو خرید لیں۔

سوشیلا نے اُٹھ کر ڈبیا کھولی۔ والد صاحب کو دکھائی کہ اس میں پان نہیں تھے۔ پان کے بیڑے خرید کر ڈبیا میں بھر لئے گئے۔

ساس نے دو پتوں پر ہم لوگوں کو پوری مٹھائی پیش کی اور بولیں ــــ سوشیلا ان کو دو گلاس پانی دو بیٹی؛ سوشیلا نے اُٹھ کر دو گلاس پانی میرے اور سسر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ ہاتھ دھوکر پان چباتے چباتے میں باہر کی جانب نظر کئے بیٹھا رہا۔ ساس اور سسر کبھی کبھی لمبے سانس لے رہے تھے، سوشیلا اب نہیں رو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ہی آنکھیں چار ہوں بدیں خیال میں کبھی کبھی اس کی جانب تاک لیتا تھا۔ مگر وہ بدن سمٹائے ہوئے نیچی گردن کئے بیٹھی ہوئی تھی۔

آرہ اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو میں نے سسر صاحب سے کہا ــــ ’’میں اب اس کمرے میں سونے کے لئے جارہا ہوں‘‘ اور اپنا بستر کا بنڈل لے کر چلا گیا۔

(۵)

بنارس پہنچ کر ایک پنڈے کے مکان پر ٹھہرے۔ خیال تھا کہ دو ایک روز توقف کرکے کوئی مکان تلاش کریں اور کرائے پر لے لیں گے۔ مکان پر سامان رکھ کر گنگا اشنان کرنے اور معابد کی زیارت کرنے لگے۔ واپس آکر کھانا کھاتے پیتے شام ہوگئی سسر صاحب اور میں ایک کمرے میں سوئے، ساس اور سوشیلا دوسرے کمرے میں۔

رات کو ہم لوگوں نے صرف مٹھائی ہی کھائی، سسر صاحب مجھ سے باتیں کرنے لگے، میں بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ میں

سوچ رہا تھا کہ اب سسر صاحب کچھ دیر کے لئے باہر چلے جائیں گے اور میری سوشیلا میرے کمرے میں آئے گی۔ رات دن ایک ساتھ رہنے پر بھی ہم لوگ باہم گفت گو نہ کر سکے تھے، میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملتے ہی وہ نظریں نیچی کر لیتی تھی۔ سوشیلا کو اپنی آغوش میں لے کر اس کی پیشانی کو بوسہ دینے کی خواہش نے مجھے بے قرار کر دیا تھا۔

رات کے جب دس بجے تو ساس اندر آ کر بولیں ـــ اب آپ لوگ کمرے کا دروازہ بند کر کے سو جائیے۔

سسر صاحب بولے ـــ تم لوگ بھی سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔

ساس نے پوچھا ـــ مکان ملا؟

سسر نے جواب دیا ـــ ہاں پنڈا جی کہہ رہے ہیں کہ دو تین اچھے مکان خالی ہیں، کل صبح دکھا دیں گے۔ پھر جو مکان ہم لوگوں کو پسند آئے . . . . "

"اچھا" کہکر ساس چلی گئیں، سسر صاحب نے اُٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

میں مُنہ پھیر کر چپ چاپ لیٹا رہا۔ دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سسر صاحب خرّاٹے لینے لگے مگر مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ آخر کار میں بھی کسی طرح اپنے دل کو سمجھا کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح ہاتھ مُنہ دھو کر پنڈا جی کے ساتھ مکان کی تلاش میں ہم لوگ روانہ ہوئے۔ کچھا میں ایک مکان تھا، اسے ہم لوگوں نے پسند کیا، پنڈا نے دو ملازم بھی دینے کا وعدہ کیا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ نئے مکان میں اُٹھ گئے، بہت دنوں کے بعد آج سوشیلا سے باتیں کرنے کا موقع نصیب ہوگا یہ سوچ کر میری طبیعت بہت مسرور ہو رہی تھی۔

رات کو شہر کی سیر سے فارغ ہو کر جب ہم واپس آئے، تو نو بج گئے تھے۔ کھانا کھاتے پیتے دس بج گئے۔ بہت بے تابی سے میں اپنے کمرے میں سوشیلا کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد سوشیلا آئی اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کسی غریب کو ناگہاں کثیر دولت مل جانے پر جو خوشی ہوتی ہے وہی حال میرا تھا۔

اتفاقاً میرے مُنہ سے وہی پرانا مذاقیہ جملہ نکل گیا ـــ "تم سوشیلا ہو یا سرلا؟"

بے ساختہ مُنہ سے نکل گیا لیکن مجھے بڑی ندامت محسوس ہونے لگی۔ یہ کونسا مذاق کا محل تھا؟ اس بے چاری کی بہن ابھی مری ہے!

چارپائی پر میرا بستر تھا مگر سوشیلا میرے بستر پر نہ آئی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور وہ دور کھڑی تھی، جب میں نے بہت اصرار کیا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی جو پاس ہی رکھی تھی۔ میں نے کہا ـــــ سوشیلا پیاری! میں معافی چاہتا ہوں۔ سرلا اب نہیں ہے۔ میں نے تمہیں ناحق صدمہ پہنچایا، مجھے اب اس قسم کا مذاق نہیں کرنا چاہئے۔

یہ کہتے کہتے میں نے اس کو پکڑ کر بستر پر بٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

سوشیلا چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی ـــــ "مجھے مت چھونا"

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور پوچھا ـــــ کیوں تم مجھے چھونے کو کیوں منع کر رہی ہو؟

اس نے کہا ـــــ میری طرف خوب غور سے دیکھ لو کیا میں تمہاری سوشیلا ہوں؟

اس کے سنجیدہ لہجے کو دیکھ کر میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ میں بولا ـــــ ہاں تم ہی سوشیلا ہو!

اس نے کہا ـــــ نہیں میں تمہاری سوشیلا نہیں ہوں، تمہاری سوشیلا تو ویزاگاپٹم کے مقام والٹیر میں جلا دی گئی!

اتنا کہہ کر وہ آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے: دنیا میری نگاہوں میں گردش کرتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا جسم، میرے جسم کا رواں رواں لرز اُٹھا، اپنے دونو ہاتھوں سے آنکھیں بند کرلیں، میں خدا کو یاد کرنے لگا، مجھ سے بیٹھا نہیں گیا، میں لیٹ گیا، پانچ منٹ تک میں بے ہوش سا رہا، اس کے بعد آنکھیں کھولیں، میں ٹکٹکی باندھے اس کو تکنے لگا مگر وہ سوشیلا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے یہی مجھے خیال ہونے لگا۔ اور کوئی اس کی غلط بیانی کو باور کرے مگر میں تو چھ برس اس کے ساتھ رہا ہوں، بھلا میں کیسے تسلیم کرسکتا ہوں کہ وہ سوشیلا نہیں ہے؛ میں سوشیلا کو اچھی طرح جانتا ہوں، میں نے کہا ـــــ "سوشیلا تم کیسا فضول مذاق کر رہی ہو؟"

وہ بولی ـــــ مذاق نہیں ہے سوشیلا سچ مچ میں مرگئی ہے۔

میں نے کہا ـــــ مگر سسر صاحب نے تو لکھا تھا کہ سرلا مرگئی ہے۔

وہ کہنے لگی ـــــ اباجان کو ہوش کہاں تھا؛

میں نے کہا ـــــ کیا کہہ رہی ہو؟

وہ بولی ـــــ جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں، سوشیلا کے مرجانے کے دوسرے دن اباجان نے اماں سے کہا ـــــ "ہم لوگوں کو یہاں کوئی پہچانتا نہیں ہے، سوشیلا نہیں مری سرلا مری ہے، اس عمر میں سرلا کا رنڈاپا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا، دن اور رات میرا کلیجہ جل کر خاک ہو رہا ہے، آج سے وہ سرلا نہیں ہے سوشیلا ہے وہ اب اپنے شوہر کے پاس رہے!"

میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیدار ہوں یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے پوچھا ـــــ پھر اماں نے کیا کہا؟

اماں نے کہا ـــــ یہ بھی کہیں ممکن ہے، سرلا سوشیلا بن کر شوہر کے پاس رہیگی! داماد کیا یہ دھوکا نہیں معلوم کر سکیگا؟ اور فرض کرو داماد کو پتہ نہ لگے۔ نہ سہی، مگر اوپر ایشور تو ہے، وہ تو سب جانتا ہے، اسے کیسے دھوکا دو گے؟ اس فانی دنیا میں چند روز کے لئے سرلا سکھ سے رہ لے گی مگر عاقبت میں؟ ...... " یہ کہہ کر سرلا چپ ہو گئی۔

میں بھی کچھ دیر تک خاموش رہ کر معاملے کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

پھر میں نے پوچھا ـــــ پھر کیا باتیں ہوئیں؟

وہ بولی ـــــ پھر ابا جان نے کہا میں عاقبت کا قائل نہیں ہوں، ماں بولیں ـــــ نہ قائل ہو مگر انسان اور انسان کے مابین صداقت شعاری کے تو قائل ہو، ایمانداری اور بے ایمانی کے فرق و امتیاز کو تو مانتے ہو؟ والد صاحب نے کہا ـــ یہ میں مانتا ہوں۔ آخر میں ان دونوں کی یہ رائے قرار پائی کہ عورت مرنے پر چھوٹی سالی سے لوگ شادی کرتے ہیں، بنارس میں بیوہ عورتوں کا شیو بیاہ ہوتا ہے یہ تمہیں راضی کر کے تم سے میرا شیو بیاہ کرانے ہی کے لئے والد صاحب یہاں آئے ہیں اور تمہیں بھی بلایا ہے، اب تمہاری کیا رائے ہے، معلوم کرنے کے لئے انہوں نے تمہاری خدمت میں بھیجا ہے۔"

میں کچھ جواب نہ دے سکا، آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ "یہ کون ہے؟ میں کس سے باتیں کر رہا ہوں، کون کہتا ہے کہ یہ سوشیلا نہیں ہے؟ سوشیلا اور سرلا ان میں سے یہ کون ہے؟ فرق ہی کیا ہے؟ یہ تو بعینہٖ میری سوشیلا کی طرح باتیں کر رہی ہے؟"

اگر یہ نہ کہتی کہ میں سرلا ہوں تو میں اسے سوشیلا ہی سمجھ کر گلے سے لگاتا، میں نے آنکھیں کھولیں، سرلا اسی طرح سراپا انتظار تھی۔

میں نے کہا ـــ اچھا تمہاری کیا رائے ہے؟

وہ بولی ـــ "میں نہیں جانتی" پھر منہ پھیر کر رونے لگی، تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر چلی گئی۔

\+ +

ایک ہفتے کے بعد میرا سرلا کے ساتھ عقدِ ثانی ہو گیا۔

جب ملاقات کی پہلی رات آئی تو سرلا نے کہا ـ "یاد ہے تم سے شادی کرنے کے لئے ہم دونوں بہنیں خوب روئی تھیں تو تم نے کیا کہا تھا؟"

میں بولا ـــــ ہاں یاد ہے، میں نے کہا تھا روز مت میں تم دونوں سے شادی کروں گا!"

سرلا کہنے لگی ـــــ آخر تم نے یہی کیا۔

سرلا کا نام اس دُنیا سے معدوم ہو چکا جس سے میں نے عقد کیا وہ سوسائٹی میں سوشیلا سمجھی جاتی ہے۔

ـــــــــــــــــ

حسن عزیز جاوید

غزل

کیا خبر، اصلِ دوسرا کیا ہے
روح ہے یا کہ مادہ۔ کیا ہے

اب ہمیں علم ہے، خدا کیا ہے
اب ہمیں خوفِ ماسوا کیا ہے

اب ہم آگاہ ہیں، بقا کیا ہے
اب ہمیں خطرۂ فنا کیا ہے

کوششِ جورِ ناروا تو درست
حاصلِ جورِ ناروا کیا ہے

شکوۂ عادتِ جفا تو صحیح
چارۂ عادتِ جفا کیا ہے

شوقِ اظہارِ مدعا برحق
مشکلِ اظہارِ مدعا کیا ہے

دل کی تخریب چاہنے والو!
دل کی تخریب میں مزا کیا ہے

پرسشِ حاجتِ گدا فرما
ناقدِ حالتِ گدا کیا ہے

دردِ بیمار کا مداوا کر
شکلِ بیمار دیکھتا کیا ہے

کون اُس یارِ آشنا سے کہے
حالتِ یارِ آشنا کیا ہے

احتجاجِ سزا سے کیا حاصل
جانتا ہوں، مری خطا کیا ہے

بندگانِ بتانِ کافر کو
کون سمجھا سکے، خدا کیا ہے

کل وہ اُلفت تھی، آج یہ نفرت
ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے

زاہدو! ذکرِ شاہد و مے بھی
ناروا ہے، تو پھر روا کیا ہے

کس طرح نفیِ ماسوا نہ کروں
دہر میں اِک ترے سوا کیا ہے

ہم خبر ہی سہی، مگر یہ بتاؤ
ہم خبر ہیں تو مبتدا کیا ہے

میں مکاں کا نہ لامکاں کا مکیں
کیا بتاؤں، مرا پتا کیا ہے

اب یہ کس کو خبر، مرا رہبر
راہزن ہے کہ رہنما کیا ہے

اعتبارات کو اہم نہ سمجھ
اعتبارات میں دھرا کیا ہے

آج کل کے امیر کیا جانیں
ہم فقیروں کا مرتبا کیا ہے

اے شہِ بے نوا نواز، نہ پوچھ
حالِ آزادِ بے نوا کیا ہے

حکیم آزاد انصاری

آسٹریا کا موجودہ انقلاب

جب ڈولفس نے آسٹریا کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو اس نے آسٹریا کے استقلال و آزادی کے لئے لڑنا شروع کیا لیکن آسٹریائی نازی جن کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ آسٹریا جرمنی کے زیرِ سایہ رہے ہمیشہ اس میں سدِ راہ ثابت ہوتے رہے۔ جب آسٹریائی نازیوں نے معاملہ کو برعکس پایا تو انہوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا اور ڈولفس کو موت کے گھاٹ اس خیال کے تحت اُتار دیا کہ اس کا خاتمہ ان کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں سہولت پیدا کرے گا۔ ذیل میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان تحریکات اور جماعتوں کا ذکر کرتے ہیں جو آسٹریائی نازی بغاوت میں ممد و معاون ثابت ہوتی رہیں اور ساتھ ہی ساتھ واقعات و حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کو واضح کریں گے کہ کس طرح اُنہوں نے آسٹریا کی آزادی میں روڑے اٹکانے شروع کئے۔

جب کوئی رہنما اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑنا شروع کرتا ہے تو مخالف قوتیں ظہور میں آ کر اس کی راہ میں ہر طریقہ سے روڑے اٹکاتی رہتی ہیں اور اس کے لئے مختلف جماعتیں بھی تشکیل پاتی ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں جب ہم آسٹریا پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ جب ڈولفس نے آسٹریائی آزادی کی آواز کو بلند کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے نازیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس لئے کہ ہر ہٹلر آسٹریا پر اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے۔ چنانچہ میونخ میں آسٹریا کے خلاف جو سازش کی گئی اس سے متذکرہ بیان کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔ نازیوں کے احتجاج نے دوسری جماعتوں کو بھی اُبھرنے کا موقع دیا۔ اب ہر جماعت حکومت کے سامنے اپنے مدون کردہ دستورِ حکومت کا خاکہ پیش کرنے کی جسارت کرنے لگی۔ اجتماعیین جمہوری اصول پر حکومت کو چلانے کے حامی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک تہائی آبادی اس طرزِ حکومت کی تائید میں تھی۔ علاوہ ازیں آزاد عاقلین اور عیسائی اجتماعی جماعت بھی بڑی حد تک اسی طرزِ حکومت کی طرفدار تھی۔ اس کے برعکس ہیم وہر فاسطی طرزِ حکومت پر زور دیتے تھے۔ لینڈ بنڈ ایک حد تک قدیم پارلیمانی طرزِ حکومت کے حامی تھے۔ اس کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو سوئٹزر کے جمہوری طرزِ حکومت کو پسند کرتی تھی جس کے بانی ڈاکٹر اینڈر تھے جو اس وقت ورنبہرگ کے گورنر ہونے کے علاوہ ڈولفس کے دستِ راست سمجھے جاتے تھے۔ جب آسٹریا کی مختلف جماعتوں نے اپنے مدون کردہ طرزِ حکومت کو پیش کرنا شروع کیا تو آپس میں رقابت و عداوت کی آگ بھڑکنے لگی۔ چنانچہ اجتماعیین، ہیم وہر اور کیتھولک کے سخت مخالف ہوگئے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ اوّل اوّل ڈولفس عیسائی اجتماعی جماعت کے علاوہ لینڈ بنڈ کا بھی زیادہ حامی تھا چنانچہ اس نے لینڈ بنڈ کے رہنما ہر ونیکر کو نائب چانسلر بنا دیا تھا جو اس ممتاز عہدہ پر

گزشتہ ستمبر تک فائز رہے تھے لیکن بعد میں ڈولفس ہیم وہر کا طرفدار ہوگیا جس کی وجہ سے ہر ڈیکلر کی جگہ ہیم وہر کے راہنما میجر فی نے لے لی۔ جب میجر فی اس ممتاز عہدہ سے سرفراز کئے گئے تو انہوں نے اپنی کارستانیوں اور ریشہ دوانیوں سے مخالف جماعتوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جب مخالف جماعتوں نے اس امر پر غور کیا کہ ڈولفس خود ہیم وہر کا طرفدار ہوگیا ہے تو انہوں نے کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد ان مخالف جماعتوں نے سوچا کہ اگر وہ آسٹریائی نازی جماعت میں شامل ہو جائیں تو حکومت کے خلاف سازش کرنے کا کافی موقع نصیب ہوتا ہے۔ (یہاں قارئین کرام پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہیم وہر اور آسٹریائی نازی جماعت ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں اس لئے کہ اوّل الذکر کا منشا فاسطی حکومت کی بنا ڈالنا ہے اور ثانی الذکر کا مطمح نظر نازی تحریک کی اشاعت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تحریکات بالمنا ایک دوسرے کی سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ سیاسیات حاضرہ کا مطالعہ کرنے والے اصحاب جانتے ہوں گے کہ ہر ہٹلر کے علاوہ مسولینی بھی آسٹریا پر اپنی حریصانہ نظر لگائے ہوئے ہے۔ اگرچہ بظاہر مسولینی اپنے آپ کو آسٹریا کا حلیف اور اس کی آزادی کا حامی بتلاتا ہے)۔

سب سے پہلے لینڈ بنڈ نے نازی تحریک کی اشاعت میں دستِ تعاون دراز کرنا شروع کیا اس کے بعد اجتماعئین اور کمیونسٹ بھی اس تحریک کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے لگے۔ ان تمام مخالف جماعتوں میں اجتماعئین کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس جماعت کو ہیم وہر کے بالمقابل اس درجہ مقبولیت حاصل ہوگئی کہ مختلف جماعتوں کے علاوہ مشہور اشخاص بھی اس کے طرفدار ہونے لگے۔ اب یہاں سے ہیم وہر اور اجتماعئین میں جھڑپ ہونے لگی۔ بالخصوص ماہ فروری اور اس کے بعد سے۔ ماہِ فروری میں جو سانحۂ کبریٰ پیش آیا اس کی وجہ سے اکثر مزدوروں کو ویانا سے باہر چلا جانا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ میجر فی نے برسرِ حکومت آتے ہی حکومت کے سامنے چند ایسے مطالبات پیش کئے جن کا قبول کرنا عامۃ الناس اور بالخصوص مزدوروں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچانے کے مساوی تھا۔

ان مطالبات کے سنتے ہی مزدوروں اور بالخصوص نازیوں نے احتجاج کرنا شروع کیا۔ اس وقت نازیوں نے اپنے آپ کو اس درجہ منظم کر لیا تھا کہ ان کا ہلکا سا اشارہ بھی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کے لئے کافی تھا۔ ادھر ہیم وہر نے حکومت کو یہ دھمکی دینی شروع کی کہ اگر وہ ان کے پیش کردہ مطالبات کو قبول نہیں کرے گی تو وہ حکومت کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ملک میں خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ماہ میں ہیم وہر نے مزدوروں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا جس کی بنا پر وہ سابق سے زیادہ حکومت سے بدظن ہو کر اجتماعئین اور نازیوں میں جا ملے۔ نازیوں کو مزدوروں کی حمایت اس وجہ سے بھی حاصل ہوگئی کہ انہوں نے اس پُر آشوب زمانہ میں تباہ حال مزدوروں کی ہر طرح سے مدد کی۔ یہاں یہ کہنا بھی ازبس ضروری ہے کہ اس خانہ جنگی میں اکثر اجتماعئین تباہی کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکے تھے۔ اس وقت ان کی امداد صرف نازیوں نے کی۔ اس وجہ سے اجتماعئین نازی تحریک کے سابق سے زیادہ حامی و طرفدار ہوگئے۔ جب ان سب نے مل کر حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے شروع کئے تو میجر فی (جو اس وقت ڈولفس کے

دستِ راست تھے) ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے لگے۔ اکثر آسٹریائی نازیوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ ویانا کے لارڈ میئر کارل سیٹز کو (جنہوں نے اجتماعیین میں کافی مقبولیت حاصل کی تھی) بغاوت کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہزارہا مزدوروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر ان کے بچوں اور بیویوں کے ساتھ ناقابلِ بیان مظالم کئے گئے۔ کئی بے گناہ اجتماعی رہنما گرفتار کئے گئے جس کے بعد جیلخانوں میں ان سے طرح طرح کی بدسلوکیاں کی گئیں۔ جب باہر کے پریس ان مظالم پر مقالات لکھنے لگے اور حکومت کے طرزِ عمل کو مطعون کیا گیا تو میجر فی نے اپنے دامن کو بدنامی کے دھبے سے پاک کرنے کی خاطر باہر کے پریس کو یہ یقین دلانا شروع کیا کہ ان سب سازشوں اور خانہ جنگیوں کے بانی اجتماعیین ہیں، لیکن باہر کے پریس نے میجر فی کے اس بیان پر اس لئے اعتماد نہ کیا کہ ان کو ۱۹۲۷ء کی وہ خانہ جنگی بخوبی یاد تھی جب کہ سٹینر اور دیگر اجتماعی رہنماؤں نے بجائے خانہ جنگی میں شرکت کرنے کے عوام کو دلاسا دینے میں کافی حصہ لیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ امر خود قابلِ غور ہے کہ ہیم وہر جب عالمِ طفولیت میں تھے تو اجتماعیین کو ان پر قابو پانے کے پورے مواقع حاصل تھے لیکن انہوں نے ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا۔ آسٹریا کی سیاسیات کا مطالعہ کرنے سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ بغاوت کے ابتدائی زمانہ میں اجتماعیین نے ڈولفس کو ہر طرح سے سمجھایا اور ایک معتدل پالیسی اختیار کرنے کی ہدایت بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اس لئے کہ ڈولفس خود میجر فی کے پنجہ میں گرفتار ہو چکا تھا اور وہ بغیر میجر فی کی رضامندی کے کوئی کام سرانجام نہ دے سکتا تھا۔ جب اجتماعیین نے معاملہ کو برعکس پایا تو اُنہوں نے مجبوراً عامۃ الناس کی فلاح و بہبود کی خاطر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماعیین کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ ان سیاسی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے اس امر کا تذکرہ بھی ازبس ضروری ہے کہ ڈولفس ہیم وہر کے علاوہ کیتھولک کا بھی طرفدار ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے کیتھولک فرقہ کے رہنما کارل فنٹر کو ویانا کا نائب میئر مقرر کر دیا۔ اس تقرر کے خلاف آسٹریا کے اخبارات نے احتجاج کیا اس لئے کہ ونٹر درحقیقت مارکسین تھا جو بظاہر تو حکومت کا طرفدار تھا لیکن بہ باطن اس کا سخت مخالف۔ بالخصوص اجتماعیین نے اس تقرر کو نگاہِ نفرت سے اس لئے دیکھا کہ ونٹر اس جماعت کو جڑ سے اُکھاڑ دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس تقرر کی وجہ سے آتشِ بغاوت پہلے سے زیادہ بھڑکنے لگی۔ ازاں بعد جب پہلی مئی کو ڈولفس نے اپنے مدون کردہ طرزِ حکومت کا خاکہ عوام کے آگے پیش کیا تو اس پر ہر جماعت نے اظہارِ نفرت کیا یہاں تک کہ ڈولفس کے حامی فرقہ کیتھولک نے بھی شدت سے اس کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد جب ڈولفس نے دیکھا کہ سوائے ہیم وہر کے بقیہ تمام جماعتیں اس کی مخالفت پر کمر باندھے ہوئے ہیں اور ان کی مجموعی قوت محض اس لئے اپنا زور دکھا رہی ہے کہ وہ (یعنی ڈولفس) ہیم وہر کا حد سے زیادہ طرفدار ہو گیا ہے تو اس نے ہیپسبرگ کی واپسی پر زور دینا شروع کیا۔ ماہرینِ سیاسیات جانتے ہونگے کہ ہیپسبرگ کی واپسی ہیم وہر کے لئے پیغامِ موت سے کم نہ تھی۔ اولاً ہیم وہر نے ڈولفس کو دھمکی دینا شروع کی کہ اگر وہ ہیپسبرگ کی واپسی پر زور دے گا تو وہ (یعنی ہیم وہر) نازیوں سے جا ملیں گے۔ چند دنوں تک ہیم وہر نے توقف کیا لیکن معاملہ کو

برعکس دیکھ کر انہوں نے نازیوں کے ساتھ میل جول شروع کر دیا اور اب وہ نازیوں کی شرکت میں حکومت کے خلاف خفیہ سازشیں کرنے لگے اس طرح نازی تحریک کو ہر جانب سے تقویت حاصل ہو گئی جو بالآخر ڈولفس کے قتل پر منتج ہوئی۔

ہم نے مختصراً ان امور کو بیان کر دیا ہے جو آسٹریائی نازی بغاوت میں ممد و معاون ثابت ہوتے رہے۔ متذکرہ حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد بغیر کسی پس و پیش کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ڈولفس ہیم وہر کی حد سے زیادہ طرفداری نہ کرتے تو ان کا قتل بھی وقوع میں نہ آتا اس لئے کہ ہیم وہر سے غیر جانبداری اختیار کرنے پر دیگر جماعتوں کی تائید بھی ڈولفس کو حاصل رہتی جس کی وجہ سے نازی تحریک کی اشاعت کلیۃً ختم ہو جاتی اور اس طرح انقلاب کے رونما ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب ہمیں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اس امر پر غور کرنا ہے کہ آسٹریا آئندہ کس دور سے گزرنے والا ہے۔ ڈولفس کے قتل کے بعد جو نئی کابینہ متشکل ہوئی وہ حسب ذیل ہے:-

(۱) ڈاکٹر شوش نگ۔ چانسلر جن کے ذمہ محکمہ دفاع اور تعلیمات ہے۔

(۲) شہزادہ اشٹاہیمبرگ۔ نائب چانسلر جن کے ذمہ محکمہ حفاظت ہے۔

(۳) میجر فی۔ وزیر داخلہ۔

(۴) بیرو الڈان ایگ۔ وزیر خارجہ۔

(۵) ڈاکٹر برش۔ وزیر مالیہ۔

متذکرہ کابینہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ داخلہ، خارجہ اور حفاظت جیسے اہم شعبے ابھی ہیم وہر کے قبضے میں ہیں۔ یہ تو آسٹریا کی حالت ہے۔ ذرا جرمنی پر نظر دوڑائیے۔ فان ہنڈنبرگ کی وفات کے بعد ہر ہٹلر چانسلر کے علاوہ پریزیڈنٹ بھی ہو چکے ہیں جس کی بنا پر فوج کی باگ بھی ان ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اب قارئین کرام ان امور سے خود اندازہ لگالیں کہ آسٹریا کی آزادی معرض خطر میں ہے یا نہیں؟

عبدالقادر جیلانی بی۔ اے (عثمانیہ)

حیدرآباد دکن

*

خمستاں کے غیر مطبوعہ اوراق

موت وحیات

یہ کائنات ہے یا بحرِ زندگانی ہے
یہ انقلاب نہیں، موج کی روانی ہے

ازل سے لیکے ابد تک رواں ہے بحرِ حیات
کہاں ہے نقشِ عدم! جاوداں ہے بحرِ حیات

ہم اس کی سطح پہ مثلِ حباب ہیں گویا
خود اپنی ہستی کے رُخ پر نقاب ہیں گویا

مگر حباب یہ بن بن کے مِٹتے رہتے ہیں
اُتر کے دوش سے موجوں کیساتھ بہتے ہیں

یہی ہے نکتۂ موت وحیات اے ہمدم!
یہی ہے کون وفساد اور یہی وجود وعدم

رواں دواں ہے یہ طوفانِ اضطرابِ حیات
حباب کو ہے مگر کاوشِ حیات وممات

اثر صہبائی

پھولوں کا رقص

ننھی فیروزہ کہنے لگی" افسوس! افسوس! میرے پھول اب بالکل ہی مرگئے ہیں۔ کل شام بیچارے کتنے خوبصورت نظر آتے تھے۔ آج ان کی تمام پتیوں نے کملا کر گردنیں نیچی کرلی ہیں"۔

طالب علم قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ ننھی فیروزہ کو اس سے بہت دلچسپی تھی کیونکہ وہ غضب کی دلچسپ کہانیاں سُنا سکتا تھا اور خوبصورت ترین رنگین تصویریں کہیں سے کاٹ کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ کہیں عورتوں کے رقص کی تصویریں ہوتیں، کہیں پھولوں کی اور کہیں ایسے قلعوں کی جن کے دروازے بھی کھل سکتے۔ الغرض وہ نہایت ہی خوش وخرم لڑکا تھا۔

فیروزہ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں کے گلدستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی" انہیں کیا ہوگیا ہے، آج کیوں یہ اتنے کملا گئے ہیں؟"

طالب علم کہنے لگا" ہیں! تم نہیں جانتیں انہیں کیا ہوا ہے؟ کل تمام شب پھول رقص کی محفل میں شریک رہے ہیں، کوئی حیرانی کی بات نہیں جو یہ سر جھکا کر مزے سے اُونگھ رہے ہیں"۔

ننھی فیروزہ چلّا کر کہنے لگی" لیکن پھول تو نہیں رقص کرسکتے نا؟"

"واہ! کیوں نہیں؟ جب اندھیرا چھا جاتا ہے اور ہر کوئی پڑا سوتا ہے تو یہ خوش ہو ہو کر ادھر ادھر خوب رقص کرنا شروع کردیتے ہیں۔ تقریباً ہر رات پھولوں کے رقص کی محفل ہوتی ہے"۔

"کیا لڑکیاں بھی ان محفلوں میں شریک ہوسکتی ہیں؟"

"ہاں۔ وادی کے پھولوں کی لڑکیاں برابر وہاں آتی ہیں"۔

"خوبصورت پھول کہاں رقص کرتے ہیں؟"

"کیا تم نے اکثر ہی شہر کے بڑے دروازے سے باہر ایک وسیع قلعہ نہیں دیکھا جہاں خوبصورت باغ میں ہر سمت پھول ہی پھول نظر آتے ہیں؟ کیا تم نے راج ہنسوں کو جب وہ تمہاری طرف تیر کر آتے ہیں کبھی روٹی نہیں کھلائی؟ سن لو کہ پھولوں کی بڑی بڑی محفلیں وہیں منعقد ہوتی ہیں۔ بیشک میری بات مان لو"۔

فیروزہ کہنے لگی" کل ہی میں اور اماں اس باغ میں گئے تھے لیکن درختوں کے تمام پتے جھڑ گئے تھے اور وہاں ایک بھی

پھول نہ تھا ۔ وہ کہاں گئے ہیں پھر؛ گرمیوں میں بہت نظر آیا کرتے تھے"۔

طالب علم کہنے لگا" وہ تو قلعہ میں ہیں ۔ ادھر بادشاہ اور درباری شہر کو چلے اور اُدھر پھول دوڑ کر باغ سے قلعے میں آ گئے ۔ کبھی دیکھو تو پتہ چلے کہ وہ کس قدر خوش ہوتے ہیں ۔ دو حسین ترین پھول بادشاہ اور ملکہ بن کر ایک تخت پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ کچھ طُرّہ دار سُرخ سرخ بانکے پھول صفیں باندھ کر گردنیں جُھکا کر باقاعدہ کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ یہ امرائے دربار کہلاتے ہیں ۔ اس کے بعد طرح طرح کے خوبصورت پھول آتے ہیں اور ایک شاندار رقص برپا ہو جاتا ہے ۔ بنفشے کے نیلے پھول اپنے ننھے بحری بھائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور سنبل اور زعفران سے مل کر جنہیں یہ" نوجوان خواتین" کہتے ہیں خوب رقص کرتے ہیں ۔ سوسن، اسد رُو اور لالہ کے پھول بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں جو بیٹھے بیٹھے سب محفل پر ایک نظر رکھتی ہیں کہ کہیں کوئی خرابی واقع تو نہیں ہو گئی اور ہر بات ٹھیک ٹھیک اور نہایت باقاعدگی سے ہو رہی ہے"۔

ننھی فیروزہ نے پوچھا" لیکن وہاں ایسا کوئی نہیں ہوتا جو پھولوں کو پیٹے اور کہے کہ بادشاہ کے قلعے میں کیوں ناچتے ہو"؟

طالب علم نے کہا" کسی کو اس بات کا علم نہیں ۔ رحیل کا بوڑھا داروغہ جو رات کو قلعہ کی حفاظت کرتا ہے کبھی کبھی اندر آتا ہے ۔ اس کے پاس چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا ہوتا ہے ۔ جُونہی پھولوں کو چابیوں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی ہے وہ دوڑ کر پردوں کے پیچھے بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں صرف اپنے سروں کو جھانکنے کے لئے ذرا سا باہر نکالے رکھتے ہیں ۔ بوڑھا داروغہ آتا ہے اور آ کر کہتا ہے" ہیں! مجھے پھولوں کی خوشبو کیوں آ رہی ہے؛ لیکن پھول کہیں نظر نہیں آتے"۔

فیروزہ تالی بجا کر کہنے لگی" آہا! کیسی عجیب بات ہے کیا میں بھی اِن پھولوں کو دیکھ سکوں گی"؟

طالب علم نے کہا" کیوں نہیں ۔ اب کبھی باہر جاؤ گی تو یہ بات یاد رکھنا ۔ کھڑکی میں سے تھوڑا سا جھانک کر دیکھو گی تو تمہیں سب کچھ نظر آ جائے گا ۔ آج میں نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ نرگس کی ایک پتلی سی زرد کلی ایک صوفے پر بڑے آرام سے بیٹھی ہے وہ شاہی دربار کی ایک" خاتون" تھی"!

فیروزہ کہنے لگی" باغ نباتات کے پھول بھی ان ناچوں میں شریک ہو سکتے ہیں؛ اتنی دُور کے پھول بھی آ جاتے ہیں"؟

"ہاں! جب ان کا جی چاہے! وہ تو بھئی اُڑ سکتے ہیں نا ۔ تم نے دیکھیں نہیں وہ سرخ سرخ، زرد زرد، سفید سفید تتلیاں؛ وہ پھولوں کی ہمشکل ۔ یہ پھول ہی تو تھیں کبھی ۔ یہ پھول درختوں کی ڈالیوں سے جُدا ہو کر فضا میں آ جاتے ہیں اور وہاں ان کی پتیاں خوب پھڑپھڑاتی ہیں جیسے یہ ان کے اُڑنے کے چھوٹے چھوٹے پر ہوں ۔ اگر وہ اپنا فرض اچھی طرح انجام دیں تو انہیں شاخوں پر اپنے گھروں میں چپ چاپ بیٹھے رہنے کی بجائے ادھر اُدھر اُڑتے رہنے کی اجازت مل جاتی ہے اور اسی دوران میں ان کی پتیاں اصلی پروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ باغ نباتات کے پھول شاہی محل میں کبھی نہ گئے ہوں اور انہیں معلوم نہ

ہو کہ رات کو وہاں کتنی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے۔ میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ نباتات کا پروفیسر جو یہاں قریب ہی رہتا ہے حیران رہ جائے گا۔ تم تو اُسے جانتی ہی ہو شاید۔ جانتی ہو نا؟ اچھا تو اب کبھی جو تم باغ میں جاؤ ایک پھول سے چپکے سے کہہ آنا کہ قلعہ میں رقص کی ایک بڑی محفل منعقد ہونے والی ہے۔ پھر یہی پھول باقی سب پھولوں کو بھی یہ خبر سُنا دے گا جو جلد از جلد قلعہ میں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ جب پروفیسر باغ میں سیر کرنے آئے گا تو وہاں ایک بھی پھول نہیں ہوگا اور وہ حیران رہ جائیگا کہ اتنے پھول کہاں گئے"۔

"پر ایک پھول دوسرے پھول سے کیسے بات کرے گا؟ پھول تو نہیں بول سکتے نا؟"

"ہاں، ہاں بول تو نہیں سکتے پر اشارے تو کر سکتے ہیں! تم نے اکثر ہی نہیں دیکھا کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف سر ہلاتے ہیں اور اپنی خوبصورت پتیوں سے سرسراہٹ کی آواز نکالتے ہیں؟"

فیروزہ کہنے لگی" پر اشارے پروفیسر کی سمجھ میں آجاتے ہیں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایک صبح وہ باغ کو گیا۔ ایک گڑہل کا پھول سُرخ سُرخ گلنار کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ گلنار ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا "تم بہت حسین ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے"۔ پروفیسر دل میں کہنے لگا۔ یہ کیا نامعقول باتیں کر رہا ہے۔ اور اس نے اُسے چُپ کرانے کے لئے ایک چپت لگایا۔ پھول کو بھی غصہ آگیا اس نے بھی اپنے کانٹے جو اس کی انگلیاں تھیں پروفیسر کے ایسی چبھوئیں کہ وہ "اُف" کہہ کر رہ گیا۔ اس دن سے آج تک اس نے کبھی گڑہل کے پھول کو چھُونے کی جرأت نہیں کی"۔

فیروزہ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی" اہا ہا! کتنی اچھی شرارت ہوئی!"

ایک ڈھیٹ وکیل جو یہاں کسی کام کو آیا تھا اور صوفے پر بیٹھا تھا کہنے لگا" ایک بچی کے ذہن میں ایسے وہم نہیں سما سکتے"۔ وہ طالب علم کو ذرا پسند نہیں کرتا تھا اور جب طالب علم کاغذوں سے دلچسپ اور عمدہ تصویریں کاٹتا تو یہ وکیل غصے سے بہتیرا کچھ مُنہ میں بڑبڑاتا رہتا۔ تصویروں میں کوئی تصویر کبھی کسی ایسے آدمی کی ہوتی جو ہاتھ میں ایک دل پکڑے ہوئے صلیب پر لٹکا ہوتا، جیسے وہ لوگوں کے دل چرُاتا رہا ہے۔ کوئی تصویر کسی جادوگرنی کی ہوتی جو کسی جھاڑو کی تیلی پر سوار ہو کر اپنے شوہر کو ناک پر بٹھائے ہوئے، ہوا میں اُڑتی ہوتی۔ لیکن وکیل کو طالب علم کا مذاق پسند نہ آتا تھا اور وہ جیسا کہ اس نے اب بھی کہا تھا کہہ دیتا۔ "بچوں کی سمجھ میں ایسی واہیات باتیں کیونکر آسکتی ہیں۔ کیسی بے ہُودہ باتیں کرتے ہو!"

لیکن ننھی فیروزہ کو وہ تمام کہانیاں جو طالب علم نے اُسے سنائی تھیں کھلونوں کی طرح اچھی معلوم ہوتیں۔ وہ بہت دیر تک انہیں کے متعلق سوچتی رہی۔ پھولوں کے سر نیچے کو جھک آئے تھے کیونکہ وہ تمام رات ناچ ناچ کر بہت تھک گئے تھے اور شاید

بیمار بھی تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں اس کمرے میں لے گئی جہاں ایک خوبصورت میز پر بہت سے کھلونے پڑے تھے۔ یہ تو ایک طرف رہے، میز کی دراز بھی خوبصورت چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کی گڑیا صوفیہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ ننھی فیروزہ اُس سے کہنے لگی "صوفیہ سچ مچ اب اُٹھو بھی اور آج دراز ہی میں گزارہ کرلو۔ بیچارے پھول بیمار ہیں اپنا بستر انہیں دے دو۔ آرام کرنے سے یہ اچھے ہو جائیں گے۔" ننھی فیروزہ نے بستر سے گڑیا اُٹھالی۔ گڑیا نے بالکل چپ ہی سادھ لی۔ مُنہ سے ایک لفظ تک نہ بولی۔ شاید وہ خفا ہو گئی تھی کہ میں بستر سے کیوں نکالی گئی ہوں۔ خیر ننھی فیروزہ نے پھولوں کو بستر میں لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور اُن سے کہنے لگی "اب چپکے سے سو جاؤ اور اچھے ہو۔" اس کے بعد اس نے ان کے لئے کچھ چائے بنائی تاکہ ان کی طبیعت اچھی ہو جائے اور وہ صبح سویرے اُٹھ سکیں۔ پھر اس نے چارپائی کے اردگرد کے پردے گرا دیئے تاکہ سورج کی چمک ان کی آنکھوں پر نہ پڑے۔ تمام شام وہ طالب علم کی سنائی ہوئی باتوں پر غور کرتی رہی اور سونے سے پہلے وہ پردے اُٹھا کر باغ کی طرف جھانکنے لگی جہاں اُس کی اماں کے تمام پھول سنبل اور لالہ وغیرہ کھلے تھے۔ وہ اُن سے آہستہ سے کہنے لگی "ہاں معلوم ہو گیا ہے مجھے! آج شام رقص کو جانا ہے ہونا؟"

ایسا معلوم ہُوا کہ پھول اس کی بات سمجھے ہی نہیں۔ جواب میں ان کا ایک پتہ تک نہ ہلا لیکن فیروزہ کو اب بھی یقین تھا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے بہت دیر تک جاگتی رہی وہ سوچ رہی تھی کہ بادشاہ کے باغ میں خوبصورت پھولوں کے رقص کا نظارہ کتنا دلچسپ ہو گا "معلوم نہیں میرے پھول بھی اس وقت سچ مچ وہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سو گئی۔ رات ہی میں وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ طالب علم، پھولوں اور اس ڈھیٹ وکیل کے خواب دیکھتی رہی تھی جو طالب علم میں نقص نکالتا رہتا تھا۔

اس کے کمرے میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ لیمپ میز پر روشن تھا ننھی فیروزہ کے ماں باپ سو رہے تھے۔ "خدا جانے میرے پھول صوفیہ کے بستر ہی میں لیٹے ہیں۔ ہائے مجھے کس طرح معلوم ہو" وہ اپنی جگہ سے تھوڑی سی سرکی اور اس کمرے کے دروازے کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ جہاں اس کے کھلونے اور پھول پڑے تھے۔ یہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ جب اس نے کان لگا کر سنا تو اُسے معلوم ہُوا کہ کمرے میں کوئی پیانو بجا رہا ہے لیکن ایسے عمدہ اور ایسے دلکش انداز سے جیسے پہلے کبھی نہ بجا ہو۔ وہ دل میں سوچنے لگی "یقیناً اس وقت تمام پھول رقص کر رہے ہیں۔ ہائے میرا دل چاہتا ہے کہ انہیں دیکھوں کبھی وہ یہیں آجائیں نا۔ لیکن وہ اپنے ماں باپ کی نیند اُچاٹ ہو جانے کے خیال سے نہ اُٹھی پھول بھی اندر نہ آئے اور موسیقی ایسے دلکش اور سحر انگیز انداز سے فضا میں پھیلنے لگی کہ ننھی فیروزہ اپنے بس میں نہ رہ سکی۔ وہ اپنے چھوٹے سے بستر سے سرکی، آہستہ آہستہ دروازے کی طرف گئی اور کمرے میں جھانکنے لگی۔ اوہو! سچ مچ ہی وہاں ایک عجیب نظارہ تھا۔ لیمپ تو کوئی جل نہیں رہا تھا لیکن کمرہ پھر بھی روشن تھا۔ چاندنی کھڑکی سے اندر آرہی تھی جس سے کمرہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ سنبل اور لالے کے تمام پھول دو لمبی قطاروں میں قالین پر کھڑے تھے کھڑکی میں ایک پھول بھی باقی نہ رہا تھا اور تمام گلدان خالی ہو گئے تھے۔ پھول نہایت

سلیقے سے ایک دوسرے کے لمبے لمبے پتوں میں پتے ڈال کر چاندنی کے فرش پر چک پھیریاں لے لے کر رقص کر رہے تھے۔ ایک بڑی سی زرد نرگس پیانو بجا رہی تھی۔ فیروزہ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یقیناً یہ وہی خاتون ہے جو اس نے موسم گرما میں دیکھی تھی کیونکہ وہ طالب علم کا یہ فقرہ اب تک نہ بھولی تھی" یہ بالکل فیروزہ کی سہیلی نزہت کی ہم شکل ہے"۔ اس وقت تو سب طالب علم کی بات پر ہنس دیئے تھے لیکن اب فیروزہ کو معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ لمبے قد کی زرد نرگس واقعی اُس نوجوان لڑکی کی ہم شکل ہے۔ پیانو بجاتے وقت اس کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس کا لمبا سا زرد چہرہ کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف کو جھک آتا اور ہر تھوڑے سے وقفے کے بعد دلکش موسیقی سے مست ہو کر جھوم جھوم کر نیچے اُوپر ہونے لگتا۔ اس کے بعد زعفران کا ایک ارغوانی پودا میز کے مرکز میں کُود پڑا۔ جہاں کھیلنے کی چیزیں پڑی تھیں اور پھر بیمار پھولوں کی چارپائی سے پردے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پھول اسے دیکھتے ہی اُچک کر اُٹھ بیٹھے اور ایک دوسرے کی طرف سر ہلا کر اشارے کرنے لگے کہ ہم ناچیں گے۔ ہم ناچیں گے۔ ہم ناچیں گے ایک ٹوٹے پھوٹے مُنہ والی بدمزاج گڑیا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سر جھکا کر پھولوں کو آداب کہا اب وہ بالکل بیمار نظر نہ آتے تھے اور ادھر اُدھر ناچ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے ننھی فیروزہ کو نہ دیکھا۔ اتنے میں یوں معلوم ہوا گویا کوئی چیز زور سے میز پر سے نیچے گر رہی ہے۔ فیروزہ نے اس طرف دیکھا ایک پتلی اور چھوٹی سی چھڑی پھولوں میں ناچ رہی تھی جیسے یہ بھی ان میں سے ایک ہو تاہم یہ نہایت صاف ستھری اور ملائم تھی۔ اس پر ایک موم کا گڈا بیٹھا تھا جس نے ایک چوڑی سی کوردار ٹوپی پہن رکھی تھی جو بالکل ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسی اُس وکیل کی تھی۔ چھڑی نے پھولوں کے درمیان خوب ناچنا شروع کیا چھڑی کے نیچے پاؤں بھی لگے تھے جن سے زور زور کی آواز نکلتی۔ لیکن پھول اس طرح کا آواز والا رقص نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ بہت ہلکے تھے اور ان کے پاؤں سے آواز نہ نکل سکتی تھی۔ یکایک موم کا گڈا جو چھڑی پر بیٹھا تھا لمبا اور اونچا ہونا شروع ہو گیا اور مڑ کر کاغذی پھولوں سے کہنے لگا" ایک بچے کی سمجھ میں ایسی واہیات باتیں کیسے آسکتی ہیں؛ کیسے بیہودہ خیالات ہیں"۔ اس کے بعد گڈا ہو بہو کوردار ٹوپی والا زرد رُو اور تُند خو وکیل بن گیا لیکن کاغذ کی گڑیوں نے اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر ایک مُکا رسید کیا اور وہ سکڑ کر دوبارہ چھوٹا سا گڈا بن گیا۔ یہ خوب دلچسپ واقعہ تھا۔ فیروزہ قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ چھڑی ناچتی گئی اور ساتھ ساتھ وکیل کو بھی ناچنا پڑا۔ اس کے لئے نہ تو بڑا بننا کام آیا اور نہ چھوٹا سا بڑی ٹوپی والا گڈا بننا۔ اُسے بہر حال ہی خوب ناچنا پڑا۔ اس کے بعد دوسرے پھول بیچ میں کُود پڑے۔ خصوصاً وہ پھول جو گڑیا کے بستر میں تھے ـــــ جنھوں نے بڑی مشکل سے چھڑی کو ناچنے سے روکا۔ اسی لمحہ میں میز کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی جہاں فیروزہ کی گڑیا صوفیہ دوسرے کھلونوں میں پڑی سوتی تھی۔ بوڑھی بدہیئت گڑیا میز کے ایک کنارے کی طرف دوڑی اور چت لیٹ کر اُس نے تھوڑا سا راستہ نکالنے کے لئے میز کی دراز دھکیلنی شروع کی۔ صوفیہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے ادھر اُدھر نہایت حیرانی سے دیکھ کر کہا" آج رات ضرور یہاں رقص ہے۔ دیکھو مجھے کسی نے

نہیں بتایا"۔

بدمزاج گڑیا نے کہا "تم میرے ساتھ مل کر رقص کرو گی؟"

وہ اس کی طرف مڑ کر کہنے لگی "تمہیں تو میرے ساتھ ناچنے کے قابل۔ اور ہے کون؟"

اس کے بعد وہ دراز کے سرے پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ شاید کوئی پھول مجھ سے مل کر رقص کرنے کو کہے لیکن کوئی پھول نہ آیا۔ اس کے بعد وہ "ہم۔ ہم ہم" کر کے کھانسنے لگی لیکن اس کے باوجود بھی کوئی نہ آیا۔ اب میلی کچیلی گڑیا نے اکیلے ہی ناچنا شروع کیا اور اس کا رقص بھی کوئی اتنا بُرا نہیں تھا۔ اب تک چونکہ کسی پھول نے بھی سوفیہ کی طرف توجہ نہ دی تھی اس لئے اُس نے زور سے میز پر سے فرش پر چھلانگ لگا دی تاکہ بہت آواز پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تمام پھول سیدھے اس کے گرد آ جمع ہوئے۔ خصوصاً وہ پھول جو اس کے بستر میں سو چکے تھے اور پوچھنے لگے کہ "تمہارے چوٹ تو نہیں آئی" لیکن اُسے چوٹ بالکل نہ لگی تھی فیروزہ کے پھولوں نے اس قدر عمدہ بستر کے لئے گڑیا کا شکریہ ادا کیا اور اس سے بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ وہ اُسے کمرے کے وسط میں لے گئے جہاں چاند چمک رہا تھا اور اس سے مل کر رقص کرنے لگے اور دوسرے تمام پھولوں نے اُن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ سوفیہ بڑی خوش ہوئی اور کہنے لگی "پھولو۔ بیشک ابھی تم میرا بستر اپنے ہی پاس رکھو" وہ ہرگز اس وقت دراز میں لیٹنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن پھولوں نے جواب میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "ہم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ کل صبح ہم بالکل مر چکے ہوں گے۔ تم ننھی فیروزہ سے کہنا کہ ہمیں باغ میں زرد چڑیا کی قبر کے نزدیک دفن کر دے ہم گرما میں ہم پھر جاگ اُٹھیں گے اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آئیں گے"۔

سوفیہ پھولوں کو بوسہ دے کر کہنے لگی "نہیں پھولو تم ہرگز نہ مرنا"۔

اس کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور بہت سے پھول ناچتے ناچتے اندر داخل ہوئے فیروزہ کچھ معلوم نہ کر سکی کہ بادشاہ کے باغ کے سوا وہ اور کہاں سے آ سکتے ہیں۔ پہلے دو خوبصورت پھول سنہری تاج پہنے ہوئے اندر داخل ہوئے وہ بادشاہ اور ملکہ تھے۔ گلنار اور ننھے ننھے خوشبودار پتّوں والے پودے ان کے پیچھے پیچھے تھے اور محفل کے ہر رکن کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھ موسیقی کا سامان بھی لائے تھے۔ پوست کے بڑے بڑے پھول۔ مٹر کی خالی پھلیاں اور کچھ پیالہ نما پھول اُن کے ساز، ڈفلیاں اور طبلے تھے۔ وہ خوب زور لگا لگا کر ساز بجا رہے تھے یہاں تک کہ ان کے مُنہ بھی سُرخ ہو چکے تھے۔ نیلی سنبل اور گل چاندنی کے پودوں نے اپنی گھنگروؤں کی شکل کے پھولوں کو خوب جھنجھنایا جیسے وہ سچ مچ کے گھنگرو ہوں۔ اس کے بعد اور بہت سے پھول آئے۔ صنوبر کے نیلے پھول۔ ارغوانی۔ دل آرام، گل بہار اور وادی کے نیلوفر۔ اب انہوں نے مل کر رقص کرنا اور ایک دوسرے کے بوسے لینے شروع کئے یہاں تک کہ ایک خوبصورت نظارہ پیدا ہو گیا۔

آخرکار پھولوں نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ فیروزہ بھی نہایت آہستہ آہستہ ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی ہوئی بستر پر جا لیٹی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس کے متعلق خواب دیکھتی رہی۔ جب صبح کو وہ بیدار ہوئی تو وہ تیزی سے چھوٹی میز کی طرف لپکی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ پھول ابھی تک وہیں ہیں یا نہیں؛ اس نے چھوٹی سی چارپائی کے پردے ایک طرف ہٹائے۔ سب پھول وہیں پڑے تھے لیکن مُردہ —— اُن کی حالت کل سے بھی خراب ہوگئی تھی۔ صوفیہ اسی دراز میں لیٹی تھی جہاں فیروزہ نے اُسے سُلایا تھا لیکن اس وقت وہ بہت خواب آلودہ معلوم ہو رہی تھی۔

فیروزہ کہنے لگی "تمہیں یاد ہے کہ پھولوں نے تمہیں میرے لئے کیا پیغام دیا تھا!" لیکن صوفیہ نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا اور نہایت نامعقول نظر آنے لگی۔

فیروزہ کہنے لگی "تم ذرا بھی نرم دل نہیں ہو۔ پھر بھی وہ سب تم سے پیار کرنا چاہتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے مُردہ پھولوں کو ایک چھوٹے سے ڈبے میں رکھ دیا جس پر خوبصورت پرندوں کی رنگین تصویریں بنی تھیں اور کہنے لگی "یہ تمہارا خوبصورت کفن ہے۔ تھوڑی دیر میں میرے میرے بھائی مجھ سے ملنے آئیں گے۔ وہ مجھے تمہیں باغ میں دفن کرنے میں مدد دیں گے تاکہ اگلے موسم گرما میں تم پھر اُگ آؤ اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگو۔"

اس کے میرے بھائی نہایت خوش مزاج لڑکے تھے۔ ایک کا نام خالد اور دوسرے کا نام ساجد تھا۔ ان کے ابا نے انہیں ایک ایک تیر کمان لے دیا تھا جو وہ فیروزہ کو دکھانے کے لئے ساتھ لائے تھے۔ فیروزہ نے اُن کو بیچارے پھولوں کی کہانی سنائی جو مر چکے تھے۔ بڑوں سے اجازت لیتے ہی وہ فیروزہ کے ساتھ انہیں دفن کرنے باغ کو چل دیئے۔ آگے آگے دونوں لڑکے کندھوں پر تیر کمان اُٹھائے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے ننھی فیروزہ مردہ پھولوں کا خوبصورت ڈبا اُٹھائے چلی جا رہی تھی۔ باغ میں انہوں نے ایک چھوٹی سی قبر کھودی۔ فیروزہ نے اپنے پھولوں کو چوما۔ انہیں ڈبے میں رکھا اور مٹی میں دفن کر دیا۔ سب سے آخر میں خالد اور ساجد دونوں بھائیوں نے قبر پر ایک ایک تیر چلایا کیونکہ اُن کے پاس نہ تو بندوقیں تھیں اور نہ توپیں۔

(ترجمہ) —— مہدی علی خاں

ہیں ایسے ساتھ دفن سبھی حسرتیں مری

چھوٹی سی ایک قبر بھی میرے مزار سب

زمزمۂ نعت

تضمین غزل جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ العالی

جذبِ صادق کب دکھائے گا اثر یا مصطفےٰ ۔۔۔ شوقِ کامل کب بنے گا راہبر یا مصطفےٰ
خاکِ یثرب ہوگی کب کحل البصر یا مصطفےٰ ۔۔۔ خواب ہی میں ہو کسی دن جلوہ گر یا مصطفےٰ
ڈھونڈتی ہے تم کو آنکھوں میں نظر یا مصطفےٰ

فیضِ توفیقِ الٰہی جب سے خضرِ راہ ہے ۔۔۔ با اثر ہر آہ ہے ہر بات خاطر خواہ ہے
فخر ہے آنکھوں کو نازاں قلبِ حق آگاہ ہے ۔۔۔ ایک خلوت گاہ ہے اور اک تجلی گاہ ہے
دیدہ و دل آپ کے دونوں ہیں گھر یا مصطفےٰ

سینہ ریشوں کے لئے وجہِ شفا حسنِ ملیح ۔۔۔ دردمندانِ محبت کی دوا حسنِ ملیح
زندگی میری بھی کردے بامزا حسنِ ملیح ۔۔۔ ہو نمک افشاں کسی دن آپ کا حسنِ ملیح
چاہتا ہوں لذتِ زخمِ جگر یا مصطفےٰ

کس کا منہ ہے قافلہ سالار اُمّت کا بنے　　خلق میں حامل نبوّت یا امامت کا بنے

عاصیوں کے واسطے ضامن شفاعت کا بنے　　اور ہے وہ کون جو سردار جنّت کا بنے

آپ ہیں یا آپ کے نورِ نظر یا مصطفےٰ

سرد ہے جنّت کا قصّہ دل کو گرماتا نہیں　　حور کی زلفوں میں اس وحشی کو اُلجھاتا نہیں

باز پُرس عرصۂ محشر سے گھبراتا نہیں　　نام لیوا آپ کا ہوں اور کچھ آتا نہیں

رات دن یا مصطفےٰ شام و سحر یا مصطفےٰ

سبحۂ زاہد ہے اظہارِ مشیخت کے لئے　　شیخ کی ہُو حق ہے اعلانِ کرامت کے لئے

ظاہری ساماں کی حاجت کیا عبادت کے لئے　　چشم تر لے کر چلے ہیں ہم زیارت کے لئے

اس سے چھڑکیں گے تمہاری رہ گزر یا مصطفےٰ

نزع میں جب نفس کو صدق و صفا سے بیر ہو　　ہوش اپنے کا نہ باقی امتیازِ غیر ہو

جلوہ گر تم ہو سرِ بالیں تو کیسی سیر ہو　　اس جلیلِ خستہ جاں کا خاتمہ بالخیر ہو

دم نکل جائے تمہارے نام پر یا مصطفےٰ

صدق جائسی

نیند

حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور "جامع الحکمت" کے نام سے ایک کتاب عنقریب شائع کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں گھر پر علاج کرنے کے لئے ضروری طبی معلومات جامع اور آسان طریقے سے پیش کی گئی ہیں۔ ذیل کا مضمون جو اس کتاب میں شائع ہوگا حکیم صاحب نے قبل از اشاعت "ہمایوں" کو عنایت فرمایا ہے۔ "مدیر"

تعریف۔ نیند طبعی بیہوشی کی اس حالت کا نام ہے جس میں ذہن ٹیلی فون کے مرکزی نظام کی طرح کام کرنے سے معطل ہو جاتا ہے اور اُن سینکڑوں پیغامات کی طرف جو آنکھوں، کانوں، اُنگلیوں اور چھاتی وغیرہ اعضائے جسمانی سے دن بھر اس تک پہنچتے رہتے ہیں متوجہ ہونا چھوڑ دیتا ہے۔ نیند میں بعض اوقات بیہوشی کامل نہیں ہوتی بلکہ ذہن کے بعض مخصوص حصے بالکل بیدار رہتے ہیں۔ چنانچہ رہٹ پر بیٹھا ہؤا شخص جب رہٹ چلنا بند ہو جاتا ہے تو فوراً بیدار ہو جاتا ہے یا ایک بیمار بچے کی ماں اپنے بچے کی ذرا سی چیخ یا آواز پر بیدار ہو جاتی ہے حالانکہ باقی شور وغل اس کی نیند میں مطلق خلل انداز نہیں ہوتا۔

گو جزوی یا کلی بیہوشی نیند کی ایک اہم خصوصیت ہے لیکن نظام عصبی کے ہر ایک کام میں ایک حد اعتدال اور کمی ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور ساختوں کی تحلیل کم اور تعمیر زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے نیند صحیح طور پر تازگی بخش اور دافع ماندگی ہے۔

نیند میں دماغی مراکز اعالے مراکز ادنٰے کے افعال پر سے اپنا اقتدار ہٹا لیتے ہیں اور ادنٰے قوائے منعکسہ کم و بیش ہوشیار رہتے ہیں چنانچہ اگر کسی محوِ خواب کے پاؤں میں سوئی چبھوئی جائے تو وہ اپنے پاؤں کو کھینچ لیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ادنٰے افعال غیر طبعی ہو جاتے ہیں اور مریض خواب میں چلنا پھرنا، چیخنا چلانا یا باتیں کرنا اور خوف کھانا شروع کر دیتا ہے۔

نیند کی گہرائی۔ نیند اپنی گہرائی میں مختلف ہؤا کرتی ہے بعض لوگوں کی نیند ایسی ہوتی ہے کہ وہ ذرا سی حرکت یا آواز پر بیدار ہو جاتے ہیں اور بعض بے جان شہتیر کی طرح ایسے سوتے ہیں کہ اُن پر "گھوڑے بیچ کر سونے" کی مثل صادق آتی ہے۔ ایک تانبے کے گھڑیال پر تانبے کی گیند مختلف بلندیوں سے گرا کر نیند کی گہرائی کا اندازہ کیا گیا ہے یہ پہلے چند منٹ میں ہلکی ہوتی ہے پھر ایک گھنٹے تک سُرعت کے ساتھ گہری ہو جاتی ہے اور سونے کے بعد دوسرے گھنٹے کے دوران میں نیند سب سے زیادہ گہری ہوتی ہے اس کے بعد اس کی گہرائی چھٹے گھنٹے تک کم ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے بعد بعض اوقات پھر گہری ہو جاتی ہے

البتہ ادنےٰ حیوانات میں نیند ایسی گہری کبھی نہیں ہوتی جیسے انسان میں ہوتی ہے۔

افعالِ جسمانی۔ نیند کے دوران میں تمام اہم افعال سست ہو جاتے ہیں تنفس اور قلب کی حرکات بھی سست ہو جاتی ہیں۔ پیشاب کم بنتا ہے اور بخاراتِ دخانیہ بھی کم خارج ہوتے ہیں۔ جسم میں حرارت بھی کم پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے نیند میں بہ نسبت بیداری کے زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ حرارت کی پیدائش نیند کے دوران میں نصف کے قریب کم ہو جاتی ہے۔

نیند میں حرارت جسمانی کے متعلق ایک اور دلچسپ مشاہدہ جو مقیاس الحرارت کے ذریعے کیا گیا ہے یہ ہے کہ ایک شخص جو رات کو سوتا ہے۔ اس میں تین بجے رات کے حرارت جسمانی بہت کم ہوتی ہے۔ خواہ اس وقت سویا ہوا ہو یا جاگتا۔ اگر وہ شخص اپنی عادت کو بدل دے یعنی بجائے رات کے دن کو سونا شروع کر دے تو تقریباً چھ ہفتے کے بعد یہ تغیر رونما ہوتا ہے کہ بجائے رات کے تین بجے کے دن کے تین بجے حرارت بہت کم ہوگی۔ اگر وہ شخص پھر رات کو سونا شروع کرے تو اسی طرح پھر چھ ہفتے کے بعد یہ تغیر رونما ہوگا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بالعموم اکثر مریض رات کو اسی وقت مرتے ہیں۔

نیند کی ماہیت۔ اس وقت تک نیند کی صحیح ماہیت کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق بہت سے بیانات ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی پورے طور پر اطمینان بخش نہیں ہے۔ بقراط نے اسے حیوان کا خاصۂ فطری قرار دیا ہے۔ ارسطو نے محض اس کے نتائج سے بحث کی ہے۔ جالینوس نے اس کا سبب رطوبت کو قرار دیا ہے جس کی وجہ سے اعصاب کے دماغی منافذ بند ہو جاتے ہیں۔ اطبائے اسلامی نے بھی اس یونانی نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔ مغرب نے کئی نظریئے پیش کئے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل تین نظریئے قابلِ ذکر ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں کم و بیش صداقت کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ باقی تمام عام بیانات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ نیند میں عضلات ڈھیلے ہو جاتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ بیشتر عضلات ڈھیلے ہوتے ہیں لیکن عضلاتِ اجفان کی (جو آنکھوں کو بند رکھتے ہیں) قوتِ انقباض بلاشبہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح آنکھوں کی پتلیاں بھی دورانِ خواب میں سکڑی ہوئی ہوتی ہیں اور اگر پپوٹوں کو اٹھا کر دیکھا جائے تو آنکھوں کے ڈھیلے اوپر کو پھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ آہستگی سے مگر مسلسل ایک طرف سے دوسری طرف پھرتے رہتے ہیں۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ تکان سے پیدا ہونے والے فضلات سے دماغ میں ایک قسم کی مدہوشی پیدا ہو جانے سے نیند آیا کرتی ہے۔ چنانچہ اس نظریئے کی تائید میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تکان ایک حد تک جسم میں آکسیجن (نسیم) کی اور کاربانک ایسڈ (اجزائے دخانیہ) کی زیادتی کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ حالات عصبی ساخت کی تحریک کو کم کر دیتے ہیں لیکن تجربہ میں ان فضلات کو جسم میں داخل کرنے سے نیند نہیں آتی۔ اس کے برعکس ایسا دیکھا گیا ہے کہ لوگ اس وقت بھی سو جاتے ہیں جب وہ بالکل تھکے

ہوئے نہیں ہوتے۔

ایک عرصے تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ نیند دماغ میں خون کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیند کے دَوران میں دماغ کے اندر کسی قدر کمیٔ خون ضرور ہو جاتی ہے جیسا کہ حیوانی تجربات اور بعض دیگر جرّاحی اعمال کے مریضوں کے دماغ میں دیکھا گیا ہے لیکن اس میں بھی اختلافِ آرا موجود ہے کیونکہ دماغ میں معمولی کمیٔ خون سے طبعی نیند ہرگز پیدا نہیں ہوتی۔ بعض علمائے نفس کا خیال ہے کہ نیند محض ذاتی ترغیب اور خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہم نیند کی ہئیت اختیار کر کے سونا چاہتے ہیں تو چند منٹ میں نیند آ جاتی ہے۔ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔ ذرا سا غور کرنے پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس نیند کے متعلق تا حال جس قدر نظریئے پیش کئے گئے ہیں پُورے طور پر تسلّی بخش نہیں ہیں۔

صحت بخش نیند۔ نیند کے دَوران میں جسم کو مطلوبہ آرام اور راحت حاصل ہوتی ہے چنانچہ یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ناموافق حالات دُور کئے جائیں جو فطرت کے اس راحت بخش موقع میں کسی قسم کی مداخلت کرتے ہوں۔ جسم کے بعض اعضا کسی وقت بھی کام کرنا ہرگز بند نہیں کرتے لیکن نیند کے دوران میں وہ کسی قدر آرام کر لیتے ہیں۔ چنانچہ نیند کی حالت میں دل کم قوت کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جگر کم صفرا پیدا کرتا ہے۔ گُردے کم پیشاب بناتے ہیں اور نظامِ عصبی کا بہت بڑا حصّہ آرام کی حالت میں ہوتا ہے۔ جب نیند گہری اور تندرست ہو تو ہم صحیح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جسم از سرِ نو قوت سے بھر رہا ہے۔

تندرست نیند تین باتوں پر منحصر ہے (۱) عمدہ صحت (۲) نیند کے لئے مناسب حالات اور (۳) استرخا یعنی جسمانی اعضا کا ڈھیلا پن۔

بہ ظاہر ہے کہ اگر نظامِ عصبی اشتعال کی حالت میں ہو یا خون صاف نہ ہو تو یقینی طور پر نیند بھی کسی حد تک مختل ہو گی۔ شام کی ثقیل اور ناقابلِ ہضم غذا خصوصاً جب دیر سے کھائی جائے۔ حد سے زیادہ محرک چائے، قہوہ، گوشت کی غذائیں، شکر اور نشاستہ دار غذاؤں کی کثرت، تمباکو اور مخدرات اور منوّمات کا استعمال، قبض اور بدہضمی، یہ وہ خاص اہم اسباب ہیں جو تندرست نیند کو خراب کر دیتے ہیں۔

نیند کے لحاظ سے ایک نہایت اہم اور ضروری صحت بخش قاعدہ یہ ہے کہ بستر میں جانے سے پہلے دو یا تین گھنٹے قبل کوئی ٹھوس غذا نہ کھائی جائے۔ بالفاظِ دیگر پُر معدے کے ساتھ ہرگز بستر میں نہ جائیں۔ دن کی آخری غذا سات بجے شام کے قریب کھا لینی چاہئے اور اگر ضرورت ہو تو بستر میں جانے سے ایک گھنٹہ قبل کسی صحت بخش مشروب کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ناقابلِ ہضم اور دیر سے کھائے ہوئے شام کے کھانے بالعموم اس بے چینی اور بے خوابی کا سبب ہیں جو رات کے وقت ہوتی ہے اور اس خمار کا باعث ہیں جو صبح کے وقت ہوتا ہے۔

سونے کے کمرے میں ہوا کی خراب اور ناکافی آمد و رفت ناقص بستر کمرے کے درجۂ حرارت کا بہت کم یا زیادہ ہونا یا تکیے کا بہت اُونچا یا نیچا ہونا نیند میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اگر سر بہت اونچا ہو تو اس سے گردن کے عضلات میں غیر معمولی تناؤ رہتا ہے جس سے اس میں بل پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر سر میں ضرباتی کیفیت محسوس ہو اور بالکل نیند نہ آتی ہو تو مناسب یہ ہے کہ تکیہ کسی قدر اُونچا کر دیا جائے تاکہ دماغ میں خون کا دباؤ کم ہو جائے۔ تکیے کی اونچائی بالعموم تقریباً تین انچ تک ہونی چاہئے۔ یہ بہتر ہے کہ حتی الامکان دائیں پہلو پر سوئیں کیونکہ اس سے ہضم میں مدد ملتی ہے۔ چت سونے سے بہرحال پرہیز کریں کیونکہ یہ ریڑھ میں حد سے زیادہ گرمی پیدا کر دیتا ہے اور پریشان خوابوں اور تشنجی حرکات کا عام سبب ہے۔ اگر گرم پانی کی بوتلوں کے ذریعے سے حرارت کی ضرورت ہو تو بوتل کو سوائے پاؤں کے اور کسی جگہ ہرگز نہیں رکھنا چاہئے تاوقتیکہ مرض کی وجہ سے کسی اور جگہ رکھنے کی ضرورت محسوس ہو۔

سونے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ سونے کے کمرے میں تازہ ہوا کی آزادانہ آمد و رفت جاری رہے۔ ہاں طوفانی موسم میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی جائیں۔

غلط نفسانی اوضاع مثلاً فکر، رنج یا غصہ صحت بخش نیند کو بہت مشکل یا بالکل ہی ناممکن بنا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ ناخوشگوار جذبات عصبی تمدد اور خون کے دباؤ کی زیادتی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں حالانکہ نیند کے لئے استرخا اور خون کے دباؤ کی کمی درکار ہے۔ اگر تم کسی غیر فیصل شدہ جھگڑے یا غیر حل شدہ مسئلے کی ادھیڑبن میں مبتلا رہو تو نیند لانے کی معمولی تدابیر کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کی مصیبتوں کو وقتی طور پر اپنے آپ سے علیحدہ کر کے رکھ دو۔ اس لئے نہیں کہ یہ مصیبتیں ناقابلِ حل ہیں بلکہ اس لئے کہ تم صبح اُٹھ کر تازہ دلچسپی اور نئی قوت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے۔

نیند کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ جسمانی عضلات کے تمام تمدد کو دُور کر دیا جائے اس کے لئے پُشت کے بل چت لیٹ کر بازوؤں کو آرام دہ ہئیت میں پھیلا دو۔ اس کے بعد عضلات کو باری باری ڈھیلا کرنا شروع کر دو۔ بہت تھوڑی کوشش کے ساتھ تم ڈھیلا کرنے کے اس فن میں ماہر ہو جاؤ گے اور غالباً اس ورزش کو ختم کرنے سے پہلے ہی گہری نیند سو جایا کرو گے۔ استرخا کے اس اصول کو سکون، آرام، سکھ اور اطمینان کے خیال کے ساتھ ذہن تک وسیع کر دو۔

اگر نیند صحت بخش اور تندرست ہو تو کسی کے قسم کے خواب نہیں آتے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ہم اس صورت میں خواب دیکھتے ہی نہیں بلکہ ہم دیکھے ہوئے خوابوں کو یاد نہیں رکھتے۔ اگر خواب خوفناک اور پریشان کن ہوں تو یہ بدہضمی پر دلالت کرتے ہیں یا بالعموم ذہنی پریشانی اور فکر یا کسی واضح عصبی خرابی کو ظاہر کرتے ہیں۔

نیند کی مدت۔ نیند کی مدت پر نیند کے حالات، روزمرہ کی مصروفیت، عمر، آب و ہوا، تندرستی اور بعض دیگر حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ معمولی حالات میں نیند کی مدت اور بہترین اوقات مندرجہ ذیل ہیں:۔

عمر	نیند کی مدت	سونے کا بہترین وقت
پہلے سال میں	۲۰ گھنٹے	- ..
دوسرے سے چوتھے سال تک	۱۴ "	- -
چوتھے " بارھویں " "	۱۰ "	۷-۸ بجے شام
بارھویں " اٹھارھویں " "	۹ "	۹-۱۰ " "
جوانی اور بڑھاپے میں	۷-۸ "	۱۰-۱۱ " "

دماغی کام کرنے والے بہ نسبت جسمانی کام کرنے والوں کے ہلکی اور کم نیند کے محتاج ہوتے ہیں۔ سویرے سونا گہری نیند اور عمدہ صحت کے لئے اچھا ہے۔

نیند لانے کے لئے ادویہ کا استعمال۔ جب کسی وجہ سے صحت بخش نیند نہیں آتی تو کلورل برومائیڈز۔ سلفونل۔ افیون وغیرہ ادویہ کے استعمال کی زبردست ترغیب ہوتی ہے۔ اس ترغیب کی مخالفت کرنی چاہیئے کیونکہ یہ دوائیں اہم عصبی مراکز کو سست یا ایک حد تک مفلوج کرکے اور حیات بخش محرکتہ العروق افعال کو کمزور کرکے اپنا اثر کرتی ہیں۔ ان کا استعمال مصیبت لاتا ہے شفا نہیں بخشتا۔ وسکی وغیرہ مختلف قسم کی شرابیں بھی عام معلوم منوم خواص رکھتی ہیں لیکن اُن سے بھی پرہیز کرنا بہتر ہے اور ناتندرست نیند یا بے خوابی کا سبب معلوم کرکے اُسے دُور کرنا زیادہ اچھا ہے۔ اس کے بعد صحت بخش نیند کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

نیند لانے کی تدابیر۔ جب ایک مرتبہ نیند کے سبب کو معلوم کرکے دُور کر دیا جائے تو سونے سے پہلے چہل قدمی کرنے، باقاعدہ اوقات پر بستر میں چلے جانے، شیر گرم پانی کے ساتھ جسم پر اسفنج کرنے یا سرد پانی میں پاؤں مارنے یا بالترتیب گرم اور سرد پاشویہ وغیرہ کرنے سے صحت بخش نیند لائی جا سکتی ہے۔

سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ اس کے متعلق ہرگز متفکر نہ ہو کہ تمہاری نیند صحت بخش ہے یا نہیں۔ اگر تمہیں بے خوابی کی شکایت ہے جب بھی ہرگز فکر نہ کرو، نیند کی مدت اتنی اہم نہیں ہے جتنی کہ اس کی شدت۔ اور تم تھوڑی نیند سے بھی اتنی ہی تازگی حاصل کرسکتے ہو جتنی دوسرا شخص تمام رات سونے سے حاصل کرتا ہے۔ بہر حال اگر تم بے خوابی کو سکون کے ساتھ دیکھو تو تمہیں نیند زیادہ آسانی کے ساتھ آسکے گی۔

مسئلہ تخفیف نوم۔ ایک عرصہ سے یورپ اور امریکہ کے بعض محققین نیند کو کم کرنے کی تدابیر میں مصروف ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نیند کی وجہ سے بدن میں ما تحلل بہم پہنچتا ہے اور دماغی و جسمانی تکان کو رفع کرنے کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں تاہم اس میں

بھی شک نہیں کہ انسان کی عمر کا ایک بڑا حصہ نیند کی نذر ہو جاتا ہے اور وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ ہر روز سات آٹھ گھنٹے کے لئے اپنی سرگرمیوں کو معطل کر دے۔

بعض جلیل القدر انسانوں کی عظمت کے وجوہ میں سے ایک کم خوابی ہے۔ وہ صرف تین چار گھنٹے سو کر باقی وقت اپنے فرائض کی تکمیل میں مصروف رہے۔ نپولین بوناپارٹ دُنیا کا بہترین جرنیل تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی بے نظیر کشورکشایانہ قابلیت کا ہر شخص کو اعتراف ہے ایام جنگ میں اس کی کتنی ہی راتیں حربی تدابیر سوچنے میں بسر ہو جاتی تھیں اور امن کی حالت میں بھی وہ صرف چار پانچ گھنٹے سوتا تھا۔ ایڈیسن کی ایجادات سے کون نا آشنا ہے اور خود گراموفون اس کی اختراعی استعداد پر نغمہ نواز ہے مگر وہ دن رات میں بمشکل ۳ گھنٹے محوِ خواب ہوتا تھا اور بقیہ وقت غور و فکر میں صرف کر دیتا تھا۔ اسی طرح کانٹ، نطشے، عالمگیر اور فریڈرک اعظم بھی تین چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتے تھے۔

آج مغربی دنیا قوائے ذہنی کو ازمنۂ ماضیہ سے کہیں زیادہ صرف کر رہی ہے اور وہ اب اس فکر میں ہے کہ نیند کے چند گھنٹے بھی اس کے انہماک میں خلل انداز نہ ہوں مگر اس میں سب سے بڑی دقّت یہ ہے کہ نیند کی ماہیت ابھی تک عقدۂ لاینحل ہے۔ صرف اس قدر ضرور ثابت ہو گیا ہے کہ نیند کے وقت ہمارا سر ہلکا اور باقی جسم بھاری ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس وقت سر کی طرف خون کا دَورہ کم ہوتا ہے مگر محض اتنی سی بات سے اس پیچیدہ گتھی کی عقدہ کشائی کیونکر ہو سکتی ہے۔

تاہم مغربی اطبا، اپنی مساعی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور ان کے تجربات بدستور جاری ہیں۔ ایک مشہور ڈاکٹر کلشمین نے دو آدمیوں کو ۱۱۵ گھنٹہ سونے سے باز رکھا۔ اس کے بعد دونوں کے دورانِ خون اور حرارت غریزی کا معائنہ کیا تو بالکل صحیح حالت میں پایا۔ ڈاکٹر موصوف کے خیال میں نیند بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب کام کرنے سے انسان تھک جاتا ہے تو اس کے اعضا، خود بخود تھک کر سو جاتے ہیں۔ بیمار آدمی کو اسی وجہ سے نیند کم آتی ہے۔

ڈاکٹر ہیرس اور ڈاکٹر کریل کی رائے میں دماغ میں ایک خاص قسم کی تبدیلی کا نام نیند ہے۔ کیمیاوی تبدیلی ایک قسم کی برقی قوت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اگر مصنوعی بجلی سے دماغ میں یہی تبدیلی پیدا کی جائے تو نیند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پروفیسر آرتھر کاٹن نے اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو دماغ میں برقی قوت پہنچا کر نیند سے مستغنی کر دیتا ہے۔ دن بھر کے خستہ و ماندہ آدمی کی کلائی میں اس آلہ کا تار باندھ دیا جاتا ہے اور دوسرا تار اس کے سر پر لگا دیا جاتا ہے پھر بٹن دبا کر پندرہ منٹ تک اس کے دماغ میں برقی قوت پہنچائی جاتی ہے۔ اس عرصہ کے بعد وہ دوبارہ چودہ گھنٹہ تک سونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ابھی یہ اشتباہ باقی ہے کہ اگر روز اس آلہ کو استعمال کیا جائے تو دماغ پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر یہ آلہ کامیاب ہو گیا تو یقیناً حیات انسانی میں انقلاب پیدا کر دے گا۔

محمد حسن قریشی

اپنے بھُولنے والے سے

جب بادہ بدوش ہوں گھٹائیں جب کیف فروش ہوں ہوائیں
جب مستیٔ فصل کے اثر سے معمورِ نشاط ہوں فضائیں
جب غنچہ و گل کی انجمن سے آئیں ہنستی ہوئی صدائیں
جب مِل کے شباب سے تمہارے بوندیں ساون کے گیت گائیں
اُس وقت ہمیں بھی یاد کرنا!

جب رات دُلھن بنی ہوئی ہو تاروں سے فضا میں روشنی ہو
جب "تاج" کے صندلیں کلس پر دھندلی دھندلی سی چاندنی ہو
جب مسجد و دیر و میکدہ میں چھائی ہوئی ایک خامشی ہو
کھلجائے تمہاری نیند سے آنکھ اور ساری خدائی سو رہی ہو
اُس وقت ہمیں بھی یاد کرنا!

جب دورِ بہار ہو چمن میں تارے پیدا ہوں یاسمن میں
جب جنتِ صبح "تاج" اُترے مُنہ دھونے کو موجۂ جمن میں

جب سیر کو جاؤ تم دمِ صبح | پھولوں کی لطیف انجمن میں
مستی سے بھری ہوئی جوانی | مہکے گل و لالہ کے وطن میں

اُس وقت ہمیں بھی یاد کرنا!

جب نور سے ہو دماغ روشن | کیفِ مے سے ایاغ روشن
جب عکسِ شفق سے ہوں چمن میں | لالے کے جگر کے داغ روشن
جس وقت ہوں ضَو فروز جگنو | پھولوں سے ہو خانہ باغ روشن
ہوں گرمِ نوا اذان و ناقوس | جب شام کو ہوں چراغ روشن

اُس وقت ہمیں بھی یاد کرنا!

جب وقت تمہیں کبھی ستائے | اور اہلِ وفا کی یاد آئے
جب دَورِ گذشتہ یاد کر کے | آنسو آنکھوں میں مسکرائے
ہر سمت سے ہوں ہوس کے حملے | دُنیا اُلفت کو بھول جائے
دل خوش نہ ہو باوجودِ کوشش | یعنی غمِ دہر رنگ لائے

اُس وقت ہمیں بھی یاد کرنا!

فضل اثر اکبر آبادی

قتل!!!

ایسٹر سے چند روز پہلے لیڈی ونڈر میر نے شہزادی صوفیہ کے اعزاز میں اپنے دوستوں کو دعوت دی۔ مہمانوں کی ایک غیر معمولی تعداد مدعو کی گئی۔ کابینہ کے چھ وزرا اپنے کامدار چوغے جو خوشنما زری دار فیتوں اور تمغوں سے مزین تھے زیب تن کئے تشریف لائے۔ حسین و جمیل خواتین، نظرفریب اور بھڑک دار ملبوسات میں رونق افروز محفل ہوئیں۔

نگارخانہ کے اختتام پر شہزادی صوفیہ کھڑی تھی۔ یہ ایک بھاری بھرکم قوی الجثہ عورت تھی جس کے چہرے سے تاتاری ہیبت ٹپک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور چھوٹی تھیں وہ قیمتی چمکدار جواہرات پہنے ہوئے تھی اور غیر فصیح فرانسیسی میں زور زور سے گفتگو کر رہی تھی۔ بات بات پر بلا وجہ قہقہہ لگاتی اور ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی تھی۔

لیڈی ونڈر میر کے لئے حقیقتاً یہ بڑی خوش نصیب رات تھی۔ دوسرے مہمانوں کے ساتھ شہزادی صوفیہ بھی تقریباً نصف شب تک شریک مجلس رہی۔

شہزادی کے رخصت ہوجانے پر لیڈی نگارخانہ میں آگئی اور ڈچز پیسلی سے ادھر اُدھر کی گپ شپ اُڑانے لگی۔

لیڈی اُس وقت بالکل پری معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سفید صراحی دار گردن۔ دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی تیز نظریں۔ زرین بالوں کی گول جٹائیں۔ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ اِن اوصاف نے اس کے چہرے کو ایک مقدس آسمانی نُور سے منور کر دیا تھا مگر اس میں وہ رعنائی اور کشش حُسن بھی ضرور شامل تھی جو صرف ارتکابِ گناہ کے بعد ہی کسی چہرے پر جلوہ فرما ہوتی ہے۔

دراصل لیڈی ایک عجیب و غریب عورت تھی۔ ابتدائے زندگی ہی میں اُس نے اِس اُصول پر کہ

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

نہایت بے باکی سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ جب تک موجودہ معاشرتی خیالات اور تمدنی نظام کے خلاف کچھ غیر معمولی حرکتیں نہ کی جائیں اس شہرت فزا بدنامی کا حصول بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے بعض ایسی حرکتیں شروع کر دیں کہ لوگ خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے تذکرے زبان زدِ خاص و عوام ہوجائیں مثلاً اس کی جدت پسند طبیعت نے "تبدیلی شوہر" کے زریں اصول پر پورے جوش و خروش سے عمل کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ میں نت نئے شوہر بدلتی جو اپنی طبائع میں دُور کی بھی مناسبت نہ رکھتے تھے۔

مگر اب لیڈی کے متعلق سوسائٹی میں عام طور پر خاموشی تھی۔ عرصہ ہوا لوگ اس کی جدت پسندی کی داد دے چکے تھے۔ ہاں کچھ بھی کیوں نہ ہو ان کارناموں نے اسے ایک شخصیت بنا دیا تھا اور اب وہ باعزت لوگوں میں آرام سے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔

لیڈی کے کوئی اولاد نہ تھی اور اگرچہ اس کی عمر چالیس سال کی تھی مگر جوانی کی اُمنگیں اور خواہشات کے شعلے ——— جو ایک پُرآشوب شباب رفتہ کا ماحصل تھے ——— ابھی تک اس معمر جسم میں اُٹھ رہے تھے۔

یکایک اس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور اپنی صاف، کھری اور تیز آواز میں کہا "میرا عالم ید کہاں ہے؟"

ڈچز نے گھبرا کر دریافت کیا "کیا فرمایا آپ نے؟"

"محترم خاتون میرا عالم ید۔ کیونکہ فی الحال میں اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"درست ہے کیوں نہیں آپ ہمیشہ سے ہی جدت پسند ہیں۔"

"ہاں خاتون وہ ہفتہ میں دو مرتبہ میرا ہاتھ دیکھنے آتا ہے اور ہمیشہ بہت ہی دلچسپ باتیں بتاتا ہے۔ میں آپ سے ضرور اس کا تعارف کراؤں گی۔"

"اخاہ۔ آپ میرا تعارف کرائیں گی تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ یہاں موجود ہے۔"

"جی ہاں وہ یہیں ہے کیونکہ میں اس کی غیر حاضری میں دعوت دینے کا گمان بھی نہیں کر سکتی۔ سنیئے تو۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ میں ایک فوق الفطرت ذہن کی مالک ہوں۔ اگر میرا انگوٹھا بال برابر اور چھوٹا ہوتا تو میں یقیناً بہت دل برداشتہ رہا کرتی اور اپنی زندگی کے ایام کسی خانقاہ میں گزار دیتی۔"

ڈچز نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا تو وہ ہماری قسمت کی خوبیاں اور آرام بتاتا ہے۔"

"نہیں خاتون وہ ہمیں تقدیر کی برائیوں اور خرابیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ جتنی بُرائیاں اور مصیبتیں آپ پسند فرمائیں وہ آپ کو بتا سکتا ہے۔ دیکھیئے اس نے اگلے سال کیلئے پیشینگوئی کی ہے کہ میرے لئے خشکی اور سمندر پر رہنا دونوں خطرناک ہیں اسلئے میرا ارادہ ہے کہ میں ایک ہوائی طیارہ میں اقامت گزیں ہو جاؤں اور ہر شام اپنا کھانا ایک باسکٹ میں اوپر کھینچ لیا کروں یہ تمام باتیں مجھے ٹھیک یاد نہیں یا تو میری انگلی پر یا ہتھیلی پر لکھی ہوئی ہیں۔"

"مگر اس کا مطلب تو خدا کے ساتھ چالیں چلنا ہوا۔"

"یقیناً۔ مگر خدا اب اس قابل ضرور ہو گیا ہوگا کہ ہماری چالوں میں نہ آئے! میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہر شخص کو کم از کم مہینہ میں ایک بار ضرور اپنا ہاتھ پڑھوانا چاہیئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون کون سے افعال اس کے لئے مضرت رساں ہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ انسان

وہی کرتا ہے جو اسے کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اس قسم کی آگاہی ہے بہت دلچسپ۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر، اچھا اگر کوئی اور مسٹر لوچر کو بلانے نہیں جاتا تو میں خود انہیں بلالاتی ہوں"۔

لارڈ ارتھر (جو نزدیک کھڑے یہ گفتگو سُن رہے تھے) "خاتون اجازت دیجئے کہ میں اسے بلالاؤں"۔

"لارڈ ارتھر جناب کا شکریہ۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے نہیں پہچانتے"۔

"لیڈی ونڈرمیر! اگر وہ اس قدر عجیب وغریب آدمی ہے تو میں اسے پہچان لوں گا۔ براہِ کرم مجھے اس کا حلیہ بتائیے میں اسے ابھی لے آتا ہوں"۔

"وہ صورت شکل سے بالکل عالم یہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی شکل وصورت بالکل عامیانہ ہے جس میں کوئی بات خلافِ قیاس نہیں۔ وہ پست قد اور طاقت ور آدمی ہے۔ اس کی "فارغ البال" چندیا نہایت مضحکہ خیز ہے اور سنہرے فریم کا بڑا چشمہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ یہ سمجھیئے کہ شکل میں آدھا خاندانی ڈاکٹر اور آدھا وکیل ہے! .... لیجیئے مسٹر لوچر خود ہی آگئے"۔

"مسٹر لوچیر براہ کرم ڈچز پیسنزلی کا ہاتھ پڑھیئے"۔

ڈچیز کی طرف مخاطب ہو کر "خاتون اپنے دستانے اتار دیجئے"۔

ڈچیز نے دستانے اُتارتے ہوئے کہا "محترمہ میں اسے مناسب نہیں سمجھتی تاہم خیر ....

(۲)

مسٹر لوچر نے دو تین ہاتھ پڑھے۔ انہوں نے چند حاضرین کے ماضی پر جو روشنی ڈالی وہ بالکل صحیح اور درست تھی۔ اصل واقعات اور مسٹر لوچر کے بیان میں سرِ مو تفاوت نہ تھا۔

ان کی صحتِ بیان نے سب کو ان کی قابلیت کا یقین دلا دیا تھا۔ اب ہر شخص اپنا ہاتھ پڑھوانے کو بے چین اور موقعہ کا متلاشی تھا۔ لارڈ ارتھر قریب کھڑے مسٹر لوچر کی تمام گفتگو سُن رہے تھے۔ وہ بیتاب تھے کہ کسی نہ کسی طرح اپنا ہاتھ دکھائیں۔ تاریک مستقبل کو جاننے کی لاانتہا خواہش نے حال کے گہرے نقوش کو لمحہ بھر کے لئے محو کر دیا تھا۔ ایک بے انتہا جذبۂ شوق اس کی رگ رگ میں موجزن تھا "میرا نوشتۂ تقدیر کیا ہے؟" یہ سوال اس کے پیشِ نظر تھا۔

مگر یہ بھی مناسب نہ تھا کہ خواہ مخواہ سب کے بیچ میں اپنا ہاتھ گھسیڑ دیں اور بچوں کے سے ضدی انداز میں مسٹر لوچر کا دامن پکڑ کر مچل مچل کر کہیں "میرا ہاتھ دیکھئے۔ میرا ہاتھ دیکھئے"۔ وہ زندگی کی ان ابتدائی منازل کو طے کر چکے تھے جہاں اس قسم کی حرکات جائز خیال کی جا سکتی تھیں۔

آخر ان سے نہ رہا گیا۔ وہ لیڈی کی طرف بڑھے اور مسکراتے ہوئے کہا: "غیر مناسب نہ ہو گا اگر میں بھی مسٹر لوچر کو اپنا ہاتھ

دکھالوں"۔

لیڈی "ہاں ضرور، مسٹر لوچر کا مقصدِ حیات ہاتھ دیکھنا ہی ہے۔ ہاں یہ پہلے ہی بتائے دیتی ہوں کہ آپ کی منگیتر سیبل کل میرے یہاں مدعو ہیں اور میں مسٹر لوچر کی تمام پیشگوئیاں صاف صاف انہیں بتادوں گی۔ ذرا سوچ سمجھ کر ہاتھ دکھلایئے! اگر مسٹر لوچر نے بتایا کہ آپ بدمزاج ہیں یا اواخرِ زندگی میں آپ کسی بُرے مرض میں مبتلا ہوجائینگے یا آپ پہلے ہی سے کسی کی زلفوں میں اسیر ہیں تو یاد رکھئے میں ساری باتیں سیبل کو بتادوں گی۔ آپ جانیں، جی چاہے ہاتھ دکھائیں جی چاہے نہ دکھائیں"۔

لارڈ آرتھر نے مسکراتے ہوئے نہایت یقین سے سر ہلایا اور کہا "میں آپ کی دھمکیوں میں آنے والا نہیں۔ سیبل مجھ سے اور میں اس سے خوب واقف ہوں"۔

لیڈی "خیر جانے دیجئے۔ خوشگوار شادی کی بنیاد حقیقتاً ایک دوسرے سے کامل ناواقفیت اور اجنبیت ہے۔ (عالم بیدکی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) مسٹر لوچر! لارڈ آرتھر اپنا ہاتھ دکھانے کے لئے بیتاب ہیں (ہنستے ہوئے) ہاں دیکھئے انہیں یہ نہ بتایئے کہ لندن کی حسین ترین دوشیزہ سے اِن کا رشتہ ہوچکا ہے۔ یہ خبر مدت ہوئی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ آپ ہمیں ان کے بارے میں کوئی اور دلچسپ بات بتایئے"۔

جونہی مسٹر لوچر نے لارڈ آرتھر کے ہاتھ پر نظر ڈالی اس کے چہرے پر مردنی چھاگئی! اس کی بھویں ایک عجیب ڈراونے انداز میں کانپنے لگیں!! پسینے کے چند قطرے اس کی پیشانی پر نمایاں ہوگئے!!!

لارڈ آرتھر نے مسٹر لوچر کی ان علامات کو محسوس کرلیا۔ ان پر خود ایک ہیبت طاری ہوگئی۔ ان کی آنکھوں سے وحشت اور گھبراہٹ ٹپکنے لگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنا ہاتھ چھڑا کر جتنی جلدی ممکن ہو اس کمرے سے باہر نکل جائیں۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو روکا وہ سنبھلے۔ مستقبل کا علم خواہ کتنا ہی تاریک اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو اس مجرمانہ فرار سے بہتر تھا۔

آخر لارڈ آرتھر نے نہایت بیتابی سے کہا "مسٹر لوچر کچھ بتایئے۔ میں سخت منتظر ہوں"۔

مسٹر لوچر چند منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ ان کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت ہوگئی تھی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دفعتہً مسٹر لوچر نے دایاں ہاتھ جھٹک دیا اور بایاں دیکھنا شروع کیا۔ اس نے چوڑی ہتیلی کو پوری وسعت سے پھیلایا اور اتنا جھک گیا کہ اس کا چشمہ لارڈ آرتھر کے ہاتھ کو چھونے لگا۔ تشویش، فکر اور خوف کی وہی تمام علامات اس کے چہرے پر پھر ظاہر ہوئیں۔ چند منٹ کے لئے اس کا رنگ اُڑ گیا۔ مسٹر لوچر نے اپنی حالت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی اور مسکراتے ہوئے کہا "واقعی یہ ایک البیلے نوجوان کا ہاتھ ہے"۔

لیڈی "یقیناً۔ یہ البیلے نوجوان ضرور ہیں۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ البیلے شوہر بھی ہونگے یا نہیں"۔

"ہاں اگلے چند ماہ میں انہیں ایک بحری سفر درپیش ہے . . . . . انہیں کسی دور کے رشتہ دار کی موت سے بھی تھوڑا سا رنج ہوگا . . . . ."

مسٹر لوچر خاموش ہو گئے اور لیڈی اپنے مہمانوں سمیت کھانے کے کمرے میں چلی گئی۔

لارڈ آرتھر تنہا آتش دان کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسٹر لوچر نے ان کے ہاتھ میں ضرور کوئی غیر معمولی مصیبت دیکھی ہے۔ ان پر خوف وہراس طاری تھا۔ آنے والے مصائب کے خیال نے انہیں دل برداشتہ کر رکھا تھا۔ وہ سیبل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے کہ نہ معلوم کیا مصائب ان کی آئندہ خوشی اور شادمانی کو پامال کرنے والے ہیں . . . .

دفعتہً مسٹر لوچر کمرے میں داخل ہوئے وہ کوئی چیز بھول گئے تھے اور اسے لینے واپس آئے تھے۔

لارڈ آرتھر نے سخت لہجہ میں کہا "مسٹر لوچر میں دودھ پینے والا بچہ نہیں ہوں۔ آپ مجھے صاف صاف بتلایئے کہ آپ نے میرے ہاتھ میں کیا دیکھا۔ آپ کی وہ غیر معمولی کیفیت مجھے بتا رہی ہے کہ آپ نے ضرور کوئی نہ کوئی بات دیکھی ہے —— ہاں کل آپ کو چیک بھجوا دوں گا۔"

مسٹر لوچر دم بخود رہ گئے۔ وہ لارڈ آرتھر کو کچھ بتانا نہ چاہتے تھے مگر پیسے کا نام سن کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے خوردبین نکالی اور لارڈ آرتھر کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

(۳)

دس منٹ بعد لارڈ آرتھر کمرے سے نکلے۔ ان کا چہرہ خوف وہراس سے سفید تھا۔ جسم میں خون کا ایک قطرہ تک بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ آنکھوں سے وحشت اور بربریت ٹپک رہی تھی !!!

رات بڑی خنک تھی۔ پارک کے لیمپ ٹھنڈی تند ہوا میں ٹمٹما رہے تھے مگر لارڈ آرتھر کا جسم جل رہا تھا۔ ان کا چہرہ بخار سے تمتما اٹھا تھا۔ ہاتھ پاؤں سے شعلے نکل رہے تھے وہ ایک مخمور آدمی کے مانند جھوم جھوم کر قدم رکھ رہے تھے اور ہر قدم پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین پر آ رہیں گے۔ وہ ایک لیمپ کے نیچے کھڑے ہو گئے اور اپنا ہاتھ دیکھنے لگے متصورہ تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ ان کے ہاتھ خون میں بھرے تھے! اُن پر خون کے لال لال دھبے نظر آ رہے تھے !!!

"قتل!" یہ اس عالم بد کی پیشین گوئی تھی۔ لارڈ آرتھر دیوانے ہو گئے تھے۔ قدم قدم پر یہ خوفناک خیال ان کے دماغ سے مس ہوتا۔ قتل —— ایک انسان کا قتل —— یہ اُن کا نوشتۂ تقدیر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کی عمیق تاریکی ان کے راز سے آشنا تھی اور ہوا کی ہر موج ان کے کان میں "قتل قتل" کا صور پھونک رہی تھی۔ گلی کے ہر کونے میں ایک جسد انسانی خاک و خون میں تڑپتا ہوا نظر آ رہا تھا !!!

وہ پارک میں داخل ہوئے۔ خوشگوار ہوا اور بھینی بھینی خوشبو نے ان کے دماغ پر اچھا اثر کیا اور انہوں نے لوہے کے ٹھنڈے ٹھنڈے کٹہرے پر اپنی پیشانی رکھ دی۔ "قتل قتل" کے الفاظ بے ساختہ ان کی زبان سے نکل رہے تھے۔ وہ خود اپنی آواز سے سہمے جاتے تھے۔ ان کا دماغ پھٹا جاتا تھا۔

لارڈ آرتھر پارک سے نکل کر گلی میں داخل ہوئے اور وہاں سے سڑک پر آ گئے۔ سڑک بالکل خاموش اور سنسان پڑی تھی دونوں جانب گیس کے لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ دور ایک طرف ایک خالی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑیبان غافل سو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے دو آدمی کھڑے ایک اشتہار پڑھ رہے تھے۔ لارڈ آرتھر نے بھی اس پر ایک نظر ڈالی "قتل" کالے جلی قلم سے لکھا ہوا تھا۔ یہ کسی مفرور قاتل کا اشتہار تھا ۔۔۔ "کسی دن میرا اشتہار بھی اسی طرح چسپاں کیا جائے گا۔"

صبح قریب تھی، ابھی آفتاب نہ نکلا تھا۔ صرف اس کی نقابِ بے تار کی ہلکی ہلکی روشنی شب گریزاں کی منتشر تاریکی سے مصروفِ پیکار تھی۔ گرد و نواح کے مزدور پھلوں اور سبزیوں کے ٹوکرے سروں پر رکھے دلکش گیت الاپتے آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ نور اور نغمہ کی اس لطیف آمیزش نے فضا پر ایک والہانہ کیفیت طاری کر دی تھی۔

لارڈ آرتھر ان سب باتوں سے بے خبر انتہائی بخار کی بیہوش کن تپش میں اپنے مکان پہنچے اور سونے کی نیت سے کمرے میں لیٹ گئے۔

(۴)

دوسرے دن تقریباً بارہ بجے لارڈ آرتھر اپنے خواب سے چونکے۔ غسل کیا۔ کچھ ناشتہ کیا اور ایک کرسی پر خیالات میں غرق بیٹھ گئے۔ ان کی نظر سیبل کی تصویر پر پڑی۔ وہ حسن و رعنائی کا ایک مافوق الفطرت مرقع تھی۔ دستِ قدرت نے اپنی پاک صناعی کو اس چہرہ پر ختم کر دیا تھا اور سنگ مرمر و موئے سے نہیں بلکہ "آدم کی گل" سے وہ نازنین بت تراشا گیا تھا جس کا نور زاہدوں کے لئے جلوہ گاہِ طور اور عاصیوں کے واسطے شمع ہدایت تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا اس کی نازک پتلی سفید گردن ریشمیں بالوں کے ہلکے پھلکے بار کو سنبھالنے کے قابل بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ ذرا کشادہ تھے گویا وہ کوئی نغمہ الاپ رہی تھی۔ کنوارپن کی تمام تر نزاکت و رعنائی اس بے گناہ چہرے پر شعاع مرتعش کے مانند رقصاں تھی۔

لارڈ آرتھر سیبل کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ اُن کی محبت ایک بے معنی شہوانی جذبہ نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک آسمانی تقدس تھا۔ سیبل ان کے لئے نیکی اور روحانیت کا مجسمہ تھی۔ وہ محبت کو خود غرضیٔ نفس پر قربان ہوتا نہ دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ شادی کی تاریخ بہت قریب تھی مگر ان کی آوازِ ضمیر اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ سیبل سے شادی نہ کریں کیونکہ ابھی نوشتۂ تقدیر پورا کرنا تھا! وہ کسی بے گناہ انسان کے پاک خون کو صرف اس لئے بہا دیں کہ مشیتِ الٰہی پوری ہو جائے اور اس سے پہلے

شادی کرنا ناممکن تھا۔

وہ اُٹھے اور سوچنے لگے کہ کس کو ہلاک کیا جائے بہت کشش و پنج کے بعد آخرکار انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنی ایک دُور کی رشتہ دار لیڈی کلم کی جان لیں گے۔

تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ لارڈ آرتھر لیڈی کلم کے ساتھ کسی قسم کا تشدد کریں۔ انہوں نے غور کرنے کے بعد تصفیہ کر لیا کہ زہر سے بہتر کوئی شئے اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ایک دوافروش سے انہوں نے تھوڑا سا زہر یہ بہانہ کر کے خریدا کہ انہیں ایک کُتّے کو ہلاک کرنا ہے۔

لارڈ آرتھر نے زہر کی گولی کو شکر میں لپٹوایا اور اس کو ایک نہایت خوبصورت ڈبیا میں رکھ لیا۔ وہ لیڈی سے ملنے چلے گئے۔ لیڈی کلم پُرانی بُڑھی، دقیانوسی وضع کی عورت تھی۔ اس نے شکوے شکایت کا دفتر کھول دیا اور اپنی بیماری کا دُکھڑا رونا شروع کر دیا۔ لارڈ آرتھر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہنے لگے "میں آپ کے لئے ایک دوا لایا ہوں۔ یہ امریکہ کی ایجاد ہے۔ آج تک آپ کے مرض کی اس سے اچھی اور زود اثر دوا دریافت نہیں ہوئی جس وقت آپ کو دورہ پڑے اسے فوراً نگل جائیے دیکھیئے صرف چند لمحوں میں آپ اس کا اثر محسوس کریں گی۔ آپ کا مرض ہمیشہ کے لئے زائل ہو جائے گا" لیڈی نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور انہیں رخصت کر دیا۔

لارڈ آرتھر خوش خوش واپس آئے۔ شادی بالکل قریب تھی۔ یہ نہ کہا جا سکتا تھا کہ لیڈی کلم کو کب دورہ پڑے اور وہ کب گولی کھائے۔ اس خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ سیبل سے ملے اور اُسے اس بات پر راضی کر لیا کہ کچھ عرصہ کے لئے شادی ملتوی کر دی جائے۔

(۵)

اس اثنا میں لارڈ آرتھر پیرس چلے گئے۔ وہ ہر روز اخباروں کی صفحہ گردانی کیا کرتے کہ لیڈی کلم کے انتقال کی خبر پڑھیں مگر کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک دن وہ ہوٹل کے زینے سے اُتر رہے تھے کہ نوکر نے انہیں ایک تار دیا۔ لارڈ آرتھر کی خوشی اور شادمانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کا دل بلیوں اُچھلنے لگا لیڈی کلم مر چکی تھی!!! اب آخری کانٹا نکل گیا تھا۔ سیبل کی تصویر اُن کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لیڈی کلم کے مشیر قانونی کا خط موصول ہوا جس میں انتقال کی خبر درج تھی اور لکھا تھا کہ لیڈی اپنا مکان اور جائداد منقولہ لارڈ آرتھر کو چھوڑ گئی ہے!" لارڈ آرتھر نے اپنی آمد کا تار فوراً لندن بھیج دیا اور روانہ ہو گئے۔ وہ لیڈی کلم کے مکان پر گئے تاکہ تمام چیزوں کا جائزہ لے سکیں اور جو کچھ تھوڑا بہت حساب لیڈی کے نام تھا وہ صاف کر دیں۔

لارڈ آرتھر اِدھر اُدھر سامان کو دیکھ رہے تھے، دفعتًہ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، ہوش و حواس معطل ہو گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بیہوش ہو گئے ——— زہر کی گولی اسی طرح ڈبیا میں بند رکھی تھی۔ لیڈی کلم دراصل طبعی موت مری تھی۔ اس نے گولی کو چھوا تک بھی نہ تھا!!!

لارڈ آرتھر ناکام رہے۔ وہ سیبل سے شادی نہ کر سکتے تھے۔ ان کا دل بجھ گیا۔ سیبل کے والدین شادی کا تقاضا کر رہے تھے۔ پہلے ہی التوا سے طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اب شادی کے دوسرے التوا سے سیبل کے والدین کو از حد تکلیف ہوئی مگر اُنہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ لارڈ آرتھر کے اصرار پر ایک مرتبہ اور شادی ملتوی کر دیں۔ اگر اس بار اُنہوں نے مقرّرہ تاریخ پر شادی نہیں کی تو رشتہ منقطع ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لئے اپنی محبوبہ سے الگ کر دیئے جائیں گے۔

(۶)

لارڈ آرتھر بڑے متفکر تھے۔ زہر کی ترکیب ناکام رہی تھی۔ اب کیا کرنا چاہئے؛ کیسے قتل کیا جائے؛ کس کی جان لی جائے؛ انہوں نے پھر سوچا اور تصفیہ کیا کہ وہ اپنے چچا ڈین جی چیسٹر کی جان لینگے اور اس مرتبہ بجائے زہر کے بارود استعمال کرینگے۔ ڈین کو پرانی گھڑیاں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ گویا اس کا مشغلہ تھا۔ اس کے پاس قسم قسم کے گھنٹے جمع تھے۔ پندرہویں صدی سے لے کر زمانۂ موجودہ تک کی گھڑیاں ڈین کے قبضہ میں تھیں جو اس کی لائبریری میں خوبصورت منقش الماریوں میں نہایت حفاظت سے رکھی تھیں۔

اب سوال یہ تھا کہ مادۂ آتش گیر کہاں سے اور کیونکر حاصل کیا جائے۔ لارڈ آرتھر کو اس کے متعلق کسی قسم کا علم نہ تھا انہیں اپنے ایک روسی دوست کا خیال آیا جس کا قیام انگلستان میں مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ روسی کو اس بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلومات ہونگی۔ یہ خیال آتے ہی وہ اُٹھے اور اپنے دوست کے مکان کی راہ لی۔

اُنہوں نے سارا معاملہ کہہ سنایا، روسی نے دبی زبان میں ان سے دو چار کلمے کہے اور ایک پُرزے پر انہیں کسی نامعلوم کوچے کا پتہ لکھ دیا۔

لارڈ آرتھر اس پتے کے بموجب ایک گندی تاریک گلی میں ایک مکان پر پہنچے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی ایک آدمی نے گھبرا کر دروازہ کھولا اور پوچھا "فرمائیے کیا مطلب ہے؟"

لارڈ آرتھر نے پرچہ دیتے ہوئے کہا "مجھے انہوں نے بھیجا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر بلائے گئے جہاں ایک نوجوان جرمن نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں چاء پر مدعو کیا۔ لارڈ آرتھر نے چائے پی اور جرمن سے اپنا مطلب کہا۔ وہ ایک ایسا گھنٹہ چاہتے تھے جو کسی مقررہ وقت پر ڈائنامیٹ کی طرح خود بخود پھٹ

جلائے اور اپنے ساتھ سب کو لے اُڑے۔

جرمن نے تھوڑے توقف کے بعد لارڈ آرتھر کو ایک گھنٹا دے دیا اور کہا "یہ جمعہ کے دن ٹھیک بارہ بجے اُڑے گا۔"

لارڈ آرتھر بہت خوش ہوئے۔ شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئے۔

(۷)

جمعہ، ہفتہ، اتوار لارڈ آرتھر بڑی بیتابی سے ڈین کی موت کی خبر کا انتظار کرتے رہے۔ وہ ہر اخبار کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے کہ کسی نے اس واقعہ کی خبر دی ہو گی مگر کسی اخبار میں اس کا ذکر تک بھی نہ تھا۔ وہ بڑے مایوس ہوئے۔ کمرے سے نکلے اور اپنا فکر و تردد رفع کرنے کے لئے ڈچز سے ملنے چلے گئے۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈچز نے کہا لارڈ آرتھر کل ڈین کی صاحبزادی کا خط موصول ہوا ہے۔ ایک بات بہت عجیب لکھی ہے کسی نے ضعیف ڈین کو ایک گھنٹا بھیجا تھا جو اس نے اپنے کتب خانے میں ٹانگ لیا۔ جمعہ کے دن اس میں سے ایک عجیب گھر گھر کی آواز آئی، تھوڑا سا دھواں نکلا اور گھنٹہ بند ہو گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے گھنٹے بچوں کے کھلونوں کے طور پر جرمنی میں بہت بکتے ہیں اور اس طرح جتنی بار چاہو لے چلایا جا سکتا ہے۔ کسی مسخرے نے مذاق مذاق میں یہ گھنٹا ڈین کو بھیج دیا!!!"

لارڈ آرتھر نے نہایت تحمل سے سارا واقعہ سُنا۔ چند منٹ بعد وہ ڈچز سے رخصت ہو گئے اور واپس اپنے کمرے میں آ لیٹے۔

خود تقدیر ان کے کاموں میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ ان کے ارادوں اور منصوبوں کے پورا ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، وہ کبھی کبھی یہ سوچتے تھے کہ سیبل سے رشتہ توڑ لیا جائے۔ اگلے ہی دن شادی کی تاریخ تھی اور اب التوا ناممکن تھا۔ ہاں اس کی آئندہ زندگی افسردگی اور ناکامی کا ایک زندہ مرقع ہو گی۔

(۸)

شام ہو گئی اور لارڈ آرتھر کلب چلے گئے۔ واپسی پر ان کی طبیعت پریشان تھی وہ دریائے ٹیمز کے پُل پر تفریح کی غرض سے چہل قدمی کرنے لگے۔ جوں جوں رات بڑھتی گئی پُل پر ویرانی چھاتی گئی، بارہ بجے پل بالکل سنسان تھا۔ مگر لارڈ آرتھر خاموشی سے ایک بنچ پر بیٹھے رہے۔ دو بجے وہ اُٹھے اور آہستہ آہستہ مکان کی طرف چلے۔ رات کی تاریکی میں کل نظارہ دھندلا ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی اونچی اونچی عمارتیں تاریک لبادہ اوڑھے کھڑی تھیں۔ لارڈ آرتھر آگے بڑھے۔ دُور پل کی دیوار کے پاس ایک آدمی سا نظر آیا۔

لارڈ آرتھر اس کے قریب گئے اور گیس کی دُھندلی روشنی میں اسے نہایت غور سے دیکھا ــــ ہاں یہ وہی عالم ید تھا ــــ مسٹر پوجر ــــ وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ان کے دماغ میں کوئی خیال آیا وہ بہ سرعت تمام نہایت خاموشی سے مسٹر پوجر کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور آن کی آن میں عالم ید کو اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا!!! انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ بالکل خاموشی تھی۔ وہ لپک کر جلدی سے پل پار کر گئے ــــ شادی اور سیبل!!! ــــ

(آسکر وائلڈ)

جیو اد میرٹھی

رخصت!

انتہائے یاس و غم میں چھوڑ کر جاتے ہو کیوں؟ / تم تو جانِ آرزو ہو مجھ کو تڑپاتے ہو کیوں؟

کیا کرے گا آہ کوئی نامرادِ زندگی / وقتِ رخصت مجھ سے ملنے کی قسم کھاتے ہو کیوں؟

ایک مجبورِ محبت سے تغافل کس لئے؟ / ایک پابندِ وفا سے اتنا شرماتے ہو کیوں؟

پاسِ ناموسِ وفا سے لب پہ ہے مہرِ سکوت / مجھ سے اور افشائے رازِ عشق گھبراتے ہو کیوں؟

گرمیٔ الفت تمہارے پیار کے قابل نہیں / دل کی دنیا پر تمنا بن کے چھا جاتے ہو کیوں؟

مجھ سے نفرت ہے تو میرے دل سے کیوں نفرت نہیں / یاد بن کر تم مرے پہلو میں آ جاتے ہو کیوں؟

کیوں خیال آیا مری مایوسیوں کا اب تمہیں؟ / اپنی غفلت یاد کر کے خود ہی شرماتے ہو کیوں؟

رہنے دو جس حال میں رکھا ہی تم نے آج تک / اور بھی عذرِ جفا سے دل کو تڑپاتے ہو کیوں؟

نہیں ان آنکھوں کو دیکھے گا سرشک آلودہ کون؟ / جاتے جاتے یہ نیا مجھ پر ستم ڈھاتے ہو کیوں؟

رخصت اے روحِ نشاط! اے راحتِ جانِ حفیظ

اب تمہاری یاد ہوگی دین و ایمانِ حفیظ

حفیظ ہوشیارپوری

بچے کی چوری

گاؤں کے وسیع میدانوں کی صاف ہوا اور چمکتی ہوئی دھوپ میں میری زندگی کے پندرہ سال چشم زدن میں گزر گئے۔ کیسی پرکیف فضا تھی اور کیسی بے فکر زندگی۔ بچپن ہی سے میرا رنگ جنگلی پیپل کی طرح کچھ بھورا سا تھا۔

ہمیشہ کسی کی ایک سی نہیں گزرتی۔ میری خوشگوار زندگی میں بھی انقلاب آیا۔ میرے والدین موٹر میں تفریح کے لئے گئے تھے۔ ایک سخت حادثہ پیش آیا اور دونوں اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

کیسا صبر آزما وقت تھا۔ اس کی اہمیت کسی طرح میرے تصور میں نہ آتی تھی۔ بہت کچھ سوچتی تھی مگر سمجھنے سے قاصر تھی۔ میری پھوپھی جوآیا جس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے آئی۔ یہی ایک قریبی عزیز تھی۔ میرے باپ کی سوتیلی بہن۔

چند روز بعد پھوپھی نے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو چبا کر کہا " ایلس! تمہارے باپ نے ایک پائی بھی نہیں چھوڑی۔ یہ کھیت بھی رہن ہے۔ قرض ادا کرنے کے لئے اسے بھی فروخت کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں میرے ہی ساتھ رہنا ہوگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح تمہاری کفیل ہو سکتی ہوں۔ تمہارا کوئی اور ایسا عزیز بھی نہیں ہے۔ البتہ تمہاری صحت اچھی ہے۔ اس سے خیال کرتی ہوں کہ شاید تمہیں کوئی نوکر رکھ لے اور تمہارے ٹکڑے کا سہارا ہو جائے۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ پھوپھی۔ جسے خود بھی مجھ سے نفرت تھی۔ اس کے ساتھ رہنا۔ مجھے اپنی زندگی میں روپیہ پیسہ کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دولت گھر میں بھری پڑی ہے۔ میرا باپ نہایت کشادہ دل انسان تھا۔ جب کبھی وہ شہر سے واپس آتا تو ہمیشہ میرے اور ماں کے لئے اچھے اچھے تحائف لایا کرتا۔

آہ! اس رات کی وحشت! جب میں پھوپھی کے گھر جا رہی تھی۔ شاید عمر بھر فراموش نہ کر سکوں۔ اس کے ہر قول اور ہر فعل سے صاف ظاہر تھا کہ میں ایک بلائے ناگہانی ہوں جو اس کے سر آپڑی۔

سفر کی تمام رات میں نے رو رو کر کاٹی۔ کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ کسی اسٹیشن پر اتر کر چپکے سے کہیں کو چل دوں لیکن میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

میری زندگی کے آئندہ چند سال اسی امید میں بسر ہوئے کہ میں کب بڑی ہوتی ہوں۔ کب ملازمت ملتی ہے اور کب یہاں سے چھٹکارا نصیب ہوتا ہے۔

ہم ایک بڑے شہر میں رہتے تھے۔ یہاں کے شور و غل اور مصروفیت سے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اور موٹروں کی آواز سے تمام تمام رات نیند نہ آتی تھی۔ اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر دم سا گھٹتا تھا۔ سڑکوں کے گرد و غبار سے طبیعت پریشان رہتی تھی۔ اس چھوٹے سے مکان کے تنگ و تاریک کمرے قبر سے کچھ کم نہ تھے..... اور میں زندہ در گور تھی۔

گھر کا سارا کام کاج میں ہی کرتی تھی لیکن پھوپھی پھر بھی ہمیشہ مجھ سے ناراض ہی رہتی۔ میرے ہر کام پر اعتراض کرتی اور ہر چیز میں عیب نکالا کرتی تھی۔ وہ اپنے احباب میں بیٹھ کر برملا میرے مُنہ پر کہتی کہ یہ خانہ داری کے قابل نہیں اور شاید اس سے کبھی کوئی شادی کرنا بھی پسند نہ کرے گا۔ اب میں خود اپنی آنکھوں میں بھی ذلیل ہو رہی تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے یقین سا آگیا تھا کہ میں نہایت بدصورت اور بھونڈی ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ میرا اگلا سا رنگ روپ نہ رہا تھا۔ دن پریشانی میں کٹتے اور رات رونے میں بسر ہوتی جس کا اثر صحت پر ہونا لازمی تھا، اور ہوا ...... میری بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔

میرے بال خوب گھنے اور بہت لمبے لمبے تھے۔ اگر میں نے ان کی نگہداشت کی ہوتی تو کیسے خوبصورت معلوم ہوتے لیکن پھوپھی کے دل شکن طرزِ عمل سے دل ہی مر چکا تھا۔

ایک دن شام کو اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس نے پھر میری زندگی کو ایک پلٹا دیا۔ "کسی بچے کے لئے ایک نرس کی ضرورت تھی جو گاؤں میں رہنے کے لئے آمادہ ہو" جب میں نے یہ جملہ پڑھا تو میرا دل ایک وحشیانہ خوشی سے اُچھلنے لگا۔

آمادہ! ...... گاؤں! ...... دو لفظوں میں میرے لئے ایک جنت کا سحر تھا۔ میں نے پتہ لکھ کر احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا اور یہ طے کر لیا کہ پھوپھی کو ہرگز اس کا علم نہ ہونے دوں گی۔ غالباً وہ روکتی تو نہیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کسی طرح میں کالا مُنہ کر جاؤں۔ لیکن اندر ہی اندر جی ڈرتا تھا کہ اگر اسے خبر ہو گئی تو ممکن ہے کچھ رُکاوٹیں پیدا کر دے۔

دوسرے دن علی الصباح میں آرڈن کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتری۔ راستے میں ہر لحظہ میرے دماغ میں اپنے بوسیدہ کپڑوں کا خیال رہا۔ میرے پاس گنے چنے کپڑے تھے اور وہ بھی سب پُرانے۔ دورانِ گفتگو میں جو آئندہ پیش آئی، میں نے اپنے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے چھپائے رکھا کیونکہ دستانوں میں سے انگلیاں جھانک جھانک کر میری مفلوک الحالی کا اعلان کر رہی تھیں۔

اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت سی عمارت تھی جس کے چاروں طرف خوش وضع وسیع برآمدے تھے۔ سامنے سرسبز گھاس کے دلفریب تختے تھے۔ میں تو کھلی ہوا اور ہرے بھرے درختوں کو ترس گئی تھی۔ میری نظر میں اس وقت یہ دنیا کا انتہائی دلفریب مقام تھا۔

ملاقات کے بڑے اور ٹھنڈے کمرے میں ایک طویل انتظار کے بعد مالکہ برآمد ہوئی۔ مجھے سخت تعجب ہو رہا تھا کیونکہ ہر چیز

گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ نوکر چاکر بالکل بے پروا تھے۔ مالک کو بھی اپنی چیز کا کوئی درد نہ تھا۔ میرا خانہ داری کا جذبہ متقاضی ہوا کہ سب کو صاف کر دوں مگر کوئی کپڑا ہی نظر نہ آیا۔

مسز کارٹرائٹ کو دیکھ کر میں ششدر رہ گئی۔ کس بلا کی حسین تھی! کیسی خوبصورت تھی اور کتنی خوبرو۔ میں اس کے آگے خود کو پہلے سے بھی زیادہ بدصورت خیال کرنے لگی۔ اس کی پوشاک کس قدر قیمتی تھی اور کتنی موزوں گویا یہ تراش ایجاد ہی اس کے لئے ہوئی تھی اور غالباً ایسا ہی ہو۔

میں نے کبھی کوئی ایسی دلکش چیز نہ دیکھی تھی جیسے اس کے سرخ سنہرے گھونگرالے بال، اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ۔ نرم اور بلوریں، شاید اس نے تمام عمر ان سے کوئی کام ہی نہ لیا تھا۔ اس کے گلابی ناخن کس قدر گول اور خوبصورت ترشے ہوئے تھے!

میں اس کے حسن بے پناہ سے پوری طرح مرعوب ہو چکی تھی اور اس خیال سے کہ شاید میری شکستہ حالی سے متنفر ہو کر وہ مجھے رکھنا پسند نہ کرے مجھ پر سکرات کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

لیکن میری یہ وحشت اور پریشانی فضول تھی اس نے مجھ سے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ اس کی برف جیسی نیلگوں آنکھیں مجھ پر پڑیں لیکن انہوں نے میری پوشش کا جائزہ نہ لیا۔ اس کے چند مختصر سوالات کا جواب میں نے جس مردہ آواز میں رکتے رکتے دیا اس کے سننے کی بھی اس نے تکلیف گوارا نہ کی اور نہایت بے پروائی سے کہا۔

"کل سے تم کام کرنے کے لئے آسکتی ہو۔ مکان کے عقبی حصہ میں بچے کے کمرے کے برابر تمہیں ایک کمرہ مل جائیگا اپنا سامان لیتی آؤ۔"

ملاقات اس قدر مختصر تھی کہ جب میں واپس جانے لگی تو خود حیران تھی کیا مجھے ملازمت مل گئی! دماغ میں یہی ایک خیال تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ میری نگرانی میں ہوگا۔ میں یہاں رہوں گی اور اب شاید بھوکا بھی جو لیا کو کبھی تکلیف دینے کی ضرورت بھی پیش نہ آئیگی۔ اگر مجھے علم کی ان تاریک اور بھیانک گھٹاؤں کا علم ہوتا جو اس مکان پر چھائی ہوئی تھیں تو شاید اس وقت اتنی خوشی محسوس نہ کرتی۔ لیکن بہت جلد مجھے ان سے دوچار ہونا پڑا۔

پہلی مرتبہ جب میں نے بچے کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ میرے سایہ سے ڈرتا تھا۔ ہر چیز سے خائف نظر آتا تھا جب میں اسے پیار کرنے کے لئے جھکی تو وہ کانپ کر پیچھے ہٹ گیا اور پریشان نگاہوں سے میرا منہ تکنے لگا۔ . . . شاید اس نے میری آنکھوں میں محبت اور رحم کی جھلک دیکھ لی۔ وہ رفتہ رفتہ مجھ سے مانوس ہونے لگا۔ . . . اس کا خوف جاتا رہا۔ جب میں اس کی پیشانی پر بوسہ دیتی تو اس کے لبوں پر ایک جانگداز تبسم جھلک آتا۔

میرا خیال تھا کہ شاید پہلی نرس بہت سخت گیر تھی اس لئے وہ ہر چیز سے ڈرتا تھا۔ ڈکی کی محبت پہلی ہی نظر میں دل

میں گھر کر چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا تندرست بچہ تھا۔ نہایت خوبصورت گھونگر والے بال اور راست باز نیلی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آنکھیں جو اب میری صورت دیکھ کر مسکرانے لگتی تھیں۔

وہ سات سال کا ہوگا۔ اس عمر میں تفکرات سے کیا کام مگر وہ بعض اوقات بیحد متفکر اور غمگین نظر آتا تھا۔ اکثر کھیلتے کھیلتے ایک دم خاموش ہوکر کسی گہرے فکر میں ڈوب جاتا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ وہ بلا وجہ چلا چلا کر رونے لگا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور رونے کی وجہ معلوم کرنی چاہی مگر وہ اپنے سر کو جنبش دے کر خاموش ہوگیا۔

اس کے والدین میں سے مجھے کسی سے بھی ملنے کا موقع نہ ملا۔ کیونکہ مسٹر کارٹرائٹ تو غالباً اکثر قصبہ سے باہر ہی رہتے تھے اور ماں کبھی بھول کر بھی ڈکی کے کمرے کا رُخ نہ کرتی تھی۔

تقریباً دس روز بعد ایک دن میں بچے کو کھانا کھلا رہی تھی کہ اس کا باپ کمرے کے دروازہ میں داخل ہوا۔ اس سے قبل مسٹر کارٹرائٹ کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا لیکن دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بچے کے سے خوبصورت گھونگر والے بال، وہی نیلگوں آنکھیں اور وہی مضبوط متناسب اعضاء۔ نہایت متانت سے وہ مجھ سے مخاطب ہوا "مجھے اُمید ہے کہ تم اس کی غور و پرداخت بخوبی کر سکو گی"۔

یہاں کی فضا کو میں ایک عرصہ تک نہ سمجھ سکی۔ ایک دن میں ڈکی کو لئے گھاس پر ٹہل رہی تھی۔ بمشکل وہ ایک منٹ کے لئے مجھ سے علیحدہ ہوا ہوگا کہ میں نے اس کے چیخنے کی آواز سنی۔ بھاگی ہوئی گئی اور جو کچھ دیکھا کتنا پریشان کن تھا۔

ڈکی کی ماں حسن کی ملکہ! اپنا ایک ہاتھ صوفے کی پشت پر رکھے ہوئے کھڑی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک بلوری جام تھا۔ میرے لئے بدگمانی کی تو کوئی وجہ نہ ہوسکتی تھی مگر اب مجھے دیکھ کر گمان ہوا کہ وہ نشہ میں چُور ہے۔

"یہاں آکر پریشان کرنے کا ابھی مزہ چکھاتی ہوں! شیطان کا بچہ! میرے آگے سے دفع ہو!"

ڈکی ایک جھاڑی کے پیچھے کھڑا ہوا کانپ رہا تھا، رو رہا تھا۔ اس کے رخسار پر انگلیوں کے سُرخ نشان پڑے ہوئے تھے۔

مسز کارٹرائٹ نے مجھ سے کچھ نہ کہا مگر اس کے خوبصورت دہانہ پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور وہ مُنہ پھیر کر چل دی۔

میں ڈکی کو گود میں اُٹھا کر کمرہ میں چلی گئی۔ پیار محبت سے اس کی دلدہی کرنے لگی۔ پیارا ڈکی۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ محبت کرنی پڑے گی۔

اس کے بعد بچے سے مجھے کتنی محبت اور ہمدردی پیدا ہوگئی میں بیان نہیں کرسکتی۔ اس کے خفیف سے تبسم سے میرے دل کی کلی کھل جاتی تھی۔ میں جوان تھی اور دنیا میں تنہا تھی لیکن ڈکی بچہ تھا اور کس قدر پیارا بچہ۔ اس کی ذات میری محبت کا مرکز بن چکی تھی۔ ڈکی بھی ہر وقت میرے ساتھ ساتھ تھا۔ مجھ سے علیحدہ ہوکر کبھی خوش نہ رہتا تھا۔ میں جہاں جاتی اور جو کام کرتی وہ میرے پیچھے ہی پیچھے رہتا۔ بغیر میرے کبھی باہر کھیلنے کو بھی نہ جاتا تھا۔

ڈکی کی ماں کبھی اسے اپنے پاس تک نہ بلاتی تھی اور اگر کبھی کسی وجہ سے بلاتی بھی تو میں حتے الامکان اسے دُور ہی رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس روز شام کے بعد سے میں بہت زیادہ محتاط ہوگئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اکثر و بیشتر شراب کے نشہ میں چُور رہتی تھی۔ شراب ایک بلا کی طرح اسے لپٹ گئی تھی۔

لیکن شراب کا کوئی اثر اس پر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ جام پر جام پینے کے بعد بھی اس کا حُسن انتہائی دلکش ہوتا تھا۔ البتہ اس کے قدموں میں تھوڑی سی لغزش ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر کارٹرائٹ بھی اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا ہے رات کو ڈکی کے سونے سے قبل وہ بلاناغہ اس کے کمرہ میں آیا کرتا تھا۔

اس نے ایسے پُرلطف اور دلچسپ کھیل ایجاد کئے جن میں ہم تینوں کو یکساں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی موجودگی اور کھیل کے انہماک میں مجھے اپنے نرس ہونے کا احساس نہ رہتا تھا۔ اطمینان اور خوشی کے ان چند لمحوں میں دُنیا کا ہر خیال فراموش ہو جاتا تھا۔

ہم اکثر گالف کی قسم کا ایک کھیل کھیلا کرتے تھے اور جب کسی کی گیند لڑھک کر حلقہ سے باہر نکل جاتی تو سب بچوں کی طرح جوشِ مسرت میں چلّانے لگتے تھے۔ جب مسٹر کارٹرائٹ کا نشانہ خطا کرتا اور گیند حلقہ سے باہر نکل جاتی تو ڈکی بہت زور سے ہنستا لیکن ہمیں کبھی اس شور و غل کا احساس نہ ہوتا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ کارٹرائٹ کی متین اور بُردبار آنکھوں سے جب ان معصوم کھیلوں کی دلچسپی غم کے تاریک پردے چاک کر کے سرور و انبساط کی ایک لطیف جھلک پیدا کر دیتی تو مجھے کس قدر مسرت ہوتی تھی۔ کھیل میں وہ خود ایک چھوٹا سا بچہ بن جاتا تھا۔ ڈکی کی طرح خوشی سے اُچھلتا کودتا اور سارے کمرے میں بھاگا بھاگا پھرتا۔ کھیلوں میں ہمیشہ نئی نئی دلچسپیاں پیدا کرتا رہتا۔ اس کے قوی ہاتھ بچوں کی طرح ہمیشہ کنسٹرکشن میں مصروف رہتے۔ بعض اوقات مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر اس کے مجھے کھیل میں کوئی لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

اب تک مجھے اپنی ذاتی خوشی کا کوئی احساس نہ تھا۔ اپنا ذاتی عیش و آرام، اپنے ذاتی گھر کی مسرت، اپنے شوہر کی محبت، اپنے بچے کی راحت اور دل کا چین میرے لئے بے معنی سی باتیں تھیں۔ میں ان ہی کی مسرتوں میں مسرور رہتی۔

دو ایک مرتبہ میں نے اس کی پرسکون آنکھوں کو انتہائی خاموشی کے عالم میں اپنے چہرہ پر جمے ہوئے دیکھا۔ اور میرے دل میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ وہ بے چینی جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن فوراً ہی یہ اثرات دل سے از خود فراموش ہو جاتے اور میں سب کچھ بھول جاتی۔

ایک رات کو ایسا تکلیف دہ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے کھیلوں کی تمام دلچسپی ہمیشہ کے لئے مفقود ہوگئی۔

حسب معمول ہم کھیل رہے تھے۔ مسٹر کارٹرائٹ کی گیند لڑھک کر صوفے کے نیچے چلی گئی۔ میں اس کو نکالنے کے لئے جھکی اور پسے مسٹر کارٹرائٹ بھی ڈھونڈنے لگے اچانک ہمارے سر ٹکرا گئے۔

ڈکی بہت زیادہ خوش تھا۔ خوب ہنس رہا تھا.... بچپن کی آزاد اور بے فکر ہنسی.... میں نے ایک دم اس کی آواز بند ہوگئی جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ہم دونوں گھبرا کر صوفے کے نیچے سے نکلے۔

مسز کارٹرائٹ دبے پاؤں آکر دروازہ میں کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک عیارانہ تبسم تھا اور وہ جھوم رہی تھی۔ اس کے آنے سے قبل ہمارے کھیل میں کتنی معصومیت اور کیسی دلچسپی تھی.... مگر میں کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ خاموش کھڑی جھومتی رہی اور مسکرایا کی۔

میں گھبرا کر اٹھی۔ مسٹر کارٹرائٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دانت بھینچ کر نہایت سخت نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اور کیا کہتی۔ لیکن وہ ایک دم پلٹی اور چلی گئی۔

اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ لیکن اس کی مخمور آنکھیں اور اس کا زہر آلود تبسم دیکھنے والے کیلئے اپنے دامن میں نفرت اور حقارت کا ایک دفتر چھپائے ہوئے تھا۔

ہم سب پریشان ہوگئے تھے۔ آخر مسٹر کارٹرائٹ نے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سختی نہ تھی۔ جوش ندامت سے میرے ہونٹ کانپنے لگے لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ میرے جذبات کا مطالعہ کر رہا تھا پھر وہ قریب آکر میرے کاندھوں کو تھپکنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ ایلس تم کچھ خیال مت کرو۔ وہ بعض اوقات ایسی ہی بیہودہ حرکات کرنے لگتی ہے.... تمہارے بغیر ڈکی اور میں کیسے رہیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ اس کے بعد وہ ڈکی سے مخاطب ہوا۔

"اب ہمیں کھیل ختم کر دینا چاہئے"۔ اس کے لب و لہجہ میں کوئی اضطرابی کیفیت نہ تھی۔

میں اپنے بستر پر جا لیٹی۔ غم کی تاریک بدلی جو میرے اوپر منڈلا رہی تھی میرے وہم و گمان میں نہ تھی۔ میں تو دل میں ایک گونہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔ ہاں۔ اس نے کہا تھا ڈکی اور میں.... اور آج پہلی مرتبہ اس نے مجھے ایلس کہہ کر مخاطب کیا ان ہی خیالات میں میری آنکھ لگ گئی۔

ابھی چند ہفتے نہ گزرے تھے کہ بدقسمتی رنگ لائی۔ سر پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ آہ۔ وہ جذبات کا طوفان۔ وہ عالم خود فراموشی جس نے مجھے بچے کی حمایت میں اندھا اور گستاخ بنا دیا۔ اس وقت کا خیال کرنے سے اب بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

میں نے ڈکی کو سونے کے لئے لٹا دیا تھا اور خود بھی کھانا کھا کر اپنے کمرہ میں جا رہی تھی۔ شاید میں نے ایک آواز سنی۔

میں فوراً پلٹی۔ ڈکی میرا نام لے لے کر پکار رہا تھا۔ جب میں اس کے کمرہ کے قریب پہنچی تو وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا: "مجھے تم سے نفرت ہے . . . . . میں تم سے نفرت کرتا ہوں! تم بہت بری ہو! ایلس۔ ایلس . . . . . "

میں نے ایک دم دروازہ کھولا۔ مسز کارٹرائٹ ڈکی کے پلنگ پر جھکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ ڈکی جاگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خوف و ہراس سے چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے گلہ پر رکھ چھوڑا تھا جس پر خون جھلک رہا تھا۔

میں غصہ سے سُرخ ہو گئی اور کانپنے لگی۔

"سوتے بچے کو پریشان کرنے کے لئے تم کمرہ میں کیسے آئیں؟" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "اگر اس کے دل میں تم اپنی عزت اور اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی ہو تو کبھی نشہ کی حالت میں اس کے پاس مت آیا کرو۔"

"اوہو۔ میں پیئے ہوئے ہوں"۔ وہ غصہ سے میری طرف بڑھی۔ میں نے اپنی پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔

"ہاں۔ تم نشہ میں ہو! تم کیسی ذلیل اور غیر فطری ماں ہو۔ ڈکی جیسے معصوم اور پیارے بچے کے سامنے ایسی مثال پیش کرتی ہو۔"

وہ پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ دروازہ کا سہارا لے کر سنبھلی۔

"تم ڈکی کو مجھ سے ورغلاتی ہو؛ تمہیں اس کا ایسا مزہ چکھاؤں گی" ——— اس کی آواز بھرّانے لگی۔ "نکل جاؤ یہاں سے ابھی۔ فوراً اپنا سامان باندھو اور کالا مُنہ کرو!"

میں اپنا سر پکڑ کر بچھونے پر بیٹھ گئی۔ معلوم نہیں وہ کب گئی۔ کچھ خیال تو ہوتا ہے کہ میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ ڈکی مجھ سے بچھڑ جائے گا! مجھے یقین نہ آتا تھا۔ میرے اعصاب اس قدر بے حس ہو گئے تھے کہ کچھ محسوس نہ کر سکی۔ جب ڈکی گلے میں باہیں ڈال کر میرے سینے سے لپٹ گیا تو میں ایک دم چونک پڑی۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔

"نہیں۔ تم ہرگز نہیں جا سکتیں۔ ایلس۔ . . . . ایلس تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں! میں بھاگ جاؤں گا . . . . . میں خودکشی کر لوں گا! . . . . مجھے اس سے نفرت ہے . . . . . میں اسے مار ڈالوں گا!"

"چپ۔ چپ۔ ڈک!" میں نے بچے کے جذبات سے خوفزدہ ہو کر کہا "تمہیں اپنی ماں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں"

"لیکن مجھے اس سے نفرت ہے انتہائی نفرت۔ میں یہاں کی ہر چیز سے نفرت کرتا ہوں سوائے اپنے باپ کے۔ ایلس تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ"۔

میں خاموش بیٹھی رحم آلود نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ معلوم نہیں کس خیال میں تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ بار بار اپنے رومال کو کھولتی اور پھر بل دے کر انگلیوں پر لپیٹ دیتی۔ ڈک سے جدائی کسی طرح تصور میں نہ آتی تھی۔ کسی طرح۔

ایک دم میرے دل میں ایک وحشیانہ خیال پیدا ہوا!

ڈِک کو بھی ساتھ ہی کیوں نہ لے جاؤں؛ وہ کسی طرح اس کی ماں ہونے کے قابل نہیں۔ اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے اور اپنے ساتھ سارے گھر کی . . . . مجھے بچے سے کتنی محبت تھی۔ پھر اس کو کیا حق ہو کہ وہ بچے کو اپنے پاس رکھے۔

اگر میں اور زیادہ غور کرتی تو شاید اپنے خیال پر عمل نہ کر سکتی۔ لیکن تمام پیرائۂ عمل تصویر کی طرح آنکھوں کے آگے آگیا۔ میرے پاس تھوڑے سے کپڑے تھے۔ میں ڈِکی کی ضرورت کے موافق اس کا سامان بھی بآسانی اپنے بکس میں رکھ سکتی تھی۔

میں چور زینہ سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ میں نے اس وقت یہ بھی نہ سوچا کہ آئندہ کن مشکلات کا سامنا ہوگا اور میں کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤں گی۔ ایک نفرت کا جذبہ تھا جو میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔

میں نے فوراً دماغ میں سب طے کر لیا۔ ڈِکی کو سینہ سے لپٹا کر خوب پیار کیا "کیا تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو؟"

اس کی پُرنم آنکھوں میں تبسم جھلکنے لگا "ایلیس، میں تمہارے ساتھ چلوں گا"۔

"اچھا تو خاموش ہو جاؤ۔ اب روؤ مت۔ میں اپنا سامان باندھ لُوں"۔

اس کے چہرہ پر نظر ڈالنے سے اس کے دلی جذبات آئینہ کی طرح عیاں ہو گئے۔

میں گھبرائی ہوئی اپنے کمرہ میں گئی۔ کپڑے سمیٹے اور اُلٹے سیدھے بکس میں بھرے۔ پھر ڈِکی کے کمرہ میں آئی اور اس کی تمام چیزیں جس قدر بھی بکس میں آسکیں رکھ لیں۔

قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ جب ہم عقبی دروازہ سے نکلے تو دُور دُور بھی کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ میں اور ڈِک عام راستہ چھوڑ کر گھاس پر ہو لئے۔

اسٹیشن گو قریب ہی تھا مگر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شاید کوئی پہچان لے۔ ڈِکی کو میں کسی طرح بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میرا آرامِ جاں، میرا سکونِ دل میرے ساتھ تھا۔ میں اسے کیسے چھوڑ دیتی۔

دوسرا اسٹیشن دو میل کے فاصلے پر تھا۔ گھسٹتے گھسٹاتے ہم وہاں پہنچے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج دو میل ختم ہی نہ ہونگے۔ جوتا الگ تکلیف دے رہا تھا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ ڈِک بھی بہت تھک گیا تھا۔ چنانچہ کچھ راستہ اسے گود میں لے کر بھی طے کرنا پڑا۔

اسٹیشن پہنچ کر میرے دم میں دم آیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے یہ کیا کیا! لیکن اپنے اس فعل کو اخلاقی نقطۂ نظر سے نہ دیکھ سکی۔ میں صرف اس خیال کی مسرتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ "ڈِکی میرا ہے۔ صرف میرا!"

گاڑی کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ تکان بہت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈِکی میرے قریب سکڑ کر بیٹھا اور بیٹھتے ہی سو گیا

میں نے اُس کے جسم کی حرارت محسوس کی اور میرا دل جذباتِ محبت سے لبریز ہوگیا۔

میں نادانی سے یہ سمجھی کہ اب تمام مراحل طے ہوچکے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش و خرم رہا کریں گے۔ میں نے محبت سے اس کے بھولے اور معصوم چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر مستقبل کے شیریں خواب دیکھنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ کسی نے میرا شانہ ہلایا ۔ ۔ ۔ ۔ ریل کی گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔

میں جلدی سے اُٹھی۔ ڈکی کو اُٹھایا۔ اتنے میں گاڑی آپہنچی۔ ہم کیسے ریل میں سوار ہوئے اور کیسے جگہ ملی۔ خدا ہی جانے اب یہ سوال پیدا ہوا کہ جاؤں کہاں۔ پھوپھی کے پاس جانا حماقت تھا۔ میں نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم پس انداز کی تھی مگر یہ کتنے دن کفایت کرے گی۔

شہر کے ایک غیر معروف حصّہ میں ایک چھوٹا سا صاف کمرہ کرایہ پر لیا۔ اس کی مالکہ بھی ایک شریف طبیعت خاتون معلوم ہوتی تھی جب وہ ہمیں کمرہ میں لے جانے لگی تو ڈکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا "یہ بچہ تمہارا ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بیشک!" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں ڈکی نہ بول پڑے۔

"تمہاری عمر ہی کیا ہے!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی لیکن اس کی مشکوک نظریں مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ڈکی کو نرم بچھونے پر لٹا دیا اور پیار کرکے اس سے کہا "تم آرام سے سو جاؤ۔ میں ایک کام سے باہر جارہی ہوں۔ ابھی آتی ہوں"

میں جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کتنا صدمہ ہوگا اسی وجہ سے یہ چاہتی تھی کہ ڈکی کی گمشدگی کی خبر اس کے باپ کے کانوں تک پہنچنے سے قبل ہی اسے بتادوں کہ وہ میری حفاظت میں ہے۔

سامنے کی اقامت گاہ کے ٹیلیفون پر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مبادا کوئی میری گفتگو سن لے۔ قریب ہی ایک دواخانہ تھا اس کے ٹیلیفون پر گئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آلہ اُٹھایا۔ میں ڈر رہی تھی کہ اگر کوئی ملازم ٹیلیفون پر آیا تو ضرور میری آواز پہچان لے گا۔ لیکن مجبور تھی۔

مجھے معلوم تھا اور یقین تھا کہ اگر اس کے باپ کو مطلع کردوں گی تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کردے گا۔ ڈک کو اس کی ماں سے علیحدہ رکھنے کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکلے گی۔

لیکن وہ مکان پر نہ تھا۔ بہرہ میری کانپتی ہوئی آواز کو نہ پہچان سکا۔ اس نے جواب دیا کہ آج شب کو بھی مسٹر کارٹرائٹ کے واپس آنے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ غالباً وہ صبح کو آئیں گے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت ہوگا کہاں۔ اس سے مجھے اور بھی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ میں نے بہت سوچا کہ اس کو کس طرح مطلع کروں مگر صبح تک انتظار کرنے کے سوائے کیا صورت ہوسکتی تھی۔

تمام رات بے چینی سے کٹی۔ اب میں معاملے کی اہمیت کو محسوس کر رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ کسی کے بچے کو بھگا لے جانا کتنا بڑا جرم ہے اور جب یہ خیال آیا کہ اس کی پاداش میں کئی سال کی سزا بھی ممکن ہے تو میرے ہوش اُڑ گئے۔

لیکن مسز کارٹرائٹ کے الفاظ اور اس کے طرزِ عمل کا خیال کر کے مجھے اپنے کئے پر کوئی افسوس نہ رہا۔ میں نے ڈک کو اندھیرے میں اپنے سینے سے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ اب میں بخوشی سزا کاٹنے کو تیار تھی بشرطیکہ ڈک اپنی سخت گیر اور وحشی ماں کے پنجہ سے محفوظ رہ سکے . . . . ان ہی خیالات میں سو گئی۔ جب اُٹھی تو روشنی کافی پھیل چکی تھی۔ ڈکی ابھی سو رہا تھا۔ جلدی سے کپڑے پہنے اور پھر اسی دواخانے میں پہنچی۔ برآمدہ میں میز پر اخبار پڑے تھے۔ سرورق پر جلی قلم میں "ایک مالدار بچے کی چوری" لکھا ہوا دیکھ کر میری چیخ سی نکل گئی۔ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ دواخانے کے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باہر کھڑے رہنے میں بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر راہ گیر جو ادھر سے گزرتا ہے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتا جاتا ہے۔

آخر ہمت کر کے میں نے ایک پرچہ خریدا اور اسے لئے ہوئے ٹیلیفون پر پہنچی۔ ابھی نمبر ملنے میں کچھ وقفہ تھا۔ میں نے اخبار پر گھبرائی ہوئی نظریں دوڑائیں اور سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ مسز کارٹرائٹ کا بیان تھا کہ چونکہ بچہ کی نرس برطرف کر دی گئی تھی اس لئے ایذا پہنچانے کے خیال سے اسے لے کر فرار ہو گئی ہے"۔

ایذا . . . اور میں پہنچاتی۔ میں تو اس کے روئیں روئیں پر جان دیتی تھی۔

آخر گھنٹی بجی اور جب کارٹرائٹ کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی تو کسی قدر اطمینان اور سکون سا محسوس ہوا۔

میں نے مختصر الفاظ میں رات کا واقعہ سنا کر کہا کہ بچہ میری حفاظت میں ہے۔ اس کے بعد میں کچھ تفصیل سے کہنا چاہتی تھی مگر اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجہ میں تُرشی آ گئی تھی "میں سب جانتا ہوں۔ ایلس تم نے بہت اچھا کیا۔ اگر میں ہوتا تو بھی یہی کرتا۔ میں ابھی آیا ہوں۔ اپنی بیوی کے علاوہ ابھی کسی سے بات بھی نہیں کی۔ تم بالکل مت گھبراؤ۔ میں سیدھا تمہارے ہی پاس آتا ہوں"۔

ایک دم میرے آنسو نکل آئے۔ میں فوراً واپس آئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ ہم کمرہ سے باہر نہیں گئے۔ تمام اخباروں میں ڈکی کی تصویر چھپ چکی تھی۔ جس وقت میں مکان میں داخل ہوئی خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ گھر کی مالکہ برآمدہ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں۔ مگر نہایت سخت اور مشکوک نگاہوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔

(باقی آئندہ)

ناظم میرٹھی

(ماخوذ)

باغ سے کسی کی رخصت کے بعد

ابھی ابھی چند لمحے گذرے فضا پہ مستی سی چھا رہی تھی
فروغِ رنگِ بہار سے بزم گاہِ گُل جگمگا رہی تھی

ابھی تو دوشیزۂ سحر لے رہی تھی انگڑائیاں چمن میں
ابھی تو سوتے ہوئے گلوں کو نسیم شانے ہلا رہی تھی

سنور رہی تھی عروسِ گلبن اُبھار پر تھا شبابِ فطرت
نکھر رہے تھے چمن کے مہوش کلی کلی مسکرا رہی تھی

وفورِ عشرت سے نازنینانِ آب و گل کھلکھلا رہے تھے
صبا ہجومِ طرب میں غنچوں کو چھیڑ کر گدگدا رہی تھی

یہ کس نے ہنگامۂ طرب کو بدل دیا غم کی خامشی سے
ابھی تو رقاصۂ جوانی فضا میں تانیں اُڑا رہی تھی

چمن کی محفل پڑی ہے سُونی چراغِ گُل ہو گیا کلی کا
ابھی تو جوشِ طرب میں بلبل گلوں کو نغمے سنا رہی تھی

جہاں نظارہ تھا گل بداماں وہاں نظر خار چُن رہی ہے
گلوں کی رنگت اُڑی ہوئی ہے جہاں صبا رنگ اُڑا رہی تھی

ریاض عباسی

اصلاحِ ادب

(۹)

بہ سلسلۂ اشاعت نومبر ۱۹۳۳ء

میں چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہے مگر جب اس کی آٹھ قسطیں چھپ چکیں تو متعدد احباب کی طرف سے تقاضوں پر تقاضے شروع ہو گئے کہ اسے جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ میں تعمیلِ ارشاد کے لئے تدبیریں سوچنے لگا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث یہ کام معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ اب کہ طباعت و اشاعت کے متعلق ماحول کسی قدر سازگار نظر آتا ہے قطعی فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ کسی صاحب سے تبصرہ لکھوا کر اسے "نشترِ ادب" کے نام سے شائع کر دیا جائے پس یہ قسط اس سلسلے کی آخری کڑی سمجھنی چاہئے۔

اگر افکارِ زمانہ نے مہلت دی تو پھر یہ سلسلہ جاری کر دیا جائے گا انشاء اللہ تعالےٰ۔

"نشتر"

نثر

فقرہ۔ آپ کے کرتے کا آنچل کیونکر پھٹ گیا؟

اصلاح۔ آپ کے کرتے کا دامن کیونکر پھٹ گیا؟

وجہ۔ "آنچل" اوڑھنے کی اور "دامن" پہننے کی چیزوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

فقرہ۔ لڑکے تالاب میں تیر رہے ہیں۔

اصلاح۔ لڑکے تالاب میں پیر رہے ہیں۔

وجہ۔ "تیرنا" بے جان اور "پیرنا" جاندار کے لئے بولتے ہیں یہ اصلاح فصحائے لکھنؤ کے محاورے کے اعتبار سے کی گئی ہے ورنہ میری رائے میں "پیرنا" اور "تیرنا" دونوں صحیح ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ جس موقع پر جو لفظ فصیح معلوم ہو استعمال کر لینا چاہئے۔

فقرہ۔ جو شخص ان مفید اصول پر چلے گا۔ وہ کامیاب ہوگا۔

اصلاح۔ جو شخص ان مفید اصولوں پر چلے گا۔ وہ کامیاب ہوگا۔

وجہ۔ اگرچہ "اصول" "اصل" کی جمع ہے مگر یہ دونوں لفظ معنی میں مختلف ہیں۔ لہٰذا "اصول" معنی کے اعتبار سے واحد ہے اور اس کی جمع "اصولوں" آئے گی۔ اسی طرح "اخبار" کی جمع "اخبارات" آتی ہے۔

فقرہ۔ زرا آپ ہی تکلیف فرمائیے۔

اصلاح۔ ذرا آپ ہی تکلیف فرمائیے۔

وجہ۔ "ذرا" "ز" سے نہیں بلکہ "ذ" سے ہے۔ آج کل یہ وبا عام ہو رہی ہے اور اچھے اچھے ادبا و شعرا اس میں مبتلا نظر آتے ہیں مگر محققین کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ عربی میں "ذرّۃ" تھا۔ فارسی والوں نے "ذرّہ" کر لیا۔ اردو شعرا نے بھی "ذرّہ"

(ذرا) کے معنی میں) استعمال کیا۔ پھر "تشدید" اڑا کر "ہ" الف سے بدل کر "ذرا" بن گیا۔ اس میں "ز" کس طرح آسکتی ہے "ز" کو صحیح سمجھنے والوں کی یہ دلیل کہ "گزارش" کا املا "ز" سے صحیح اور "ذ" سے غلط ہے (اگرچہ اس میں بھی اختلاف ہے) کیونکہ "ذ" خاص عربی کا حرف ہے۔ یہاں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ یہاں عربی سے اُردو لفظ بنایا گیا ہے اور نہ "ذ" اُردو کا خاص حرف ہے نہ "ز"۔

فقرہ۔ اب جب کہ حالات موافق ہیں۔ آپ کو دُور اندیشی سے کام لے کر کچھ پیسہ جمع کر رکھنا چاہئے۔

اصلاح۔ اب کہ حالات موافق ہیں۔ آپ کو دُور اندیشی سے کام لے کر کچھ پیسہ جمع کر رکھنا چاہئے۔

وجہ۔ "اب جب کہ" میں "جب" زائد اور خلاف فصاحت ہے۔

فقرہ۔ اجی حضرت! آپ کا شانِ نزول کیا ہے؟

اصلاح۔ اجی حضرت! آپ کی شانِ نزول کیا ہے؟

وجہ۔ "شان" مؤنث ہے اور حرفِ اضافت کی تذکیر و تانیث "شان" کے تابع ہو گی نہ کہ "نزول" کے۔

فقرہ۔ جنابہ خالہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

اصلاح۔ جناب خالہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

وجہ۔ "جناب" کی "تانیث" "جنابہ" قواعد کے رُو سے غلط ہے کیونکہ یہ نہ اسم معرفہ یا نکرہ ہے اور نہ اسم صفت وغیرہ۔

فقرہ۔ آپ کی ہمشیر کے انتقال کا سخت افسوس ہے۔

اصلاح۔ آپ کی ہمشیرہ کے انتقال کا سخت افسوس ہے

وجہ۔ "ہمشیر" رضاعی یا حقیقی بھائی کو کہتے ہیں۔ بہن کے لئے "ہمشیرہ" صحیح ہے۔

فقرہ۔ اب طوالت کے لحاظ سے اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اصلاح۔ اب طوالت کے خوف سے اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

وجہ۔ کسی چیز کو شروع کرنے اور جاری رکھنے کے مقام پر "لحاظ" اور ختم کرنے کے محل پر "خوف" استعمال کرتے ہیں۔

نظم

شعر۔ بھیڑ باقی رہی نہ کوئی گائے ۔۔۔ اک وظیفہ تھا اس کا ہائے ہائے

غلطی۔ "ہائے" کی "ے" کو کھینچ کر استعمال کرنا غلط ہے۔

شعر۔ عاجزی کیا شے ہے ماہِ نَو سے سیکھا چاہئے
اور خودداری گُلِ خود رَو سے سیکھا چاہئے

غلطی۔ (۱) "خودرو" میں "ر" مضموم ہے نہ کہ مفتوح۔ لہٰذا اختلاف توجیہ کے باعث قافیہ غلط ہے۔

(۲) "سیکھا چاہئے"۔ "دیکھا چاہئے" وغیرہ متروک ہیں۔

(۳) پہلے مصرع میں ایک جگہ اور دوسرے میں دو جگہ تنافر ہے۔

شعر۔ روتے روتے جو نیند آتی تھی ۔۔۔ بے حیائی اسے ہنساتی تھی

غلطی۔ "بہائی" کی جگہ "بے حیائی" استعمال کرنا صحیح نہیں۔

ابو نعیم نشتر جالندھری

محفلِ ادب

اظہارِ محبّت

خبردار، محبت کا کبھی اظہار نہ کرنا،
محبت ایسی چیز نہیں کہ اس کا اظہار کیا جائے۔
محبت تو نسیم صبح کی طرح ہوتی ہے،
اس کی نہ صورت کہیں دکھائی دیتی ہے۔ نہ آواز سنائی دیتی ہے۔

اس پاک باغ میں اس پیڑ کے نیچے،
ہم دونو اکیلے بیٹھا کرتے تھے۔
بہت دنوں تک اکیلے بیٹھتے رہے۔ کوئی نہیں دیکھنے والا نہ تھا۔

میرا راز میرے سینے میں بند تھا۔ کسی کو اس کی ذرا خبر نہ تھی۔

میں بہت ہچکچاتا رہا۔ جھجکتا رہا۔
شرم میری زبان پکڑتی اور آنکھیں جھکا دیتی تھی۔

میری آواز لرزتی اور جسم کانپتا تھا،
آخر کار میرا ارادہ غالب آگیا،
محبت کا پیغام میں نے اسے امانت کے ساتھ پہنچا دیا۔

مارے جوش کے میں کھڑا ہو گیا۔
اُس کے ہونٹوں پر میری نگاہیں گڑ گئیں،
میں جواب کا منتظر تھا،
اُس کے پاس سکوت تھا۔

ایک مسافر اُدھر سے گزرا،
تیز و طرار، نڈر اور بے باک،
محبوبہ نے مسافر کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈال دیا،
تحقیر سے مجھے دیکھ کر مسکرائی اور مسافر کے ساتھ چلی گئی۔

(ریاست)

مملکت کی ابتدا کے متعلق ژاں بودیں کا نظریہ

ارسطو کا خیال تھا انسان جبلتاً وفطرتاً معاشرہ پسند ہے اور روسو نے معاشرہ کی ابتدا "معاہدہ" (Contract) قرار دی تھی لیکن بودیں نے ان دونوں نظریوں کے بین بین ایک اور راہ اختیار کر لی۔ اس کے نزدیک خود معاشرہ کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ایک فرد دوسرے کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل کرے اس اصول کے تحت فطرت نے فرد کو جو کلّی آزادی دی ہے وہ غائب ہو جاتی ہے اور سوائے خدا کے اور کسی کی فطری آزادی برقرار نہیں رہتی۔ بودیں اپنے اس نظریہ کی ابتدا اس طرح کرتا ہے کہ فطری آزادی کا مطمح نظر اور اصل موضوعی (Subjective) حیثیت رکھتا ہے نہ کہ معروضی (Objective) اس کا تصور انسانی ذہن کر سکتا ہے لیکن اس کی عملی مثال تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اسی سلسلے میں وہ اقتدار پر جو معاشرہ کا ایک اہم عنصر ہے بحث کرتا ہے اور خاندان سے ابتدا کر کے پدرارک کے احکام اور قانونِ روما کے مطابق اس مبحث کو علمی و تاریخی نوعیت دے دیتا ہے اس دور سے قبل کی حالت پر وہ بحث نہیں کرتا اسلئے کہ وہ اس دور کو انسانی زندگی سے خارج متصور کرتا ہے اس کے نزدیک انسان معاشرہ کی وجہ سے انسان کہلانے کا مستحق ہے اور اس سے پہلے کی حالت پر جبکہ اُس میں جذبات، احساسات اور خاندانی خصوصیات کا پتہ نہ تھا لفظ "انسان" منطبق نہیں ہو سکتا۔ خاندان اس کے نزدیک "وہ مجموعۂ افراد ہے جو ایک پدر کے ماتحت ہو اور اس میں بیوی بچوں پر اطاعت پدر لازمی ہو"۔ انسان اپنے ابتدائی دور میں بھی مطیع نظر آتا ہے لیکن فطری آزادی کا اس میں پتہ نہیں یہی چیز معاشرہ اور مملکت میں آئندہ چل کر خاص اہمیت حاصل کر لے گی۔

بودیں کے نزدیک تحکم و اطاعت انسانی زندگی کے قدیم ترین عناصر ہیں۔ اس کی بدولت انسان فطرت کی چیرہ دستی سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ نیز چونکہ عملی زندگی میں اس سے آسانی ہوتی تھی اس لئے یہ انسانی جبلت میں داخل ہو گیا کہ وہ اجتماعی زندگی میں تحکم و اطاعت پر کاربند رہے۔ خاندان کا وجود اسی تحکم و اطاعت کی بنا پر ہوا تھا اور پھر خاندان سے قبیلہ اور اس میں اتحاد و یکجہتی پیدا ہو گئی۔ ابتدائی انسان فطرت سے ڈرتا تھا جب خاندانوں کا وجود عمل میں آیا تو اُن کو آپس کی چیرہ دستیوں سے خوف تھا۔ اس لئے قبیلہ وجود میں آیا اور اس کے نظام کو تقدس حاصل ہو گیا یہی قانون کی بنا ہوئی۔

بودیں نے ہئیت اجتماعی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں مختلف خاندان اور قبائل چشموں کے کنارے پہاڑوں کے دامنوں میں جنگلوں بیابانوں میں گھومتے پھرتے تھے اور اس وقت تک ان میں ملک کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور وہ زرخیز زمینوں پر قابض ہونے لگے تو ان میں ملک کا تصور پیدا ہو گیا۔ قدیم انسان لوٹ مار کیا کرتا تھا۔ اس کی مثال وہ قدیم یونانیوں سے دیتا ہے جن کے ہاں سرقہ اور لوٹ مار ایک معمولی چیز تھی۔ دراصل یکجہتی و اتحاد کا خیال جو اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے اور سول زندگی کی اہمیت خاندان سے پیدا ہوئی۔ سیاسی ہئیت اجتماعی سے قبل لین دین، تجارت اور عبادت کی جاتی تھی اور انہی سے انسان مجبور ہوا کہ اجتماعی زندگی اختیار کرے۔

بودیں کے نزدیک مملکت کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب مختلف قبائل نے زرخیز علاقوں کے حصول کے لئے لڑنا شروع کیا اور اُن میں ملک کا ایک دھندلا سا تصور پیدا ہوگیا۔ جس وقت ایک قبیلے نے دوسرے کو شکست دینی شروع کی تو پھر فاتح اور مفتوح کا فرق رُونما ہونے لگا اور پھر مفتوح، فاتح کا اقتدار تسلیم کرنے لگے۔ خود فاتح فریق اپنا ایک لیڈر مقرر کرتا تھا چنانچہ مملکت کی تشکیل کا راز "قوت میں مضمر" تھا۔ اس سیاسی تحکم اور اطاعت کے ساتھ مختلف ادارے قائم ہوئے جن کی یادگار غلامی کا ادارہ اب تک بھی موجود ہے۔

ارسطو اور ہیروڈوٹس کے اس خیال کی بودیں تردید کرتا ہے کہ بادشاہ نیک کرداری کی وجہ سے منتخب کئے جاتے تھے اور جو شخص اپنی مرضی کا سکہ دوسروں پر بٹھا سکتا تھا وہی بادشاہ بنایا جاتا تھا۔ نیک کرداری بجائے خود اچھی چیز ہے لیکن مملکت کا آغاز اس سے وابستہ کرنا یا سنہری زمانے کے تخیل کو پیش کرنا بودیں کے نزدیک حقیقت نہیں کیونکہ تاریخ ایسے زمانہ کا ثبوت دینے سے قاصر ہے۔

مملکت اپنے ماتحت اداروں میں (جن میں خاندان بھی شامل ہیں) تحکم کی بدولت یکجہتی قائم رکھتی ہے۔ خاندان کے افراد کی تعداد اُس کے نزدیک محض ضمنی چیز ہے، آدمیوں کی تعداد سے (یعنی کمی یا زیادتی سے) مملکت پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ مملکت کا راز دراصل قوت و تحکم پر مبنی ہے نہ کہ تعداد پر" خاندان بغیر مملکت کے ممکن ہے لیکن بغیر خاندان کے مملکت کا وجود ناممکن ہے"۔ کامل شہری اُس کے نزدیک وہ ہے جو "آزاد ہو اور دوسرے کے اقتدار کو تسلیم کرتا ہو" چونکہ غلام آزاد نہیں ہوتے اس لئے وہ شہری نہیں کہلا سکتے۔

آبادی کی اس نے دو قسمیں کی ہیں ایک شہری اور دوسرے صاحب اختیار، ان دونوں کی مفاہمت سے مملکت کا کاروبار چلتا ہے۔ شہریوں کے درمیان مطلق مساوات ناممکن ہے اور اُن میں مساوات قائم کرنے کی کوشش محض فضول ہے۔ کیونکہ فرق مراتب کو اگر کوئی طبقہ مٹا بھی دے تو پھر وہی طبقہ اعلےٰ مراتب حاصل کرلے گا اور مملکت کے کاروبار میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ امرا کا وجود مملکت کے لئے لازمی ہے۔ بودیں صنف نازک کا شمار شہریوں میں کرتا ہے، لیکن ان کو سیاسی کاروبار کا نا اہل ٹھیرا کر محض گھریلو زندگی کا انتظام کرنے والے ظاہر کرتا ہے جو بالواسطہ مملکت کی امداد کرتے ہیں۔

بودیں کا رجحان چونکہ قومی مملکت کی طرف تھا اس لئے وہ کہتا ہے کہ "مملکت کے قیام کے لئے سب کی مادری زبان کا یکساں ہونا یا ایک ہی مذہب کا پیرو ہونا ضروری نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر زبان و مذہب کی یکسانی کسی مملکت میں ہو تو انتظام اور کاروبار سلطنت میں اس سے آسانی ہوتی ہے"۔ "جمہوریت ایسے ممالک پر مشتمل ہو سکتی ہے جن کے رسوم و رواج، طور طریق، زبان و نسل اور ادارے آپس میں مختلف ہوں لیکن اگر ان میں مملکت کا واحد قانون رائج ہو تو سیاسی اغراض کے لئے ان سب میں یکسانی پیدا ہو جائے گی۔

"مجلہ عثمانیہ"

جلد ۲۶ — نمبر ۶

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۴ء

تصویر:- سوچ بچار

چندہ سالانہ ۶؏ ششماہی ۳؏ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸؍

بزمِ ہمایوں

یہ اس سال کا آخری پرچہ ہے آئندہ پرچہ "ہمایوں" کا تیرہواں سالگرہ نمبر ہوگا۔ ہمایوں کے معیار کو قائم رکھنے اور اسے بیش از پیش مفید اور دلچسپ بنانے کیلئے جو کوشش ہم کرتے رہے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ معاصرین اہلِ قلم اور قارئین "ہمایوں" نے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ سال ہم "ہمایوں" کو اور بھی زیادہ دلکش بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے علاوہ گزشتہ سال ہم نے ایک زاہد افسانہ نمبر شائع کیا تھا۔ مستقبل قریب میں ہمارا ارادہ ہے کہ "ہمایوں" کا ایک صحافت نمبر شائع کریں جس میں ہندوستانی صحافت کے آغاز کی دلچسپ اور پراز معلومات تاریخ ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس موضوع پر ایسا محققانہ مضمون آج تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے سالگرہ نمبر کی مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ **یہ چالباز زمانہ**:۔ جدید مغربی تحریکات کے متعلق ایک دلچسپ اور پراز معلومات مضمون۔ از میاں بشیر احمد صاحب

۲۔ **بھوسٹر بیوی کی اکاون لاکھ علامتیں**۔ ہمایوں کے مقالہ نگار خصوصی حضرتِ فلک پیما کا ایک بے مثال مزاحیہ مضمون۔

۳۔ **افسانہ اور حقیقت نگاری**۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ڈی کا بلند پایہ نقادانہ مقالہ۔

۴۔ **صندل پور کے برہمن**۔ جناب مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک انوکھا محققانہ اور پراز معلومات دلچسپ مضمون۔

۵۔ **جمالیات**۔ علامہ کیفی دہلوی کا بصیرت افروز اور دلچسپ فلسفیانہ مضمون۔

۶۔ **از کجاست تا بہ کجا**۔ ایک بلند پایہ مزاحیہ افسانہ جو اردو کے مشہور ادیب خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے کمشنر انبالہ نے خاص طور پر اس نمبر کے لئے لکھا ہے۔

۷۔ دوسرے افسانوں میں پروفیسر حمید احمد خاں ایم۔ اے کا ایک طبعزاد حکیمانہ اور دلچسپ افسانہ ہوگا ایک دلچسپ افسانہ حامد علی خان اسسٹنٹ ایڈیٹر ہمایوں کا بھی ہوگا

اس کے علاوہ دلدادہ چھوٹے چھوٹے مضامین دلکش نظمیں اور خوبصورت سہ رنگ و یک رنگ تصاویر اس پرچہ کی زینت ہوں گی۔

جہاں نما کے زیرِ عنوان گزشتہ سال کے تمام واقعات پر ایک مبسوط تبصرہ ہوگا اس پرچے کی دوسری خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں "ہمایوں" دوسرے معاصرین کی روش کے خلاف اپنے خاص نمبروں کی الگ قیمت نہیں لیتا۔ ہر خریدار کو سالگرہ نمبر اور دوسرے خاص نمبر سالانہ چندہ ہی میں مل جاتے ہیں خلافِ معمول یہ پرچہ بھی ۷۲ کے بجائے ۸۰ صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ خریدار نہ صرف خود آئندہ سال خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں گے بلکہ اپنے احباب میں سے بھی نئے خریدار پیدا کرکے ہمایوں کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

جہاں نما

سائنس اور جنگ

برٹش ایسوسی ایشن (ایبرڈین) کے تین ہزار اراکین کے سامنے سر جیمز جینز نے اپنی صدارتی تقریر میں ان لوگوں کے خیال کی شدید طور پر تردید کی جو یہ کہتے ہیں کہ سائنس نے دنیا کو فائدے کے بجائے نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔

انہوں نے کہا یہ ظاہر ہے کہ جو ملک سائنس سے اپنا تعلق منقطع کرلے گا۔ وہ ہر اعتبار سے بالکل پسماندہ رہ جائیگا۔ بعض جدید ایجادات نے اگر لوگوں کو بے روزگار کیا ہے تو اس کے مقابلے میں بے شمار ایسی ایجادات بھی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کے لئے نئے روزگار کی شکل نکل آئی ہے۔

جو لوگ ایسی صورتِ حال کی تمنا رکھتے ہیں جس میں ہر قسم کی مشینوں کا فقدان ہو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسی دنیا میں آباد ہیں جہاں انہیں ترقی یافتہ تجارتی طریقوں کا مقابلہ کرنا ہے اور جدید اسلحہ کے ہلاکت بار حملوں سے اپنی حفاظت بھی کرنی ہے۔

اگر سائنس نے جنگ کے ہتھیاروں کو خوفناک بنادیا ہے تو اس نے حفاظت کے لئے بھی ہشیار ایجادات بہم پہنچادی ہیں۔ حملے اور اس سے حفاظت کے لئے جو کوششیں کی جاتی ہیں سائنس نے ان میں کسی طرح بھی جانبداری سے کام نہیں لیا۔

اس صورت میں یہ خیال درست نہیں کہ آئندہ جنگیں زیادہ متواتر اور زیادہ مسلسل ہوں گی۔ یہ ضروری نہیں کہ آئندہ جنگ ضرور زیادہ ہلاکت خیز ہی ہو۔ البتہ جنگ کا امکان معدوم نہیں ہوا۔

سائنس نے انسان کو اس سے قبل کہ وہ اپنے آپ پر اختیار حاصل کرتا قدرت پر اختیار دے دیا ہے۔

سائنس انسان کو پشت بہ پشت وراثت میں مل رہا ہے لیکن حاصل کردہ عادات و خصوصیات اس طرح ایک دوسرے کو منتقل نہیں ہوتیں۔ اس طرح گویا علم کے لحاظ سے ایک پشت دوسری کے برابر ضرور ہوتی ہے لیکن دوسری چیزوں میں نہیں ہوتی۔ یہ تلخ حقائق ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں اور جن کے پیشِ نظر ہمیں یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تہذیب کے لئے ایک خطرہ ہے۔

نباتات پر کلوروفارم کا اثر

ڈاکٹر بوس نے نباتات کے متعلق جو حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ حال میں انہوں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ درخت کلوروفارم کے اثر سے عارضی طور پر بیہوش کئے جاسکتے ہیں۔

عام طور پر معلوم ہے کہ زیادہ بڑے درخت ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ نہیں لگائے جاسکتے اور اگر ایسا کیا جائے تو وہ بہت جلد سوکھ جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بڑے درختوں کی جڑیں ضرور کٹ جاتی ہیں اور اگر جڑوں کا کچھ حصہ کٹ جائے تو اکثر درخت سوکھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر بوس نے ثابت کیا ہے کہ محض چند جڑوں کا کٹ جانا ہی درخت کے سوکھنے کا باعث نہیں ہوتا بلکہ جڑوں کے کٹنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ درخت کو اکھاڑ کر پہنچانے میں جو صدمہ درخت کو پہنچتا ہے وہ اس کے لئے ذہنی طور پر اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

اپنے اس دعوےٰ کو ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر بوس نے بعض بڑے بڑے درختوں کو کلوروفارم کے عمل سے بیہوش کیا اور اس کے بعد انہیں ایک جگہ سے اکھڑوا کر دوسری جگہ لگا دیا۔ بیہوشی کی حالت میں درخت صدمے کی اس شدت سے محفوظ رہے جو اُن کے لئے جانکاہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ درخت دوسری جگہ دوبارہ پنپنے لگے۔

ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کے بعد بعض ایسے درخت بھی ابتدا میں مرجھا جاتے ہیں جو بعد میں پھر سرسبز ہو جاتے ہیں۔ ان درختوں کو بھی صدمہ تو ہوتا ہے لیکن سخت جانی کی وجہ سے وہ اسے برداشت کرلیتے ہیں اور اپنے نئے ماحول میں دوبارہ خوش ہو جاتے ہیں۔

موجودہ چینی مصوری

ڈگنی کارٹر نے جو ناروے کی ایک نامور خاتون ہے دنیا کے مختلف ممالک کی مصوری کا مطالعہ کیا ہے چینی مصوری کے متعلق اس کا ایک مضمون جو "ایشیا" میں شائع ہوا ہے اہل ذوق کے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوگا۔

چین کے پاس عہد قدیم سے مصوری کا ایک حیرت انگیز خزانہ موجود ہے لیکن اب کئی صدیوں سے وہاں کی مصوری کو ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری پر قدیم روایات اور ایسے لوگوں کی آراء کا قبضہ ہوگیا ہے جو خود اعلیٰ درجے کے فن کار نہیں بلکہ مطالعہ وغیرہ سے نقاد بن گئے ہیں چینی مصوری کے انحطاط کے اس پانچ صد سالہ دور میں کبھی کبھی تائی چن اور ٹنگ ین جیسے اعلیٰ درجے کے مصور نظر آتے رہے جنہوں نے اپنی اپج سے صحیح مصوری کے نمونے پیش کئے اور قدامت پرستی کی قیود

کو توڑ ڈالا۔ واشنگٹن کی فریئر گیلری میں ٹائی چن کی تصویر "بادخزاں اور اٹھتی ہوئی موجیں" فن کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ تصویر فن کتابت سے قریبی تعلق رکھنے کے باوجود زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ہے اور بہت معنی خیز ہے۔ گزشتہ تین سو سال سے چینی مصوری اہل فن کی نظروں سے اس لئے بھی گر گئی کہ مصوری کے ایسے نمونے پیش پیش ہوگئے جو نااہل لیکن بلند شخصیت کے مصوروں نے امراء کو ہدیۃً بھیجے تھے۔ ان کی قدر فن کے لحاظ سے نہ ہوتی تھی بلکہ ہدیہ دینے والے اور قبول کرنے والے کے معاشرتی درجے اور اس کی امارت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اگر ایسی تصویریں ضائع کردی جائیں تو باقی یقیناً ایک قابلِ قدر ذخیرہ رہ جاتا۔

چین میں آج کل ایسے نقادوں کی ضرورت ہے جو حقیقی مصوروں اور ان لوگوں کے درمیان امتیاز کرسکیں جنہوں نے مصوری محض شغل یا تفریح کے لئے اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ چینی مصوروں کو قدیم مصوری کی رسمیں توڑنے کے لئے مغرب سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین مغرب کی تقلید میں اپنی مصوری کی خصوصیات کو کھو بیٹھے۔

لڑکیوں کے لئے اخلاقی معیار

رابندر ناتھ ٹیگور کے نصائح

ٹیگور نے اپنی ایک تقریر میں لڑکیوں کے لئے اخلاق و آداب کا معیار قائم کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:۔

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لڑکیوں کو آپس میں اور دوسروں کے ساتھ نہایت خلیقانہ برتاؤ کرنا چاہیئے۔ خلافِ آداب طرزِ عمل ہر صورت میں قابلِ ملامت ہے۔ لیکن لڑکیوں کی صورت میں تو یہ ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔

تحریر، تقریر اور اظہارِ جذبات میں اعتدال کے اصول پر قائم رہنا اچھے اخلاق کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شور و غوغا مچانا اور آپے سے باہر ہونا زندگی یا زندہ دلی کا ثبوت نہیں۔ اچھے آداب اچھی فطرت سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور سلیم الفطرت لوگ دوسروں کی رضاجوئی اور ان کے صحیح حقوق کے احترام کی خاطر خود تکلیف بھی برداشت کر لیتے ہیں۔

جب کوئی ہمسایہ مطالعہ میں مصروف ہو شور مچانا اور کسی کو سونے کے وقت سونے سے روکنا یا کسی کے کمرے میں بلا اجازت داخل ہو جانا اور اس کی چیزیں خراب کرنا۔ اور اس کے کاغذوں اور خطوں پر متجسس نگاہیں ڈالنا۔ اور اس کی کتابیں یا دوسری قابلِ استعمال اشیاء لے جانا یہ سب باتیں خلافِ آداب ہیں۔

کسی کو بدنام کرنے کے لئے افواہیں پھیلانا۔ یا ان سے لطف اٹھانے کی نفرت انگیز عادت ہماری سیرت میں ایک ایسا عیب

پیدا کر دیتی ہے جس سے انسان کی فطرت بالکل پاک ہونی چاہئے۔

صفائی اور باقاعدگی ہر حال میں ملحوظ رکھنی چاہئے بعض لوگ نمایش اور تصنع کے خلاف احتجاج کے طور پر پھوہڑ پن کے عادی ہونے لگتے ہیں لیکن لباس کی صفائی اور باقاعدگی اور چیز ہے۔ اور خود نمائی اور پھوہڑ پن اور چیز ہے۔ لباس کی دلکشی اعلیٰ درجے کی جمالیاتی حس اور سادگی کی خوبصورت روح کا ثبوت بھی ہوسکتی ہے۔ لباس کو محض دکھاوا ہی نہ سمجھنا چاہیئے یہ دوسروں کی تعظیم کی ایک علامت بھی ہے اگر ہم دوسروں کے سامنے اپنے لباس کے معاملے میں بے پروائی برتیں تو گویا ہم نہایت کج خلقی سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں اُن کی مطلق پروا نہیں"۔

(A. J. Pallhall. Bidechar) B.A.

شوہروں کے لئے ایک سبق

مادام گگنے کو جو پچیس سال کی ایک خوبصورت فرانسیسی عورت ہے شوہر کے قتل کے جرم میں دو سال قید کی سزا ہوئی اور یہ سزا بھی پہلے جرم کی قانونی رعایت سے منسوخ ہوگئی ہے۔ شوہر کا جرم یہ تھا کہ وہ رات کے کھانے کے لئے گھر پر نہ آیا تھا استغاثہ کا بیان ہے کہ قتل کی رات مادام گگنے بہت دیر تک کھانے پر اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کھانا بالکل خراب ہوگیا۔ لیکن شوہر پھر بھی نہ آیا۔ اس پر مادام گگنے سخت غضب آلود ہو کر اس کی تلاش میں نکلی۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شراب پینے میں مصروف تھا۔ عورت نے پستول نکالا اور شوہر کا خاتمہ کر دیا۔

تصویر

سوچ بچار

یہ فرانس کے حیرت کارسنگتراش روداں کا بہترین اور خوبصورت ترین کارنامہ ہے۔ بعض نقادوں کو جو روداں کی فنی تخلیق کو بدصورت قرار دیتے تھے۔ روداں نے یہ غیر فانی جواب دیا کہ

"کوئی زندہ چیز بدصورت نہیں"

نازی جرمنی

موجودہ جرمن قوم ایک ایسے دورِ حیات سے گزر رہی ہے، جو اس کے لئے نہایت اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ اگر وہاں کے تمام لوگ اپنے آپ کو ایک متحدہ قومیت میں جذب کریں۔ انتشار و پراگندگی کے وہ تمام عناصر جو اسے آج کل خانہ جنگی اور اندرونی مناقشات کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ جلد از جلد قومی مفاد اور ملک کی حفاظت و بقا کے لئے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے جائیں تو جرمن قوم کے سامنے پھر ایک باوقار اور عظیم الشان مطمحِ حیات ہوگا۔ ورنہ اس کی موجودہ حالت اس کو ایک غیر قابلِ اعتنا چھوٹی سی ریاست میں منتقل کر دے گی ——— جب سے ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا ہے اخبارات میں ہر روز نہایت خوفناک خبریں نکلتی رہتی ہیں۔ کبھی فرانس اور جرمنی کانفرنسِ تحدیدِ اسلحہ میں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیاں کرتے ہیں۔ کبھی جرمنی آسٹریا کو اپنے زیرِ سایہ لانے کی "غیر آئینی" طور پر کوشش کرتا ہے۔ کبھی جرمنی اور اٹلی برسرِ پرخاش نظر آتے ہیں۔ الغرض کوئی نہ کوئی جھگڑا ہر روز اس نئی طاقت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کیا واقعی دنیا کی سلامتی اور امنیت، ہٹلر کے ہاتھوں میں ہے؟ اس پر سطورِ ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے:—

جنگِ عظیم کے تخریبی اور تباہ کن اثرات میں جرمنی کی تعمیرِ نو کے اسباب مضمر ہیں۔ جرمنوں کے بڑھتے ہوئے احساسِ قومیت کا پیدا کرنے والا ہٹلر ہے۔ جس کی تمام پالیسی یا حکمتِ عملی معاہدۂ ورسائی کی ذلت آگیں شرائط پر مبنی ہے۔ لہٰذا اسے سمجھنے کے لئے اس اہم دستاویز کا مطالعہ ضروری ہے ———

۱۹۱۴ء کی جنگ اپنے ویراں ساز نتائج کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس وقت کی بگڑی ہوئی حالت اب تک درست نہیں ہوئی۔ موجودہ معاشی و سیاسی مشکلات سب اسی جنگ کے ناگزیر نتائج میں سے ہیں۔ جب یہ شعلے بھڑکنے لگے تو یورپ بلکہ تمام دنیا ان کی زد میں آگئی۔ ایک طرف جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی اور ہنگری تھے۔ اور دوسری طرف فرانس، بلجیم، اٹلی، انگلستان مع نو آبادیات، امریکہ، روس وغیرہ وغیرہ۔ الغرض جنگ ختم ہوئی اور فتح کا سہرا اتحادیوں کے سر رہا اور وہ مغلوب دشمنوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے بیٹھ گئے۔ یہاں چونکہ ہمیں صرف معاہدۂ ورسائی سے تعلق ہے۔ لہٰذا صرف اسی کا تذکرہ کریں گے۔ یہ معاہدہ جون ۱۹۱۹ء میں قرار پایا اور اس کی رو سے اتحادیوں نے ہر قسم کی قیود اور بندشیں اپنے حریف جرمنی پر عائد کر دیں۔ شکست خوردہ جرمنی کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ ہار چکا تھا۔ اس میں مدافعت کی تاب بھی نہ تھی۔ ملک میں

عجب بدنظمی، انتشار اور بدگمانی سی پھیل گئی تھی، چنانچہ جرمنوں نے آنکھیں بند کر کے اس دستاویز پر مہر تصدیق ثبت کر دی — سب کچھ جا چکا تھا، مگر ابھی "احساسِ زیاں" باقی تھا، اپنی ذلت اور پستی سے ہرگز مطمئن نہ تھے۔ اس لئے اب انہوں نے ۱۹۱۹ء کے پرزۂ کاغذ کی دھجیاں اڑانے کے لئے اعلان کر دیا۔ عہد نامہ کی تین شرائط ایسی ہیں۔ جن سے جرمن قوم کو زبردست اختلاف ہے

۱۔ عہد نامہ کی رُو سے جرمن قوم کو اقرار کرنا پڑا کہ جنگِ عظیم کی تمام ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا انہیں تاوانِ جنگ کی کثیر رقمیں اتحادیوں کو دینی پڑیں۔

۲۔ آئندہ امن حفاظت کی ضمانت کے طور پر ان کی فوج وغیرہ محدود کر دی گئی۔ وہ ایک لاکھ سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چھ جنگی جہاز، چھ کروزر (cruisers) اور بارہ تباہ کن جہاز رکھنے کا حق دیا گیا۔ اور ہوائی طاقت کے قیام کی سخت ممانعت کی گئی۔

۳۔ یہ الزام دے کر کہ جرمن گورنمنٹ نوآبادیات کے انتظام میں کوتاہی کرتی ہے۔ ان سے بہت سے علاقے چھین لئے گئے۔ ان تمام ضبط شدہ علاقوں کا رقبہ تقریباً ۶۰۰۰،۰۰۰ مربع میل ہے —

مندرجہ بالا شرائط اگر بہ نظر انصاف دیکھی جائیں تو نہایت کڑی اور جابرانہ ہیں۔ مثلاً سب سے پہلی شرط تاوانِ جنگ کی ہے، یہ رقم ۶۶،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تھی۔ ایک ایسے ملک سے جو شکست کھا چکا ہو۔ اور جس کے پاس خود اس کی بھوکی قوم کے کھانے کیلئے کچھ نہ ہو۔ جہاں ایک حکومت کا تختہ الٹ چکا اور جو اپنی زندگی بالکل نئے آئین و قوانین کے تحت شروع کر رہی ہو۔ جہاں بدنظمی قحط۔ بھوک اپنا سکہ جمائے ہوں اور سب سے زیادہ یہ کہ جس کی نوآبادیات بھی چھین لی گئی ہوں۔ اس سے اتنی کثیر رقم تو کیا ایک لاکھ پونڈ بھی ادا نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہ یورپ کے تدبر کی نہایت مضحکہ خیز مثال ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ فرانس اور بلجیم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا، ان کے ہاں بے کاروں کی تعداد بڑھی، زخمی سپاہیوں اور بیوہ عورتوں کے لئے وظائف کی ضرورت تھی۔ عمارات منہدم ہوئیں۔ قابلِ کاشت زمین ہمیشہ کے لئے بنجر بنا دی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا نوآبادیاں چھین کر اور اس کو فوجی حیثیت سے بالکل بے دست و پا اور مفلوج کر کے اس غم و غصہ کی تسکین نہ ہو سکتی تھی اور اگر پھر بھی جذباتِ انتقام تاوانِ جنگ ہی پر مصر تھے۔ تو کیا اتنی ہی کثیر رقم کا مطالبہ قرینِ قیاس تھا۔

یہ ہیں وہ خیالات جو ہر جرمن کے دماغ میں معاہدۂ ورسائی کا خیال کرتے ہی جوش و غضب کا ایک ہیجان برپا کر دیتے ہیں۔

دراصل اتحادی بھی آپس میں اُن جنگی قرضوں کی وجہ سے جھگڑے ہوئے تھے۔ امریکہ سب سے بڑا قرضخواہ تھا۔ انگلستان کو فرانس۔ اٹلی، زیکوسلاویہ، یونان، رومانیا اور پرتگال سے قرضہ لینا تھا: برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی امریکہ کے مقروض تھے۔ اس لئے

ان سب کی یہ خواہش تھی۔ کہ کچھ ایسا انتظام ہو جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پہلے تو نوآبادیات کے حصے بخرے کر لئے کہ وہ مستقل آمدنی کی صورت بنیں اور پھر قرضے اتارنے کے لئے اتنی بڑی رقم تاوان جنگ قرار دی گئی۔ کہ اس کی ادائی بس وہم و خیال ہی کر سکتا ہے ——— بہرحال جرمنی نے نہایت دیانتداری اور محنت سے اس بار گراں سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہی مگر چونکہ تمام ملکوں پر جنگ کا نہایت مہلک اثر پڑا تھا۔ اس لئے ہر ایک کو اپنی ہی خوشحالی کی فکر تھی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کو فروغ ہو اور اسی کے ملک میں تمام دنیا کا سونا اکٹھا ہو جائے۔ اس کے لیے پرانی "غیر مداخلت" کی (LAISSE FAIRE) پالیسی رد کر دی گئی اور محصولِ درآمد و برآمد کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ سب نے اپنے ملک کی صنعت و تجارت کی استواری کے لئے غیر ملکی مال پر محصول لگانے شروع کر دیئے۔ اب صورتِ حالات نہایت پُرخطر ہو گئی۔ مال فروخت کرنے کے لئے سب تیار ہیں۔ مگر خریدتا کوئی نہیں۔ چنانچہ بین الاقوامی تجارت بالکل سرد پڑ گئی۔ ہر ایک ملک میں بے کاری بڑھنے لگی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور کئی ایک ملکوں میں انقلاب کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں ——— جرمنی کو بھی ان ناموافق حالات سے مفر نہ تھا۔ اس کا مال بھی اسی طرح بے کار جانے لگا۔ اقتصادی بدحالی نے شکستہ ملک کی جڑیں اور بھی کھوکھلی کر دیں۔ اس نے مجبوراً تاوانِ جنگ دینا بند کر دیا اب کیا تھا۔ تمام یورپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ قرضخواہوں نے تقاضے شروع کر دیئے اور روپے کی پکار پڑنے لگی۔ معیارِ طلا (GOLD STANDARD) پہلے ہی گر چکا تھا۔ اب اس کے سنبھلنے کی بھی امید جاتی رہی۔ اس طرح سے موجودہ کساد بازاری روز بروز ترقی پر ہے۔ چنانچہ جرمنی میں بھی ۱۹۳۰ء کی نازک حالت کے بعد ایک انقلابی تحریک نے زور پکڑنا شروع کیا۔ یہ قومی اشتراکیت (NATIONAL SOCIALISM) کا دورِ حکومت ہے اور اس کا بانی اڈالف ہٹلر ہے۔ اوّل تو وہ اس سے منکر ہیں کہ جنگِ عظیم کی تمامتر ذمہ داری جرمنی پر عائد ہوتی ہے اور اس میں وہ قدرے حق بجانب بھی ہیں۔ تاہم قطع نظر اس کے کہ جنگ کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اثرات بد کے ذمہ دار کون ہیں۔ واقعات کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اگر تاوانِ جنگ کی یہ کڑی شرطیں پیش نہ کی جاتیں۔ تو یقیناً دنیا اس عالمگیر اقتصادی بدحالی میں مبتلا نہ ہوتی جرمنی ۱۹۳۲ء تک (یعنی لوزان کانفرنس تک) ۶۲۵,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ تاوانِ جنگ ادا کر چکا ہے اور اس میں سے ۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ فرانس کے حصے میں آئے اور باقی دوسری اتحادی جماعتوں میں تقسیم ہوئے۔ مگر چونکہ انہیں بھی امریکہ کا قرض دینا تھا۔ اس لئے باقی تمام رقم یعنی ۵۲۵,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ امریکہ کے خزانہ میں داخل ہو گیا ہے ——— اب ایک طرف تو دنیا کا سونا فرانس اور امریکہ کے خزانوں میں بند پڑا ہے اور دوسری جانب قرضوں کی ادائی کے لئے تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ سنکر سخت تعجب ہو گا۔ کہ جرمنی نے جو کروڑوں پونڈ اتحادیوں کو ادا کئے ہیں (اور جن میں فرانس اور امریکہ ہی حصہ دار ٹھہرے ہیں) جرمنی کی اپنی پیدا کردہ دولت نہیں ہے: بلکہ یہ بھی اس نے امریکہ اور انگلستان ہی سے قرض لیا ہے۔ یہ ایسی مثال

ہے کہ ایک شخص آج زید سے ایک روپیہ اُدھار لیتا ہے۔ کل جب زید کے تقاضے شروع ہوتے ہیں تو وہ بکر سے ۱½ روپیہ قرض لے کر ایک زید کو دے دیتا ہے اور باقی سے اپنا خرچ نکالتا ہے۔ اسی طرح جب بکر مطالبہ کرتا ہے تو عمرو سے لے لیتا ہے اور جب عمر ادائی قرضہ پر زور دیتا ہے تو پھر زید اور بکر سے طالبِ امداد ہوتا ہے ——— آپ دیکھتے ہیں کہ حالات کی یہ روش کتنی تمسخر انگیز ہے۔ آخر جرمنی ان حالات میں کیا کرے۔ چنانچہ اس نے وہی کیا۔ جو روس نے کیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اب تاوانِ جنگ ادا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے وہ قرضے بھی جو بعد میں انہوں نے تاوانِ جنگ کو ہلکا کرنے کے لئے اٹھائے تھے۔ معرضِ خطر میں پڑ گئے۔ اب ۱۹۳۲ء میں لوزان کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ تاوانِ جنگ ختم ہو جانا چاہیئے اور اتحادیوں کے آپس کے قرضے بھی باہمی سمجھوتے سے جلد از جلد طے ہونے چاہئیں۔ تاکہ دنیا کو آرام کا سانس نصیب ہو ———،

جرمنی کا دعویٰ تھا کہ وہ جنگ کے لئے تنہا ذمہ دار نہ تھا۔ پھر اس نے تاوانِ جنگ کی ادائی سے انکار کیا۔ وہ بھی منظور ہو گیا۔ مگر ابھی تک وہ ذلت اور پستی کے غار سے نہیں نکلا۔ ہٹلر دیکھتا ہے کہ جرمنی کے بازوؤں میں ابھی قید و بند کی زنجیریں پڑی ہیں۔ لہذا اپنی پرواز سے پہلے وہ ان بے جا بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس کا فطری حق ہے کہ وہ آزاد رہے اور دوسری قوموں سے کسی طرح فروتر ثابت نہ ہو اور پھر اس صورت میں کہ دنیا کا مقدس ترین خون اس کی رگوں میں رواں دواں ہو ——— "میں جرمنی کو آزاد، منظم اور خوشحال بنانا چاہتا ہوں۔ کسی صورت میں بھی ہماری قوم کی عزت دوسروں کے رحم وکرم پر نثار نہیں کی جا سکتی"۔ ان الفاظ میں وہ ہمیشہ اپنی زندگی کے مطمحِ نظر کو قوم کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جرمن نوجوان کا دل حب الوطنی سے لبریز ہے۔ وہاں کے بچے بچے کو اپنی نکبت، "پستی" اور "غلامی" کا احساس ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ وقت آ پہنچا ہے کہ غلامی، سربریزی۔ خود سپردگی کے معاہدہ کی دھجیاں فضائے یورپ میں بکھیر دی جائیں۔ اسی لئے وہ قومیت اور اتحاد کی تبلیغ کرتا ہے۔ اپنی روایات، اپنی تاریخ اور اپنی نسل کی برتری ظاہر کرتا ہے پھر اسی غرور و تمرد سے سربلند نوجوان کو موجودہ پستی کے طعنوں سے ابھارتا ہے۔ غیرت دلاتا ہے اور جوش میں لاتا ہے۔ نوجوان طبقہ کلیتہً اس کے ساتھ ہے۔ پھر بیکار لوگوں کو جن میں اشتراکی خیالات پھیل رہے تھے۔ اپنی طرف بلاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے بہت سے ذرائع اختیار کئے ہیں لوگوں کو کام دلانے کے لئے اُس نے عورتوں کی آزادی سلب کر لی۔ انہیں ملازمتوں سے برطرف کر دیا اور گھر میں رہنے کی سخت تلقین کی۔ اس طرح بہت سے بیکار لوگ، برسرکار ہو گئے اور آزادیٔ نسواں سے جو بے راہ روی سوسائٹی میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بھی جاتی رہی۔ اب ایک نئے حکم کے ماتحت ہر کنوارا ۲۵ برس سے کم عمر شخص سرکاری اور پبلک ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائیگا اور ان معطل شدہ سرکاری اور پبلک لوگوں کے لئے مزدور سبھائیں (Labour Camps) وغیرہ کام مہیا کریں گی۔ اس طرح

سے جبکہ دوسرے ممالک ضبطِ تولید کے طریقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ہٹلر جرمن نسل کی ترقی و توسیع کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے۔ بہت سی شادیاں حکومت کے خرچ سے ہوئیں اور زیادہ اولاد پیدا کرنے کے لئے گورنمنٹ سے وظائف ملتے ہیں —
حال ہی میں ہٹلر گورنمنٹ کی طرف سے شادی کے متعلق کچھ ہدایات شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند ایک کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

۱۔ یاد رکھو کہ تم ایک جرمن ہو۔ (۲) تمہیں چاہیئے کہ اپنا جسم اور روح دونوں پاک و صاف رکھو (۳) صرف جرمن نسل ہی سے اپنا رفیقِ زندگی منتخب کرو صحت جسم کی خوبصورتی کی ضامن ہے۔ یاد رکھو۔ تم رفیق زندگی کا انتخاب کر رہے ہو کسی "معمولی شریک بزم کا نہیں۔ شادی کے زریں معنی ایک عمدہ نسل میں پنہاں ہیں"۔ مندرجہ بالا چند فقروں سے واضح ہو جائے گا۔ کہ ہٹلر تمام قوم کو جوان، تندرست اور تنومند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے اس نے جنسی تعلقات کے ادنےٰ لٹریچر کو نذرِ آتش کر دیا ہے۔ عریاں تصاویر، حیا سوز اور اخلاق باختہ کھیل تماشے سب قانوناً ممنوع قرار دیئے گئے ہیں سکولوں میں صحت جسمانی کے لئے ورزش اور دوسرے مردانہ کھیل ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ الغرض وہ آیندہ نسل کو ہر نہج اکمل و احسن بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان میں بچپن ہی سے' نازی نصب العین کی اشاعت کی جاتی ہے۔ "جرمنی میں ہر بچہ نازی پیدا ہوتا ہے"۔ قومیت اور اعتمادِ نفس کے سبق اوائل عمر ہی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے جرمن قوم آیندہ کشمکش حیات میں ایک نمایاں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہٹلر صرف اپنی قوم کی کامل اعانت کا طلبگار ہے۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم کا سائل نہیں بنتا — وہ بارہا واشگاف الفاظ میں اپنی قوم کی برتری، فوقیت اور اولیّت بتا چکا ہے۔ اپنی ہر تقریر کا پہلا فقرہ وہ اسی شدید احساسِ تفوق سے شروع کرتا ہے۔

"میری حکومت میں کسی قسم کی نکتہ چینی اور خردہ گیری قابلِ سرزنش ہے مجھے معارفانہ تنقیدوں کی ضرورت نہیں۔ میں طعن و تعریض سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ بلکہ میں اپنی قوم سے — قوم کی منفعت کے لئے — دیانت دارانہ تعاون و اشتراک کا طالب ہوں — میں صرف اس کی مدد چاہتا ہوں۔ باقی کام میرے ذمے ہے — میں حلفیہ عہد کرتا ہوں۔ کہ کوئی کام بھی غیر ذمہ دارانہ اور بے پروائی سے نہ کیا جائے گا۔ اگر میں اپنے دعوٰی میں کامیاب نہ ہو سکوں تو میری گردن قوم کے سامنے — اس کے پرجوش انتقام کے لئے جھک جائے گی"۔

یہ تمام واقعات تو اس کی ملکی اور اندرونی پالیسی کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس کی خارجی پالیسی کیا ہے ؟

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ہٹلر اور جرمن قوم معاہدۂ ورسائی کے بہت خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے کسی طرح منسوخ کرادیں پہلی شرط تاوانِ جنگ کے متعلق تھی۔ سو اسکے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ دوسری شرط سامانِ جنگ کی تعیناتی کے متعلق تھی۔ جرمن لوگ ہمیشہ سے جنگ جُو اور حریت پسند قوم رہے ہیں۔ لیکن جنگ کے بعد اس بہادر قوم کے بند جکڑ دیئے گئے تھے اور اس کی شاہینی ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئی تھی۔ مگر وہ حسبِ موقع کی تاک میں تھے اور مناسب وقت آنے پر انہوں نے اس "غلامانہ عہد" سے اعلانِ بغاوت کردیا۔ زمانۂ حال میں قومی ترقی، فوجی طاقت کے بغیر محال بلکہ ناممکن ہے۔ موجودہ دنیا کی بنیاد سرمایہ داری اور استعماریت ہے۔ ہر جگہ تجارتی پردوں کے نیچے "خود افرازی" برسرِ پیکار ہے اور اس دنیا کا ہر تجارتی معاہدہ "جنگی عہد و پیمان" ہے آسٹریا اور اٹلی کا تجارتی سمجھوتہ جرمنی اور فرانس میں ایک ہیجان سا پیدا کردیتا ہے۔ روس اور ٹرکی کی مفاہمت اٹلی کے مدبرین کے لئے ایک تازہ مصیبت پیدا کردیتی ہے۔ امریکہ اور روس میں باہمی لین دین کی گفتگو ہوتی ہے اور جاپان کا وزیرِ جنگ منچوریا میں جنگی نخادیر کے استحکام کا حکم دیتا ہے۔ انگلستان کا اپنی نوآبادیات سے "ترجیحی معاہدۂ دادو" استوار کرنا جاپان اور لنکا شائر میں ایک نئی مسابقت پیدا کردیتا ہے۔ الغرض موجودہ دنیا کا تمام نظام "استعماریت کی بنیادوں پر قائم ہے اور یہ مدعا بغیر افواج کے پورا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہر آزاد قوم کے لئے فوجی طاقت کا استحکام و بندوبست ناگزیر ہے خصوصاً جرمنی کے لئے جو ہر چہار جانب سے فرانس، روس، پولینڈ، اٹلی، زیگوسلافیہ جیسے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور جو اپنی حفاظت و بقا روزِ اول ہی سے فوجی طاقت پر منحصر سمجھتا ہے۔ وہ بھلا ان بندھنوں میں کب تک جکڑا رہتا۔ چنانچہ اس نے ان "کاغذی پرزوں" سے کامل تغافل برتتے ہوئے اپنی طاقت بڑھانا شروع کردی۔ جرمنی کا ہر ایک نوجوان فوجی سپاہی اور جنگ کے ساز و سامان سے آراستہ نظر آنے لگا۔ جرمنی کا یہ زور ہمسایہ قومیں کہاں دیکھ سکتی تھیں چنانچہ اس کے سب سے پرانے اور "غدار" دشمن فرانس نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس کو نئی جنگ کی تیاریوں سے تعبیر کیا۔ واقعات کچھ بھی ہوں لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ جرمنی نے عہدنامہ کی خلاف ورزی کی تھی اور وہ اس کے لئے انجمن اقوام کے سامنے جوابدہ تھا۔ لیکن جرمن قوم نے ان کی مخالف آوازوں کی ذرا بھی پروا نہ کی اور نہ کرنا چاہیئے تھی۔ معاہدہ ورسائی کی رو سے یہ قرار پایا تھا۔ کہ دنیا کے قیامِ امن کے لئے تمام ملکوں میں تخفیف کی جائے گی اور اس مبارک کام میں جرمنی سب سے پہلے اقدام کرے گا۔ مگر آہستہ آہستہ "انجمن اقوام" سب قوموں سے اس تخفیف کے لئے مطالبہ کرے گی چنانچہ جرمنی نے یہی سوال اٹھایا۔ کہ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق نہایت ایثار سے کام لے کر اپنی فوج میں تخفیف کردی تھی اور وہ اب تک منتظر تھے کہ دوسرے ممالک بھی اپنے وعدوں کے مطابق اپنی اپنی فوج کم کردیں گے۔ مگر اب تک کسی نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ ہر سال نئے تخمینۂ مصارف میں بڑی بڑی رقمیں فوج کے زیادہ مضبوط کرنے میں خرچ کی جارہی ہیں۔ اس لئے جرمنی اب زیادہ قربانی نہیں کرسکتا۔ اور وہ اپنی قومی ضروریات کے مطابق اپنی فوجی طاقت منظم کررہا ہے ———

ظاہر ہے اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ مگر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو بھی روکنا تھا۔ لہذا انجمن تخفیفِ اسلحہ وجود پذیر ہوئی۔ معمول کے مطابق بحث مباحثے ہوتے رہے۔ مگر نتیجہ نشستند و گفتند و برخاستند ہی رہا۔ سب سے زیادہ جھگڑا فرانس اور جرمنی کا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں بغض ہے۔ ایک دوسرے کو کبھی پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے۔ ہٹلر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ

"برطانیہ ہمیں ایک عظیم الشان طاقت کی حیثیت سے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور فرانس سرے سے ہمیں کوئی طاقت دیکھنے کا ہی روادار نہیں"۔ جہاں یہ حالت ہو۔ وہاں کسی مفاہمت کلی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کئی دفعہ برطانیہ کی تمام مصالحانہ کوششیں ناکام رہیں۔ آخر کار جرمنی نے "انجمن اقوام" سے علیحدگی اختیار کر لی اور بعد میں بڑی استمالت کے بعد اس شرط پر مراجعت کا اقرار کیا۔ کہ اُسے دوسرے ملکوں کے برابر "حق آزادی" دیا جائے۔ لیکن یہاں پھر اسلحہ وغیرہ کا سوال پیش آتا ہے۔ اگر آزادی دی جاتی ہے تو اُسے فرانس۔ اٹلی۔ برطانیہ وغیرہ کی طرح فوجی استحکام کی کامل اجازت دینی پڑتی ہے (جو کم از کم فرانس کے لئے ستونِ روح ہے) اور بدیگر صورت وہ تو آزاد ہے اور آزاد رہے گا۔ جس کا جی چاہے نبرد آزمائی کرے۔ پھر بھی ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

آپس میں ہلکی ہلکی نوک جھونک ہوتی رہی۔ جس کی تان آخر ناکامی ہی پر ٹوٹی۔

۱۰ اپریل کو فرانس کے وزیر خارجہ ایم۔ لوئی بارتھو نے اعلان کر دیا کہ فرانسیسی گورنمنٹ برطانیہ کے پیش کردہ میمورنڈم سے متفق نہیں اور ہم کسی صورت میں بھی جنگی استحکامات کے معاملہ میں اپنی آزادئ عمل کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتے تاہم اس قسم کی مصالحت ہو سکتی ہے اگر مجلس تخفیف اسلحہ کے تمام رکن فرانس کی حفاظت کے ضامن بنیں۔ پھر اس نے جرمنی کی نازی نیم فوجی پارٹی پر اعتراض کیا اور آخر میں جرمنی کے انجمن اقوام میں داخلہ پر زور دیا۔

اس پر جرمنی نے اعلان کر دیا۔ کہ وہ لیگ میں شامل ہونے کے لئے طیار ہے بشرطیکہ تخفیف اسلحہ کے متعلق کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور یہ بات واضح کر دی کہ معاہدہ ورسائی میں بیان کردہ فوج کی تعداد جرمن قوم کی ضروریات کے لئے کافی نہیں۔ پھر اس چیستان کے حل کی دو صورتیں پیش کیں:۔

۱۔ پانچ سال کے لئے امن و امان کا ایک عہد نامہ مرتب کر لیا جائے۔ یا۔

۲۔ ایک محدود سا عہد نامہ تخفیف اسلحہ کچھ مدت کے لئے مرتب کیا جائے۔

رہا نازی نیم فوجی جماعت کا سوال۔ سو اس کی بابت جرمن گورنمنٹ راضی ہو گئی کہ وہ ان کو کسی قسم کی فوجی تربیت نہ دیگی۔ اور اس کی بابت ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے کا اقرار بھی کر لیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی۔ کہ فرانس کی وہ فوج جو نو آبادیات

میں موجود ہے اور جو وقتِ ضرورت نہایت آسانی سے بلائی جاسکتی ہیں ۔ خود فرانس کی فوج میں شمار ہونی چاہیئے ۔ اس کے علاوہ اس نے اعلان کر دیا کہ جرمن گورنمنٹ اپنی ہوائی طاقت کے قیام و استحکام کے لئے دو سال کا مزید انتظار (جو برٹش گورنمنٹ کے میمورنڈم نے تجویز کیا تھا) نہیں کرسکتی ۔ وہ نئے معاہدہ کے آغاز ہی سے اپنی قوتِ پرواز کو چھوٹی مشینوں والے دفاعی جہازوں سے (بمبار جنگی جہازوں سے نہیں) مضبوط کریگی اور اس نے وعدہ کیا کہ اس کی ہوائی قوت اس کے ہمجوار ملکوں کی مجموعی قوت کے ۔۳۰ فیصدی یا فرانس کے ۵۰ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھے گی ۔ جرمن گورنمنٹ صرف پانچ سال تک اس معاہدہ پر رضامند ہے ۔ اس کے بعد یہ ضروری ہوگا کہ تخفیف یا زیادتی کی جائے تاکہ وہ دس سال کے اندر اندر دنیا کی عظیم ہوائی قوتوں سے لگا کھاسکے آج تک صلحی کانفرنسیں تخفیفِ اسلحہ کے متعلق ہوئیں ، اُن سب کا خلاصہ سطور فوق میں درج کیا گیا ہے اور عملی دنیا میں اس کا یہ اثر ہے کہ فرانس نے جرمن سرحد پر نہایت مضبوط آہنی قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیئے ہیں اور جرمنی نے نئے تخمینہ میں فوجی مصارف کی مد میں ۳۵۲,۰۰۰,۰۰۰ مارکس زیادہ کر دیئے ہیں ۔ ان حالات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ معاہدہ ورسیلز کی دوسری "ذلت آمیز" شرط پر کہاں تک عمل کیا جا رہا ہے ۔

اب تیسری شرط رہ گئی ہے ۔ وہ نو آبادیات پر دوبارہ تصرف و قبضہ کا سوال ہے کیا واقعی ہٹلر ۶۰۰,۰۰۰ مربع میل علاقہ واپس لینے کے لئے بے چین ہے ۔ کیا وہ اپنی پہلی سی وسیع سلطنت کا خواہشمند ہے ؟ اس کا جواب نہایت صاف ہے اور وہ غیر مبہم الفاظ میں بارہا کہہ چکا ہے کہ اُسے نو آبادیات کی ضرورت ہے وہ دوسرے علاقہ کو فتح کرنا نہیں چاہتا ۔ یہ بالکل پرنس بسمارک کی سی پالیسی ہے لیکن اسی سوال کے صحیح جواب پر موجودہ اور آیندہ حالاتِ دنیا کا انحصار ہے ۔ اگر کوئی جنگ آیندہ ہونے والی ہے تو اس کی خفتہ چنگاریاں اسی خاکستر میں دبی ملیں گی ۔

اگر یورپ کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو جرمنی کی نازک حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ایک طرف نظر ڈالیے ۔ فرانس ۔ بلجیم ۔ پولینڈ ۔ روس وغیرہ نظر پڑیں گے جو سب کے سب متحدہ طور پر اس کے جانی دشمن ہیں ۔ فرانس سے آج تک نہ نبھ سکی ۔ بلجیم کی جنگِ عظیم والی خانہ ویرانی اور تباہ حالی اس کو جذباتِ مصالحت پر کبھی نہیں اُبھارتی ۔ پولینڈ سے ایک معاہدہ ہو چکا ہے ۔ مگر وہ برائے بیعت ہے فرانس ہرگز جرمنی اور پولینڈ کا اتحاد نہیں دیکھ سکتا ۔ جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ کو ایک خود مختار اور آزاد علاقہ بنانے والا ہی فرانس تھا اور آج بھی وہ پولینڈ کو ایک خود مختارانہ حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے ۔ روس کے اشتراکی پراپیگنڈا کو جرمنی میں جتنا نقصان ہٹلر کی قومی اشتراکیت نے پہنچایا ہے وہ اظہر من الشمس ہے ۔ اشتراکیوں کی بے رحمانہ تعزیر روس کے برادرانہ جذبات کو ٹھیس لگاتی ہے ۔ لہذا روس اور جرمنی کے خوشگوار تعلقات ، ہٹلر کے اقتدار کے ساتھ بگڑ گئے ۔ اس کشیدگی کے باعث جرمنی اور جاپان میں رشتۂ مواخات استوار ہو گیا ۔ کیونکہ جاپان کے مستعمرانہ اقدامات کے راستہ میں روس ہمیشہ حائل رہا ۔ اور اسی نا اتفاقی کا نتیجہ

ہے کہ روس انجمن اقوام میں داخل ہونے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں (جرمنی اور جاپان) دنیا کے امن میں خلل اندازی کرنے والے اس سے الگ ہو چکے ہیں۔ الغرض جرمنی اس طرف سے بالکل گھرا ہوا ہے۔ دوسری جانب آسٹریا اٹلی۔ بلگیریا اور دیگر ریاستیں ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے تعلقات جتنے فرانس سے وابستہ ہیں۔ اتنے کسی دوسرے ملک سے نہیں۔ اب اٹلی نے بھی اس طرف پاؤں جمانے شروع کئے ہیں۔ مگر جرمنی کے لئے وہاں کچھ نہیں۔ تجارتی اغراض ان ریاستوں کو جرمنی سے مراحل دور رکھتی ہیں۔ واقعات کا یہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی کی بین الاقوامی پوزیشن نہایت نازک ہے ایسی صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ہٹلر کی پالیسی ہے۔ وہ آغاز ہی سے جرمن قوم کے اتحاد کے مشن کا پرچار کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جرمن نسل کے لوگ آپس میں متحد ہو جائیں اور اس کے لئے اس نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ اس کی زندگی کے صرف دو مقصد ہیں:-

۱۔ معاہدہ ورسائی کا خاتمہ

۲۔ جرمن قوم کا اتحاد۔ اس کی ترقی اور خوشحالی۔

معاہدہ ورسائی کی وہ دھجیاں اڑا چکا ہے اور برابر کا "حق آزادی" منوا چکا ہے کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کا یہ فطری حق اور جائز مطالبہ رد کرے۔ مگر دوسرے مقصد کے حصول کے لئے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے۔ اور یہی مصیبتیں ہیں۔ جو دنیا اور جرمنی کے تعلقات موجودہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

جرمن قوم سے آباد دو ملک بہت مشہور اور ضروری ہیں اور یہی دو گتھیاں ہیں۔ جو یورپ کی قسمت کا فیصلہ چند ہی مہینوں میں کر کے رہیں گی۔

۱۔ آسٹریا اور (۲) مسئلہ سار (SARR PROBLEM)

پیشتر اس کے کہ ہم آسٹریا اور سار کے جرمنی کے ساتھ باہمی روابط اور ان کے اتحاد وغیرہ کی ممکنات پر بحث کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کی پوزیشن ایک دفعہ پھر واضح کر دی جائے۔ ہٹلر دیکھتا ہے۔ کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنی مخالفتوں کو کامیابی کے ساتھ دبا دے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی حلیف ہو۔ تاکہ تمام دشمن یورپ میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا یا نہ نظر اٹھا سکے۔ اس کے لئے جب وہ چاروں طرف دیکھتا ہے تو سب طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ فرانس۔ روس، پولینڈ وغیرہ سے وہ کبھی بھی برسر رفاقت نہیں ہو سکتا۔ وہ سب اس کے جانی دشمن ہیں۔ اب بڑی بڑی طاقتوں میں سے صرف دو رہ جاتی ہیں۔

اٹلی اور انگلستان

تقریباً دو سال پہلے ہٹلر کو ان ملکوں سے بہت کچھ امید تھی۔ مگر اب بوجوہ، وہ سب نقش بر آب ثابت ہوئیں۔

اٹلی اور جرمنی میں اتحاد دو امیدوں پر مبنی تھا:۔

۱۔ یہ کہ دونوں ملکوں کا طریقِ حکومت مشترک ہے۔ دونوں ایک ہی نصب العین کے حامی ہیں۔ دونوں قومی ترقی۔ قومی خوشحالی۔ قومی وسعت کے لئے کوشاں ہیں۔

۲۔ اس لئے کہ فرانس دونوں کا دشمن تھا۔ جرمنی اور فرانس کی دشمنی تو کسی ثبوت و دلیل کی محتاج ہی نہیں۔ اٹلی اور فرانس میں بدمزگی یوں پیدا ہوئی کہ بلقان کی ریاستوں کے تجارتی اغراض دونوں کی امیدوں کا سہارا ہیں۔ اگر اٹلی آسٹریا اور ہنگری کو (معاہدہ مزیبہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۴ء) کو ٹریسٹی اور فیوم کی بندرگاہیں عنایت کرتا ہے اور ان سے لکڑی اور غلہ وغیرہ خریدتا ہے تو فرانس تمام بلقانی ریاستوں کو تجارتی سہولتیں دینے پر رضامند ہے۔ دوسرے اٹلی کو نوآبادیات کی سخت ضرورت ہے اور ان کے لئے سب سے زیادہ زرخیز زمین افریقہ کی ہے۔ مگر وہاں فرانس کی چلتی ہے۔ وہ اٹلی کی دال نہیں گلنے دیتا۔ چنانچہ ان منافشات کے پیشِ نظر ہٹلر کو مسولینی سے امیدِ معاونت تھی۔ اس دوستی کے لئے اس نے بہت کوشش کی۔ بلکہ ٹرول (TYROL) کے جرمنوں سے برادرانہ رشتہ داری کا خیال تک بھی چھوڑ دیا۔ مگر یہ امید بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کیونکہ مسولینی خوب جانتا ہے کہ اگر آسٹریا اور جرمنی مل گئے تو وہ یورپ کی سب سے بڑی اور خطرناک حکومت بن جائیگی اور خود اس کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ اس خوف کے زیر اثر وہ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا سخت مخالف ہے۔ اب اس مخالفت میں فرانس اس کے ساتھ مل جاتا ہے اور چونکہ فرانس، میثاق آسٹریا اور جرمنی سے بہ نسبت اٹلی کے زیادہ خائف ہے۔ اس لئے وہ اٹلی اور جرمنی کو توڑنے کے لئے قربانی بھی کرتا ہے یعنی اٹلی کو بلقانی ریاستوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کرنے کی آزادی دے دیتا ہے۔ اٹلی اپنا دوہرا فائدہ دیکھ کر ہٹلر کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح سے فرانس اور اٹلی مل جاتے ہیں۔ ہٹلر پھر اکیلا رہ گیا۔ اب دوسری طرف دیکھتا ہے۔ انگلستان سے کئی ایک امیدیں ہیں۔

۱۔ دونوں ایک ہی آرین نسل سے ہیں (۲) دونوں کا مذہب پروٹسٹنٹ ہے (۳) برطانیہ کے مال کے لئے بہترین منڈی جرمنی ہے (۴) ہٹلر سمجھتا تھا کہ توازن قائم رکھنے میں برطانیہ ضرور جرمنی کی مدد کرے گا۔ جنگ سے پہلے جرمنی یورپ کی سب سے بڑی طاقت تھی اور برطانیہ نے اس کا زور توڑا۔ مگر اب جنگ کے بعد فرانس زور پکڑ رہا تھا اور اب یورپ میں سب سے بڑی وہی حکومت ہے لہٰذا اب اس کی باری آگئی ——— مگر ——— جرمنی کے جنگی منصوبے اور اس کی فوجی تنظیم نے برطانیہ کو بدظن کر دیا۔ گو ہٹلر سے پہلے برطانیہ میں جرمنی کے لئے ہمدردی موجود تھی، اور انہوں نے جرمنی کی مالی حالت کو درست کرنے کے لئے قرضے بھی اٹھا دیئے تھے مگر یہودیوں کے استیصالِ بالجبر نے یہ "غمخواری" ہمیشہ کے لئے رنج و غصہ میں تبدیل کر دی۔ برطانیہ کا بہت سا سرمایہ یہودیوں کی بدولت کارآمد ہے۔ اس کا کاروبار ان کی عنایت سے چلتا تھا۔ مگر جرمنی نے اس کے حلیفوں کا کچھ بھی

خیال نہ کیا اور ان کے ساتھ جابرانہ سلوک کیا۔ انہوں نے جرمنی سے اخراج کے بعد برطانیہ سے رجوع کیا۔ جو مدد سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ فلسطین کا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہاں جو کچھ ہُوا اور ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہُوا۔ اس طرح سے جرمنی کے سخت رویہ نے برطانیہ کو ناراض کر دیا——

علاوہ ازیں اگر فرانس زبردست طاقت ہے تو ہُوا کرے۔ انگریزوں کو اس سے کوئی نقصان نہیں کیونکہ برطانیہ کی تجارت فرانس کی رقابت اور مسابقت سے محفوظ ہے۔ فرانس اپنی نوآبادیات سے تجارت کر سکتا ہے اس لئے اُسے غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ برطانیہ کے مفاد پر کبھی دست درازی نہیں کرتا۔ بلکہ برخلاف اس کے جرمنی اور برطانیہ میں ایک سرگرم مقابلہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۰ء ہی کو لیجئے۔ جرمنی کی برآمد۔ برطانیہ کی برآمد سے زیادہ تھی۔ ان حالات میں برطانیہ بھی جرمنی کی مدد سے کنارہ کش ہے اور جرمنی اب دنیا بھر میں اکیلا ہے (سوائے جاپان کے لیکن وہ بہت دُور ہے) یہ حالات ہیں اور ہٹلر جرمن قوم کو متحد کرنا چاہتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آسٹریا اور سار کے اتحاد جرمنی میں کیا مشکلات ہیں اور جرمنوں کے آپس میں ملنے کے لئے اٹلی۔ برطانیہ یا کسی دوسرے حلیف کی ضرورت کیوں پیش آئے —— کیوں نہ سب جرمن آپس میں مل جائیں——

آسٹریا—— جنگِ عظیم میں آسٹریا جرمنی کے دوش بدوش جنگ میں شریک ہُوا تھا اور دونوں میں اتحاد و یکجہتی پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب جرمنی کو شکست ہوئی اور وہ اپنی ٹوٹی اور بکھری قوت کی بحالی کے لئے کوشاں تھا۔ تو آسٹریا بھی جنگ کے اثراتِ بد سے حتی الامکان بچنے ہی کے لئے تدبیریں کر رہا تھا۔ جنگِ عظیم کے بعد اٹلی میں مسولینی نے زور پکڑا اور وہاں فسطائیت نے قدم جمائے، روس میں بالشویک انقلاب رونما ہُوا۔ جاپان میں دو پارٹیاں۔ فوجی اور سیاسی پیدا ہوئیں۔ جرمنی میں قومی اشتراکیت کے آثار نظر آنے لگے۔ ٹرکی میں نوجوان ترک اور مصطفےٰ کمال کا اقتدار بڑھا۔ لہٰذا آسٹریا بھی ان انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہاں تین تحریکیں زور دار پڑتیں۔ (۱) قوم پرست (۲) اشتراکی (۳) فسطائی۔ قوم پرستوں کا رہنما ڈاکٹر ڈولفس تھا۔ جو بعد میں آسٹریا کا چانسلر بنا۔ اشتراکیوں کے لیڈر ڈاکٹر جولیس اور راولڈ تھے۔ جو اپریل والے اشتراکی بلوے میں بُری طرح مجروح ہوئے تھے اور جن کے بعد آسٹریا میں اشتراکی زور بالکل ٹوٹ گیا۔ فسطائیت کا حامی پرنس تھا——

ہٹلر کی حکومت سے پہلے آسٹریا میں عام رجحان جرمنی سے رشتۂ مواخات قائم کرنے کا تھا۔ مگر اس کے اقتدار کے ساتھ ہی یہ برادرانہ جذبات ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے۔ وہ اس طرح ہُوا کہ ہٹلر نے جب اشتراکیوں کو سزائیں دینا شروع کیں اور ان کی نقل و حرکت "لاقانونیت" سے تعبیر کی گئی تو آسٹریا کے کمیونسٹ بھی ہٹلر کے خلاف ہوگئے اور انہوں نے آسٹریا، جرمنی کے اتحاد کی مخالفت شروع کر دی۔ دوسرے ہٹلر تمام ملک میں پروٹسٹنٹ قسم کا مذہب رائج کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے بہت سے کیتھولک مذہب رکھنے والوں پر غیر مناسب اور ناروا زور بھی ڈالا۔ جس سے آسٹریا

کے کیتھولک بھی ناراض ہوگئے۔ فسطائیت والوں کے اغراض شروع ہی سے جرمن اتحاد کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اٹلی نے آسٹریا کو چند ایک تجارتی مراعات دے رکھی ہیں اور وہ اس سے لکڑی وغیرہ بھی خرید تا ہے۔ اٹلی نے اُس کے لئے ٹریسٹی کی بندرگاہ بھی کھول دی۔ کیونکہ اس میں اس کا فائدہ ہے۔ اٹلی کے سامانِ حرب اور دیگر ہر قسم کی تجارتِ برآمد کی کھپت آسٹریا میں خوب ہوتی ہے دوسرے وہ اپنے قریبی ملک کو اپنی ہی طرح "فسطائیت" کے زیر اثر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اپریل کے بعد سے ہیجر نے وغیرہ کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ آسٹریا اب "نیم فسطائی" ہے اور اٹلی اس کی آزادی۔ خود مختاری اور خوشحالی کا سرپرست ہے۔ آخری پارٹی ڈاکٹر ڈولفس کی تھی۔ یہ قوم پرست ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ لوگ کسی بیرونی قوت کے ماتحت رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کے لئے دوسروں کا نقصان بہ طیب خاطر قبول کرلیتے ہیں لہذا انہیں ہرگز ہٹلر کی ضرورت نہیں۔ وہ خود مختار رہنا چاہتے ہیں اور جرمنی سے برادرانہ تعلقات کے سخت مخالف ہیں۔ اب ہٹلر کیا کرے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ آسٹریا کو اپنے ساتھ ملاکر رہے گا لیکن آسٹریا خود اس اتحاد کے خلاف ہے۔ اگر کچھ ہوسکتا ہے۔ تو وہ صرف بزورِ شمشیر مگر یہ ممکن نہیں کیونکہ اٹلی۔ فرانس اور برطانیہ کی متحدہ سرپرستی۔ جرمنی کے جنگی مقاصد میں حائل ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ آسٹریا کی طرف ایسا اقدام کرے تو اس کی حدوں پر ان تینوں ملکوں کی فوجیں جمع ہوکر اعلانِ جنگ کردیں۔ لہذا یہ طریقہ بھی خطرات سے محفوظ نہیں۔ لیکن آسٹریا میں ایک نازی پارٹی بھی ہے۔ جو ہٹلر اور جرمنی کے لئے ہر قسم کی قربانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک منظم سازش کے ذریعہ ڈولفس کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہا۔ ۲۰ر جولائی کو باغیوں نے "چانسلری" پر دھاوا بول دیا اور ڈاکٹر ڈولفس کو ایک شخص اوٹو نیلیا نے قتل کردیا۔ تمام دنیا میں ایک تشویش انگیز ہیجان برپا ہوگیا اور ہر روز جنگِ یورپ کے اعلان کا خوف رہنے لگا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کیونکہ نازی بغاوت فوراً ہی دبا دی گئی۔ دوسرے ہٹلر نے صاف صاف الفاظ میں اس سے لاتعلقی ظاہر کردی۔ بلکہ ثبوت کے طور پر اپنے سفیر متعینہ وائنا کو واپس بلاکر وہاں کپتان خان ہیپن کا تقرر کردیا۔ اٹلی کے اخبارات میں جرمنی پر شدید الزامات لگائے گئے اور آسٹریا کی مدد کے لئے، اٹلی نے کچھ فوجیں بھی آسٹروی سرحد پر بھیج دیں۔ لیکن ہٹلر نے ان تمام واقعات سے کامل غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور وہ بالکل خاموش رہا۔ اس کے بعد سے ہٹلر اندرونی معاملات میں گھرا ہوا ہے اور آسٹروی فضا اب ہر طرح سے ساکن و خاموش ہے، ہٹلر اس کے ساتھ اتحاد کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کر رہا ہے یا کرے گا۔ صرف واقعاتِ آئندہ ہی روشنی ڈالیں گے اس سے پہلے قیاس آرائیاں کرنا۔ نہایت مشکل ہے!

مسئلہ سار جنگِ عظیم کے بعد جب جرمن نوآبادیات کی تقسیم ہوئی تو الساس اور لورین فرانس کو واپس کردیئے گئے اور گو علاقہ سار کی کوئلے کی کانیں جرمن حکومت کے زیر اثر تھیں لیکن ان کا "علمی اور طبعی" تعلق لورین کی لوہے کی کانوں کے ساتھ تھا۔ اس لئے سار کی معدنی پیداوار پر فرانس کا حق مان لیا گیا اور اس طرح سے اس نقصان کی جو جرمنوں کے لورین کو تباہ کرنے سے

فرانس کو اٹھانا پڑا تھا۔ تلافی کی گئی۔ سار فرانس اور جرمنی کی سرحدوں کے اتصال پر واقع ہے۔ یہاں کی تمام آبادی مزدوروں اور صنعتی کاریگروں پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ اپنی معدنی اور صنعتی ترقیوں کے باعث بہت اہم ہے اور جرمنی کی خوشحالی بڑی حد تک اس سے وابستہ تھی جنگ کے بعد فرانس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے لئے بھی وہ اسی قدر اہم ہے جس قدر جرمنی کی تجارتی اغراض کے لئے۔ اسی لئے معاہدۂ ورسائی کے وقت فرانس نے حتی الامکان کوشش کی کہ یہ کانیں ہمیشہ کے لئے اسے دے دی جائیں اور اتحادی بھی تقریباً رضامند ہو چکے تھے۔ مگر پریذیڈنٹ ولسن نے سخت مخالفت کی اور کسی طرح بھی "الحاقِ دوام" کے لئے راضی نہ ہوا۔ اس پر فرانس ناراض ہوگیا اور اس نے اس کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ سننے سے انکار کر دیا لعوزدہ دیا کہ سارا اساس اور لورین کے صوبوں کے ساتھ ہی اُسے بخش دیا جائے۔ مگر ولسن کی شہ پر انگلستان بھی بگڑ گیا اور لائڈ جارج نے معاہدۂ درسائی کی کل دفعات پر نظر ثانی کی دھمکی دی جس پر فرانس، پریذیڈنٹ کی مجوزہ سکیم پر عمل کرنے کو تیار ہوگیا۔ قرار پایا کہ سار کی حکومت پندرہ سال کے لئے ایک کمیشن کے سپرد کی جائے گی۔ جو پانچ اراکین پر مشتمل ہوگا! وہ جن کا انتخاب ہر سال انجمن اقوام کیا کرے گی۔ ان میں سے ایک رکن جرمنی کا ہوگا۔ دوسرا فرانس کا تیسرا سار کا اور باقی دو جرمنی اور فرانس کے سوا کسی دوسرے ملک سے منتخب کئے جائیں گے۔ کمیشن ساربرگ میں اپنے ہیڈ کوارٹر رکھتا ہے اور آج کل ایک انگریز مسٹر نوکس (Knox) اس کے صدر اعلیٰ ہیں۔ اس طریقہ حکومت کی میعاد پندرہ سال تھی اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ اختتامِ مدت پر ایک استصواب عام کے ذریعہ سے تین سوال پوچھے جائیں گے :۔

۱۔ آیا سار کے باشندے اپنے وطن جرمنی کے ساتھ اتحاد چاہتے ہیں۔

۲۔ یا وہ فرانس کے ساتھ اشتراکِ عمل کے خواہاں ہیں۔

۳۔ یا وہ کمیشن کے طرزِ حکومت کو پسند کرتے ہیں۔"

جس سوال کے جواب میں کثرت رائے ہوگی۔ وہی طریق کار اختیار کیا جائیگا اور اسی کے مطابق سار کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

اب یہ پندرہ سال کی مدت جنوری ۱۹۳۵ء میں ختم ہو جائے گی اور ۱۵ جنوری کو سار کے باشندوں سے مندرجہ بالا سوالات کئے جائیں گے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ علاقہ جرمنی اور فرانس دونوں کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ علاقہ جرمنی کے ساتھ متحد ہوگیا تو فرانس کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ جرمن حکومت فوراً یہاں کی کانوں کا کوئلہ فرانس بھیجنا بند کر دے گی اور فرانس کی لوہے کی کانیں بے کار ہو جائیں گی۔ اس کی اسلحہ سازی و دیگر آلاتِ آہن کی تمام تجارت ماند پڑ جائیگی دوسری طرف اگر یہ علاقہ فرانس کو مل جائے (جس کا بہت کم امکان ہے) تو جرمنی کی تجارتی حالت بہت خراب ہو جائے گی۔ اُس کی بگڑی ہوئی حالت فقط تجارتی حالات کی استواری ہی سے ٹھیک ہو سکتی ہے اگر یہ نہ ہو سکا تو وہ تمام دنیا میں بے اعتمادی

پیدا کر دے گا۔ ہر جگہ اس کی تباہی کا اثر پڑے گا۔ ابھی تھوڑے ہی عرصہ کا ذکر ہے کہ مارک کی قیمت گر جانے سے تمام ملکوں میں بھی تجارتی "بے اعتمادی" پیدا ہو گئی تھی اور ہمارے ملک کے چند ماہرانِ اقتصادیات اور تاجر لوگوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو تار بھی دیا تھا کہ جرمنی سے ایک نیا تجارتی معاہدہ کیا جائے۔ الغرض اگر سار کا علاقہ جرمنی کو نہ ملا۔ تو یورپ بلکہ دنیا کو ایک انقلاب انگیز جنگ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ سار اور جرمنی کے اتحاد میں کیا رکاوٹیں ہیں :۔

سار میں آج کل دو پارٹیاں زور وں پر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہاں صرف دو ہی پارٹیاں ہیں :۔ (۱) اشتراکی (۲) کیتھولک (یہ ظاہر ہے کہ یہاں کی آبادی جرمن قوم اور جرمن نسل سے تعلق رکھتی ہے)

جرمنی میں اشتراکیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس پر پہلے ہی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اشتراکی جماعتی جنگ کے حامی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر جگہ دو متخالف جماعتیں ہیں (۱) سرمایہ دار (۲) مزدور۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ مزدوروں کا خون چوس چوس کر اپنی امارت کے "نت نئے جلوس" نکالا کرے۔ وہ ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی۔ اپنی چالاکی۔ مکاری اور بے دیانتی سے اپنی ملکیت بناتا رہتا ہے اور مزدور بے چارہ سرمایہ داری پیدا کردہ۔ غلامانہ ذہنیت کے باعث ہر طرح کے مصائب کا شکار ہوتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے مفاد کا یہ تضادِ مطلق ان کو ہمیشہ مبتلائے پیکار رکھتا ہے اور اس کا خاتمہ اس وقت تک نہ ہو گا۔ جب تک ان میں سے ایک کلیتہً ختم نہ ہو جائے اور چونکہ اشتراکی نقطۂ نظر کے مطابق نظام سرمایہ داری انحطاط پذیر ہے اس میں چند تباہ کن عناصر موجود ہیں اور اس کی بنیادیں کمزور ہیں لہٰذا وہ از خود ختم ہو جائے گا۔ صرف اد نگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ چاہیئے اور اس بہانہ کو وہ ایک منظم و مسلح بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔ لیکن قومی اشتراکیت اس تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ملک میں کسی قسم کا انتشار نہ پایا جائے۔ تمام ملک میں صرف ایک پارٹی ہو۔ جماعتی جنگ کے بجائے ایک "مصالحانہ جنگ" ہو۔ قوم کی ترقی۔ قوم کی خوشحالی اور قوم کی وسعت کے لئے۔ قوم کے دشمنوں۔ قوم کے بدخواہوں اور قوم کے نکتہ چینیوں کے خلاف۔ وہ صنعتی دنیا کو "مزدور سبھاؤں" کے ذریعے چلانا چاہتی ہے جو مزدوروں میں تنظیم پیدا کریں اور ان کی تعلیم و تہذیب کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اور دوسری جانب سرمایہ داروں کی جماعت ہو۔ جو "ڈائرکٹرز" کی ایک جماعت کے ماتحت اپنا نظام قائم کریں اور انصاف، اشتراکِ عمل، دیانتداری اور سب سے زیادہ تمام قوم کی فلاح و رفاہ کو مدِ نظر رکھیں۔ پھر اگر ان میں کچھ اختلافات پیدا ہوں تو وہ حکومت کی مقرر کردہ لیبر کمیشن کے فیصلہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔ یہ ہٹلر کا نظامِ حکومت ہے اس پر بھی اگر کوئی پارٹی بندی کی کوشش کرے تو وہ اس کے غضب کا نشانہ بنتا ہے۔ اشتراکی، ہٹلر کی پالیسی کے خلاف ہیں اس لئے وہ انہیں ہولناک سزائیں دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ اشتراکی دنیا کے غصہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ روس بھی جرمنی سے اس

پالیسی کی بنا پر ناخوش ہے اور سار کے اشتراکی بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لہذا خطرہ ہے کہ وہ اتحاد جرمنی کے خلاف رائے دیں گے۔

اسی طرح ہٹلر چاہتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں بھی یکسانیت پیدا ہو جائے اور وہ اسی لئے کوششیں کر رہا ہے۔ کہ ایک پروٹسٹنٹ قسم کا چرچ قائم کرے اور تمام جرمن لوگوں کو اُس کے مقرر کردہ طریقوں پر عبادت کرنے کی تلقین کرے لیکن کیتھولک اس کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے اعتقادات سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں بویریا میں کیتھولک لوگوں کو جو سزائیں دی گئیں تھیں وہ اسی "ہٹ دھرمی" کا نتیجہ تھیں۔ اب بھی کچھ دنوں سے کیتھولک رہنماؤں سے نئے گرجا کے متعلق (جس کا صدر موئلر (maullee) ہے۔ مشورہ کیا جا رہا ہے لیکن وہ اس کو بالکل قانون کے خلاف بتاتے ہیں، چنانچہ ان میں سے کچھ گرفتار بھی کئے گئے ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا؟ صرف واقعات ہی صحیح روشنی ڈال سکیں گے۔ ہاں اتنا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہٹلر اشتراکیوں اور کیتھولک کی مدد چاہتا ہے اور وہ تالیفِ قلوب کے لئے، ہر قسم کے طریقے اختیار کرے گا جس کا دھندلا سا عکس اس کے ایک فرمانِ جدید میں نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس نے بہت سے سیاسی قیدی جن میں اکثریت اشتراکیوں کی تھی، رہا کر دیئے ہیں اور کیتھولک کے ساتھ بھی وہ نہایت رفق و ملاطفت سے پیش آتا ہے۔ بعد میں خواہ کچھ ہو مگر ۱۵ جنوری تک ہٹلر اپنے ان دشمنوں سے نہایت محبت سے پیش آئے گا۔ بہرحال اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ سار کے باشندے جرمن قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے وطن سے زبردستی الگ کئے گئے تھے۔ آخر وہ کون ہے۔ جو اپنے محبوب وطن کو واپس جانا پسند نہ کرے؟ ——

ہٹلر کے خلاف نہایت مسموم پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک معمولی شخص ہے جس نے شکست خوردہ جرمنوں کے جذبات معاہدہ ورسائی کے خلاف برانگیختہ کر رکھے ہیں اور وہ فوجی قوت کے بھروسے پر حکومت کر رہا ہے لیکن اگر واقعات کا بہ نظرِ غور تجزیہ کریں تو واضح ہو جائے گا۔ کہ ہٹلر ایک فوجی سپاہی اور با تدبر جرنیل ہونے کے علاوہ ایک دانشمند سیاستدان اور عمیق النظر رہنمائے قوم بھی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں گزشتہ واقعات کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ملک میں ایک منظم بغاوت اور مسلح سازش کا انکشاف اور ہٹلر کا بروقت اس کا استیصال کرنا، آسٹریا میں نازیوں کی بغاوت اور جرمن گورنمنٹ کا مصالحانہ رویہ اس کے تدبر کی بہترین مثالیں ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ خود اس کے مقرر کردہ افسروں نے جو نہایت معتمد اور باثر رہنماؤں میں شامل تھے۔ اس کے سیاسی اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی ایک خوفناک سازش کی اور ہٹلر نے نہایت حیرت انگیز پھرتی سے اس کا بالکل قلع قمع کر دیا۔ یہاں تک کہ تمام جرمن قوم سے ایک بھی آواز اس کے خلاف نہ اٹھی۔ خود مقتول افسروں کے حامیوں نے سرِ انقیاد خم کیا۔ اور کیا آسٹریا کے خونیں واقعات نے تمام یورپ کو اس کے خلاف نہیں کر دیا تھا! اطالوی اور فرانسیسی اخباروں نے اس پر اشتعال انگیز حملے کئے۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ نہایت پُر امن۔ بے حس اور غیر مشتعل

اس کے بعد جرمنی ابھی ان انقلاب انگیز واقعات میں گھرا ہوا تھا۔ کہ پریذیڈنٹ فان ہنڈنبرگ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ملک کی نازک حالت دیکھتے ہوئے اس نے فوراً پریذیڈنٹ کے ذمہ دارانہ فرائض کو اپنے سرلیا اور ۱۹ اگست کے استصواب عام میں اپنی قوم کی عام اجازت حاصل کرکے ثابت کردیا۔ کہ اس کی قوم اس کو پہچانتی ہے اور وہ ہمیشہ اُس کی متابعت کرے گی مسولینی نے روم میں داخل ہونے وقت ایک تقریر میں کہا تھا: میں جانتا ہوں۔ ملک کو کسی دوا کی ضرورت ہے اور میں اس کو استعمال کررہا ہوں"۔ لیکن ہٹلر نے کہا کہ میں اس "مردِ بیمار" کا علاج کرسکتا ہوں۔ میرے پاس اس کے مرض کی دوا ہے۔ کیا تم مجھے اجازت دوگے کہ اس کا استعمال کروں"۔ اور قوم نے اُسے اجازت دی۔ اُسے اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اس کے احکام بجا لائی۔ اور وہ آج ان کی راہ نمائی کررہا ہے۔ قوم کی تنظیم۔ قوم کی خوشحالی اور قوم کی وسعت کی طرف ——

گناہ سے خطاب

اے نیکیوں کے جنم داتا! لوگ ہمیشہ تجھے اختیار کرکے پچھتائے۔ نادان سمجھ نہ سکے کہ تجھ میں ان کے لئے کیا سبق پوشیدہ ہے تو نہ ہوتا تو نیکی کو کون سمجھتا۔ کون اس کی قدر کرتا میری روح بےچین تھی کسی چیز کی تلاش میں۔ اے گناہ وہ چیز میں نے تجھ میں پائی۔ اگر میں تیرے دربار میں باریاب نہ ہوتا۔ تو اس سیدھے راستے کو جو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن پر خدا کی رحمتیں نازل ہوئیں کیونکر پاتا۔

اے راہ خدا پر چلنے کی ہدایت کرنے والے تو نے راندۂ بارگاہ ہوکر بھی کس قدر عروج حاصل کیا۔ ہر وہ شخص جو تیرے آغوش میں آیا تو نے اُسے دکھ کے نشتروں سے اتنے کچوکے دیئے کہ آخر وہ اپنے خواب عیش سے بیدار ہوکر زندگی کی پاک و صاف شاہراہ پر چل نکلا۔ تجھ میں لذت تھی۔ تلخ۔ آہ وہ تلخی جس پر لاکھ شیرینیاں قربان! اگر تلخی نہ ہوتی تو نیکی کی شیرینی کو میں کیونکر پاتا۔ یہ تیری ہی تلخی ہے جو اس مٹھاس کو میٹھاس بنائے ہوئے ہے۔

لوگ کہتے ہیں تو شیطان کا فریب ہے۔۔۔ مگر میں کہتا ہوں تو خدائے رحمٰن و رحیم کا خاص عطیہ ہے اگر شیطان فریب ہوتا تو تیری یاد خطاکار روح کو بےکل نہ کرتی اور نظام عصبی کو پراگندہ کرکے ہمیں عیش و عشرت کے خوابِ شیریں سے نہ چونکاتی۔ اگر شیطان کا فریب ہوتا تو ہماری روح کو بےقرار بناکر نیکی کی راہ ڈھونڈنے کے لئے نہ اکساتا۔ تو خدا کا عطیہ ہے تو اس کی یاد دلاتا اور اس کی راہ دکھاتا ہے تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن پر خدا نے اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔ اس لئے اے نیکیوں کے جنم داتا! تیرا وجود لائق ستائش ہے۔

سرپرستانی نگار

تعلیم ہیڈمسٹرس

تجلیات

مری نگاہیں بت آشنا ہیں ذرا انہیں پاکباز کر دے
نقاب رخ سے الٹ کے برہم طلسم رنگ مجاز کر دے

مری فغاں ہائے نیم شب پر نثار کون و مکاں کے نغمے
الٰہی میرے نفس نفس کو تو نالۂ جاں گداز کر دے

ابھی تو اے قصہ گو شب زندگی کی تاریکیاں ہیں باقی!
عجیب ہے داستان الفت اسے خدارا دراز کر دے

مری نگاہوں میں نور بھر دے مری رگوں میں سرور بھر دے
مجھے غم عشق دے کے دونوں جہان سے بے نیاز کر دے

اگر گرائے نہیں شکایت اگر اٹھائے کرم ہے اُس کا
مجھے تو ہر حال میں ہے تسلیم جو مرا کارساز کر دے

نہیں ہے موقوف اس کی رحمت مری ہی سجدہ ریزیوں پر
خدا کی یہ دین ہے جسے سربلند وہ بے نیاز کر دے

مری نوا ہائے ساز دل کو عطا ہو سوز و گداز ایسا
کہ ذرے ذرے کو ایک دنیائے درد و سوز و گداز کر دے

میں تو ہی تو ہوں تو میں ہی میں ہے اگر تو پھر امتیاز کیسا
عجیب یہ راز ہے الٰہی مجھے بھی آگاہ راز کر دے

اثر ہے بے برگ و ساز لیکن بلند تر ہے مقام اس کا
ہے مرد حق آشنا خدا اور بھی اُسے سرفراز کر دے

اثر صہبائی

نئی دکان

انسان بیمار ہو تو قسما قسم کے غیر ضروری سوالوں پر ضرورت سے زیادہ غور کر لیتا ہے مثلاً اسی سوال پر کہ زندگی کیا ہے؟ تندرست آدمی کو غور کی فرصت کہاں؟ وہ تو عملی طور پر زندہ جواب یہ دیتا ہے کہ اگر انسان ایڈیٹر ہو تو زندگی یہ ہے کہ ہر روز کسی بھائی ایڈیٹر کو یا کم از کم گورنمنٹ کو دو چار گرما گرم سنا دیں کسی خود سر لیڈر کی مرمت کر دیں، اپنی من بھاتی روحانی غذا کے دو ہرے لگا دیں اور جو اس رائے سے متفق نہ ہوں۔ انہیں زندہ در گور کر دیں۔

اگر انسان تاجر ہو تو زندگی یہ ہے کہ سستا خریدیں مہنگا بیچیں اور بچت سے کروڑوں پر کروڑے اور محلوں پر محل بنواتے چلے جائیں اور لوگوں سے بھی سنیں، خود بھی کہیں کہ محنت کا پھل ہے، اللہ کا فضل ہے۔

اگر انسان معلم ہو تو زندگی یہ ہے کہ کوڑ مغز کا ماتھا اور ماسٹر صاحب کا بید آئے دن اور ہر سال یہاں تک کہ کتابیں ادھر ادھر بکیں، امتحانوں کے پرچے دیکھنے کی فیس آئے، ڈائرکٹر محکمہ تعلیم تعریف کریں اور صوبے بھر میں نام ہو۔

گویا تندرستی کو اس سوال سے کہ زندگی کیا ہے کوئی خاص حکیمانہ دلچسپی نہیں یا یوں کہئے کہ حکمت (فلسفہ) بیماروں کا مشغلہ ہے۔ مگر حال ہی میں علم النفسیات کے ایک ماہر کی کتاب نظر سے گذری ہے جو اس زریں اصول کو ٹھکراتی نظر آتی ہے۔ یہ ماہر سچے معنوں میں شفاء الملک ہیں۔ بیمار جسموں کا علاج خیالات کی مرہم پٹی سے کرتے ہیں اور بے انتہا کامیاب ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پوشیدہ اور فراموش شدہ حسیات کے دھوبی ہیں۔ پہلے چھپے انسانی احساسات کو سرنگ لگا کر باہر نکال لاتے ہیں پھر ان کو جمع شدہ کثافت و غلاظت سے الگ کرتے ہیں اور جب یہ نکھرے ہوئے احساسات اپنا عکس خود دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مریض سے کہتے ہیں کہ چلو چھٹی اور واقعی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر تو اعتراض نہیں مگر جب ان ماہر صاحب کے علاج کے فلسفے پر غور کرتا ہوں (آج کل طبیعت کچھ نادرست ہے) تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا نکلی اور ہم محض اردو خواں ابھی تک اپنی پرانی ادھیڑ بن میں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر ان ماہر صاحب کا صرف ایک نظریہ پیش کرتا ہوں۔ اگلے وقتوں کے لوگ (یعنی ہم محض اردو خواں) تو یہ سوچا کرتے تھے کہ کیا جھوٹ بولنا کبھی جائز ہو سکتا ہے مگر ان ماہر صاحب کا خیال اس کے لگ بھگ ہے کہ بعض خاص حالات میں سچ بولنا چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ یہ اتنی موجبِ رضائے خدا ست کا پتنگ اس نفاست سے انہوں نے کاٹا ہے کہ واہ واہ واہ کرتے چچا سعدی کے

دروغ مصلحت آمیز کا گلا بیٹھ گیا ہے۔

حضرت ماہر صاحب فرماتے ہیں کہ بقا بعد از مرگ (روحِ انسانی کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ) کو یوں تو کوئی باور کریگا مگر آج کل یورپ میں جو سینکڑوں پیرانِ نود سالہ و صد سالہ موجود ہیں وہ موت کے انتظار میں کیا سوچیں ؟ کیا ان کے لئے یہ بہترین خوش رکھنے والا طریقہ نہیں کہ وہ یہ باور کرلیں کہ صرف جسم ہی مریگا۔ روح کو ہمیشہ بقا رہے گی اور اگر یہ بہتر طریقہ ہے تو پھر کیوں اس پر اصرار نہ کیا جائے۔ یہ اعتقاد نہایت لابدی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب کا ارشاد گویا یہ ہے کہ مذاہب کا پہلا آخری اور تمام تر مقصد یہ ہے کہ وہ دلخوش کن فریبوں کا خوبصورت مجموعہ ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر حضرت اسی پر اکتفا کرتے تو خیر گزرتی۔ مگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شباب کے مذہب سے ایام پختہ کاری کا مذہب قطعی الگ ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنے عمر کے مختلف مدارج کے لئے مذاہب کا فرض ہے کہ مختلف پیرایوں میں فریب کاری کی خدمت سرانجام دیں۔ ان حضرت کی کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کیا یورپ میں مذاہب کی کوئی نئی دکان تو کھلنے والی نہیں کہ ہر موسم، ہر قد، ہر رنگ، ہر قابلیت اور ہر عمر کے لئے مذہب کا تن زیب وہاں مہیا کردیں۔ اگر یہ دکان چل نکلی تو پھر فیشن کی ستم کاریاں غضب ڈھائیں گی۔

کاش ہندوستان کوئی ایسا سودیشی سورما (مہاتما کی دکان بند ہونے والی ہے) پیدا کردے جو یورپ کی اس نئی دکان کے کھلنے سے پہلے ہی ہندوستان میں یہ کاروبار چلا کر دکھلا دے۔ ہر قسم کے مذہبی تفرقے مٹ جائیں۔ مختلف مذاہب والے لڑتے اسی لئے ہیں کہ ہر شخص بجائے خود سچے دل سے یقین کرتا ہے کہ میرا رہنما راستی کا واحد ٹھیکہ دار تھا اور جو مجھ سے متفق نہیں ان کا راستہ غلط ہے مگر یہ ماہر صاحب تو فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے اس کے حسبِ حال دروغ راستی نما کی ضرورت ہے گویا اب اناالحق کی بجائے یہ نئی معرفت نکلنے والی ہے کہ

اناالکذب

اور ہر شخص دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم سب جاتم ہیں۔ اخوت انسانی کا یہ نیا سبق یورپ ہی کو مبارک ہو ہم پنجابی اردو خوانوں کے لئے تو اپنے پرانے پیرا چھے ہیں کہ کھاتے ہیں مگر کم از کم کبھی کبھار یہ بھی تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ۔ یہ کیا یورپ کا تمسخر ہے کہ خود فریبی کا لطف اٹھاؤ ؟ حضرت اکبر تو فرما گئے کہ

اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں مگر میں تو درگاہ الٰہی میں دن رات یہ دعا کرتا ہوں کہ یوروپین دماغ میں یورپین بم پھٹیں کہاں ہم غریب صدق دل سے پارسائی پر مرنے والے اور کہاں یہ خراباتی کہ جامۂ پارسائی کو بازاری مگر ضروری پہناوا بیان کرتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ علم کی اور عالم کی سچے دل سے عزت کرتے تھے مگر یورپ والے علم کو اور عالم کو جسمانی خوشی کا غلام تصور کرتے ہیں اور وہاں کے عالم خود اس نئی طرز کے موید ہیں۔ لعنت بہ کارِ شیطان!

مکرر

مگر کہیں یہ نہ ہو کہ یورپ والے ہی سچے ہوں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

"سہ کرر"

کچھ بھی ہو۔ مگر یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ کاش یہ نئی دکان سب سے پہلے ہندوستان میں ہی جاری ہو۔ غیرتِ ہندی اور حب الوطنی کا زبردست تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ اواگون موت کے بعد ہو یہ صورت ہو جائے کہ اس زندگی کے اندر ہی اندر جو آج بنگالی اور برہمو ہے وہ کل سکھ اور پنجابی ہو اور جو کل پارسی اور بمبئی کا سیٹھ تھا۔ وہ آج سرحد کا پٹھان ہو اور یہ تغیر و تبدل اس سرعت سے ہو کہ میاں بیوی کو اور بچے ماں باپ کو نہ پہچان سکیں۔ انگریز زبانیں سیکھتے سیکھتے عاجز آجائیں اور گھبرا کر یہاں سے چل نکلیں۔ کیا ہی لطف رہے کہ جو ایک دن پنڈت ہو وہ دوسرے دن چمار اور تیسرے دن والئی ریاست کے روپ میں نظر آئے۔ پھر تو کسی کو شبہ کی گنجائش نہ رہے کہ ہندوستانی اصل میں سب ایک ہیں۔

فلک پیما

صبح کی چڑیا

صبح کی چڑیا گاتی ہے۔

صبح کے آنے سے پہلے ہی پہلے جب کہ ابھی رات کا افق آسمان کو اپنی ٹھنڈی کالی کالی کنڈلی میں لپیٹے ہوتا ہے اس چڑیا کو صبح کا پیغام کون آکے دیتا ہے؟

صبح کی چڑیا! مجھے بتا کہ کیسے آسمانوں اور پتوں کی دوہری رات کے اندر سے وہ تیرے خواب میں در آیا مشرق کا وہ پیغام بر؟

دنیا نے تیری بات نہ مانی جب تو چلائی کہ "سورج چلا آتا ہے رات ہو چکی ہے"۔

اے سونے والے جاگ!

اپنی پیشانی کو جو روشنی کی پہلی کرنوں کی منتظر ہے۔ برہنہ کر دے اور صبح کی چڑیا کا ہمنوا ہو کر ایک مسرور ایمان کے ساتھ گیت گا!

گلچیں

غزل

ناکامیوں سے تلخ مزہ زندگی کا تھا
ادنیٰ سا اک اثر یہ تری برہمی کا تھا

لکھے تھے ہم نے خطِ شکستہ میں کچھ حروف
خط کیا تھا اک پیام شکستہ دلی کا تھا

وہ بھی ترے تغافلِ بے جا پہ مر مٹا
ابتک جو دل شریک مری زندگی کا تھا

بے لطفیٔ حیات کی تصویر تھی خزاں
ہر غنچہ آئنہ مری افسردگی کا تھا

اے پیکرِ غرور تجھے کچھ خبر بھی ہے
وقتِ خرام زیر قدم دل کسی کا تھا

غارتگرِ شکیب ہوئی وہ نگاہ بھی
دار و مدار جس پہ مری زندگی کا تھا

رکھی تھی شمعِ گور سرہانے بجھی ہوئی
دھندلا سا ایک رخ وہ مری بیکسی کا تھا

جس نے ہمارے لوٹ لئے سب حواس و ہوش
وہ اک مظاہرہ تری غارتگری کا تھا

تھیں شوخیاں بھی حسن کی ہمرنگِ اضطراب
احساس جب کسی کو مری بیدلی کا تھا

واقف نہیں تفاوتِ موت و حیات سے
مقصود ہی کچھ اور مری زندگی کا تھا

سوجھا نہ کچھ فریبِ محبت میں عندلیب
دل جس کو جانتے تھے وہ ناوک کسی کا تھا

عندلیب شادانی

میکسم گورکی

ملتِ احمر کا مایۂ ناز مفکر

انیسویں صدی کا نصفِ آخر صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ دہقانی اشتراکیت کا خیال روسی اذہان سے بتدریج محو ہو رہا تھا۔ کسانوں کی جگہ کارخانوں کے مزدوروں نے حاصل کر لی۔ روسی افسانہ نگار کی توجہ کسان سے منعطف ہو کر مزدور کی زبوں حالی و واژگوں بختی میں مرکوز ہو گئی۔ کارل مارکس کے افکار نے اس کی قدیم "حزبی اشتراکیت" کا خاتمہ کر دیا۔

اس زمانہ کے گلستانِ ادب میں گورکی نے بادِ نسیم کا کام کیا۔ شباب مستقل مزاجی اور فکرِ جدید کے ساتھ گورکی اس کے ایوانِ ادب میں داخل ہوا ——— شاید کرسئی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے لئے

الیکسنر پیشکوف گورکی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی انتقال کر گیا۔ ابھی وہ چھوٹی عمر کا ہی تھا کہ اس کے دادا نے اُسے ایک کفش دوز کے یہاں نوکر کرا دیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ کر ایک جہاز میں ملازم ہو گیا۔ جہاز پر بھی وہ بہت عرصہ تک نہ رہا ——— قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مستقبلِ قریب کا ادیب اتنے عرصے تک دنیا کی نظروں سے روپوش رہے۔

گورکی کے ذہنی تلاطم نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ روس کی سرحدوں پر آوارہ پھرتا رہے خانہ بدوشی کی اس سیاحت کو اس نے سنہ ۱۸۹۱ء میں قلمبند کیا۔ یہی اس کی پہلی تصنیف تھی، اور چند تصانیف کے بعد گورکی کی شہرت اکنافِ عالم میں پھیل گئی۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لینے کی وجہ سے اُسے اپنی مادرِ وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ روس کو چھوڑ کر وہ اٹلی میں اقامت پذیر ہوا۔ جہاں اُس نے چند کتب تصنیف کیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد گورکی دوبارہ روس میں داخل ہوا۔

روس کی یہ عظیم الشان ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اپنی غیر فانی تصانیف "ماں" "خوفزدہ" اور "دوسرے شعلے" سے اکنافِ عالم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

جس طرح اٹھارھویں صدی کے وسط میں وکٹر ہیوگو کے افکار نے نوجوان قلوب میں ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ ٹھیک اسی

طرح اس انشا پرداز کے خیالات تمام دنیا کے نوجوانوں کو حیاتِ نو کا سبق دے رہے ہیں۔

گورکی بالعموم مجلسی دائرہ کے اُن فراموش کردہ افراد کی المناک داستانوں کو قلمبند کرتا ہے۔ جو زندگی کے حقیقی معنوں سے ہی ناآشنا ہوں اور جن کے قلوب مانے کے کھردرے پن سے بے حس ہو چکے ہوں۔

گورکی درحقیقت ایک ادبی جراح ہے۔ اس کے افکار ہر دماغ میں چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اُس کی بیان کی ہوئی داستانوں کی صحیح تصویریں وہاں منقش ہو جاتی ہیں۔

غریب کسانوں اور مزدوروں کے لامتناہی مصائب و نوائب بیان کرنے میں جو ملکہ اس مفکر کو حاصل ہے شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُسے خود زمانے کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا تھا۔ یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایک روز گورکی نے اپنی بڑھتی ہوئی تکالیف سے تنگ آکر خودکشی کا اقدام کیا۔ گو بعدازاں پستول کی آہنی گولی اُس کے سینے سے نکال لی گئی اور وہ موت کے سرد پنجوں سے بال بال بچ گیا مگر اس کاری زخم کا اثر اب تک موجود ہے ۔۔ اُس کی چھاتی سے خون آنا ابھی تک بند نہیں ہوا۔

ان افسانوں میں جن میں گورکی نے مظلوم انسانوں کی دردبھری داستانیں پرازجوش طریقہ میں قلمبند کی ہیں، ماتا جاسوس اور چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ، شامل ہیں۔

اِن افسانوں کی طرزِ تحریر لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی ہوئی دماغ پر نقش ہو جاتی ہے ــــ یہی گورکی کا کمال ہے جو اسے زمانۂ حال کے ادیبوں کی فہرست میں ایک بلند رتبہ دلواتا ہے۔ گورکی کے افسانوں میں اس کے کردار ہمیشہ اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس زمانہ میں جب وہ ایک جہاں گرد کی حیثیت سے تھا اُسے اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

گورکی کی شوکتِ تحریر، ندرتِ بیان اور زورِ قلم کا اندازہ "ماتا" کے پہلے باب کے منظرِ افتتاحیہ سے ہو سکتا ہے جس میں وہ زشت رو، گرسنہ اور تھکے ہوئے مزدوروں کی کارخانے میں آمد کو ایسے پُراثر الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی بیکسی کی ایک صاف تصویر کھنچ جاتی ہے۔

"ہر روز کارخانہ کی سیٹی مزدوروں کی غلیظ اور دھوئیں سے پُر فضا میں کانپتی ہوئی آواز میں غراتی، جس پر بھاپ کے غلام اپنے چھوٹے اور بدنما گھروں سے نکلنا شروع ہو جاتے۔ غمگین چہروں کے ساتھ وہ خوفزدہ وحشیوں کی طرح تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلتے۔ ان کے اعضا ناکافی نیند کی وجہ سے اکڑے ہوئے ہوتے۔ صبح کی دھندلی روشنی میں وہ تنگ گلیوں اور کچی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اس سنگین پنجرہ کی طرف بڑھتے جو اُن کے استقبال کا منتظر ہوتا ــــ جس کی بیسیوں زرد،

بھدی اور چوکور آنکھیں کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک کو روشن کر رہی ہوتیں۔ کیچڑ کے چھینٹے اُن کے پیروں پر اس طرح گر رہے ہوتے گویا ان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ فضا بھدی خواب زدہ آوازوں اور گالیوں سے معمور ہوتی، ان کے استقبال کے لئے مشینوں کی بھاری گڑگڑاہٹ اور بھاپ کی غیر مطمئن چیخ پکار ہوا میں تیر رہی ہوتی۔

یہ مزدوروں کی کارخانے کی طرف روانہ ہونے کی تصویر ہے ان کی واپسی کا حال گورکی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"شام کے وقت جب سورج غروب ہو رہا ہوتا اور سرخ کرنیں گھروں کی کھڑکیوں پر چمک رہی ہوتیں۔ کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کی مانند باہر پھینک دیتا۔ اب وہ پھر انہی بازاروں سے اپنے دھوئیں میں لپٹے ہوئے چہرے اور گرسنہ دانتوں کی چمک کی نمائش کرتے اور مشین کے تیل کی غلیظ بو کو پھیلاتے ہوئے گزرتے مگر اب ان کی آوازوں میں خوشی کی جھلک پائی جاتی ——— مشقت کی سزا اس دن کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ آرام کی چند گھڑیاں اور روکھا سوکھا کھانا گھر پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔

دن کارخانہ نگل گیا اور مشین نے اُن انسانوں کے اعضا سے حسب ضرورت طاقت چوس لی۔ اس طرح ایک مکمل دن زندگی سے جذب کر لیا گیا جس کا کوئی نشان باقی نہ رہا ———"

کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کی مانند باہر پھینک دیتا" لکھتے وقت گورکی کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ وہ چند الفاظ میں ہی اُن مزدوروں کی قابلِ رحم حالت بیان کر جائے جو دن بھر کی مشقت کی وجہ سے چور چور ہو رہے تھے۔

گورکی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مرصّع اور پر اثر الفاظ کی جستجو میں رہتا جو لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے ہوئے دماغ پر منقش ہو جائیں۔

کسی بوٹ پر کیچڑ یا برف کے نشان، پیانو کے چھیڑے ہوئے پردے، دہقانوں کی بھدی گفتگو، سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک اور اسی قسم کے حقیر حادثات گورکی کے قلم سے اس پر اثر انداز میں بیان کئے جاتے ہیں کہ وہ ہمیں اُن گہرائیوں تک لے جاتے ہیں جہاں رومانی افسانوں کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں حقیقی زندگی سے روشناس کراتا ہے خواہ ہمیں اُس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو۔ جو اُس کے افسانوں سے متعلق ہوتی ہے۔

اُس کی تصانیف نے ہماری آنکھوں کے سامنے روسی زندگی کی ایک قلمی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے جس سے عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

"ماتا" کا تبصرہ بجائے خود ایک طویل مضمون کا محتاج ہے اگر وقت نے اجازت دی تو فرصتِ آئندہ میں اس کے

متعلق کچھ اور بیان کرنے کی سعی کروں گا۔

"چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" (ہمایوں کے افسانہ نمبر میں یہ افسانہ شائع ہو چکا ہے) میں جو بلا شک وشبہ گورکی کے مختصر افسانوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گورکی مظلوم انسانوں کی نفسیات قلمبند کرنے کی خاطر بسکٹ بنانے والے مزدوروں کی پر از الم زندگی بیان کرتا ہے جو صبح سے لے کر شام تک ایک تنگ و تار کوٹھڑی میں کام کرتے ہیں جس بھٹی کے سامنے یہ چھبیس مزدور دن بھر کام کرتے اُسے گورکی نے ان پُر اثر الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

"صبح سے لے کر شام تک بھٹی جہنم کی طرح دہکتی رہتی اور اس کی سرخ شعاعوں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا گویا ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا۔

وہ بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی جو اپنے بڑے حلق سے آگ اُگل رہا ہو یا ہمارے سامنے جہنم کی آگ کی طرح جھلسا دینے والے گرم سانس لے رہا ہو اور ہمارے غیر مختتم کام کا اپنی پیشانی کے دو سیاہ و تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر رہا ہو ——— یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے ——— آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحم کے جذبہ سے عاری ہوں"۔

اس افسانے میں چھبیس نشت بد غلیظ مزدوروں کی ایک حکایت بیان کی گئی ہے جو ایک حسین دوشیزہ ٹینا کی محبت میں گرفتار تھے۔ وہ محبت کیسی تھی اور کیوں پیدا ہوئی؟ ——— اس کے جواب کے لئے گورکی کے اپنے الفاظ موجود ہیں:

"ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے۔ خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو"۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی:۔

"گو زندان ایسی مشقت نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا مگر پھر بھی ہم انسان تھے ——— اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی بغیر کسی کی پرستش کئے زندہ نہیں رہ سکتے تھے"۔

اسی افسانے میں کسی دوسری جگہ گورکی مزدوروں کی زبان سے یہ کہلواتا ہے:۔

"ہم چاہتے تھے کہ کسی شے سے محبت کریں اور اب چونکہ ہمیں وہ چیز جسے ہم ڈھونڈتے تھے مل گئی تھی اس لئے اس سے الفت کرتے"۔

گورکی کی فن کاری کے نمونہ کے لئے اسی کہانی کی چند اور سطور پیش کرتا ہوں:۔

"ہم تعداد میں چھبیس تھے ——— چھبیس متحرک مشینیں ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں

کے لئے میدہ تیار کرتے "۔

"چھبیس متحرک مشینیں" لکھتے وقت گورکی کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ وہ اُن چھبیس مزدوروں کی نفسیات کو جو صبح سے لے کر شام تک آہنی مشینوں کی طرح کام کرتے صرف تین الفاظ ہی میں بیان کر جائے۔ "چھبیس متحرک مشینیں" پڑھتے وقت ان مزدوروں کی لامتناہی محنت و مشقت اور بے بسی کی ایک تصویر کھچ جاتی ہے۔

گورکی زندہ ہے اور گو ان دنوں وہ اکثر بیمار رہتا ہے مگر پھر بھی اس نے اپنا قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ گورکی کی تقریباً تمام تصانیف انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان میں سے چند گجراتی اور مرہٹی کا لباس بھی پہن چکی ہیں۔ مگر مقام تاسف ہے کہ اردو زبان میں ابھی تک اس مایۂ ناز ادیب کی کوئی تصنیف منتقل نہیں ہوئی۔ لاہور کے ایک جریدہ میں "مدر" کا ترجمہ قسطوں میں شائع ہو رہا ہے۔ جو ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ اس میں گورکی کے اندازِ بیان کی لطافت اور خوبی یکسر مفقود ہے ؀

سعادت حسن

غزل

اک حال پر اب اپنا دلِ زار نہیں ہے
جو حال ہے وہ قابلِ اظہار نہیں ہے

درکار ہے اک شغل تقاضائے جنوں کو
اور میرے گریباں میں کوئی تار نہیں ہے

اے دل نہ ہو مایوس کبھی راہِ وفا میں
یاں کوششِ ناکام بھی بیکار نہیں ہے

دل میں ہے ترے حسنِ تصور کی تجلی
اب میری شبِ تار شبِ تار نہیں ہے

کس درجہ جنوں خیز ہے ہنگامہ ہستی
افکار ہیں اور حاصلِ افکار نہیں ہے

اے کاظمی کیا چیز یہ دردِ محبت،
کیا کہیئے کوئی محرمِ اسرار نہیں ہے

عبدالحی صدیقی کاظمی

عالمِ جمال

آغاز

ساقی سے ہے ابتدائے میکش / عشرت ہے انتہائے میکش

خودی میں فنا ہے موج مے کی / ہستی ہی نہیں ہے اور شے کی

صہبائے جمال چھا رہی ہے / خوشبوئے وصال آ رہی ہے

بے پردہ جمال میکدہ ہے / جلوؤں کے جلو میں آئنہ ہے

ساقی کے سوا نہیں ہے کوئی / باقی کے سوا نہیں ہے کوئی

آنکھوں سے عیاں ہے مے پرستی / اپنا ہے جمال اپنی ہستی

آئینہ ہے سامنے نظر کے / خورشید ہے روبرو قمر کے

ہے اپنی نظر میں آپ ساقی / یا اپنی سحر میں آپ ساقی

پنہاں ہے بہار رنگ و بو میں / مفہوم نہاں ہے گفتگو میں

یہ کچھ بھی نہیں شہود ہی ہے / کچھ اور نہیں نمود ہی ہے

جلوے ہیں نقاب کو اٹھائے / نظارے حجاب کو اٹھائے

تخلیق بہار ہو رہی ہے / مخلوق نثار ہو رہی ہے

جس سمت نظر اٹھا کے دیکھا / منظر وہ تمام میکدہ تھا

اٹھنے لگیں حسن کی گھٹائیں / چلنے لگیں خلد کی ہوائیں

ہونے لگی بارشِ تجلی / عالم ہے نگارشِ تجلی

اک کیف ہے، مستئ دو عالم / شیرازۂ ہستی دو عالم

میخانہ بدوش ہر نظر ہے / ساقی کے جمال کا اثر ہے

ہر جلوہ کدہ ہے ایک پرتو / ہے رنگ برنگ ایک ہی ضو

گلزار و بہار و ابر و مہتاب / مستی و سرور و بادۂ ناب

میخانہ ہے اک ہزار راہیں / راہیں ہیں جدھر پڑیں نگاہیں

تاروں میں چمک ہے روشنی ہے / ذروں میں جھلک ہے روشنی ہے

ہر سمت ہے نور کا مرقع / کھینچے کوئی طور کا مرقع

ایک ایک نظر ہزار جلوے / میخانہ، طرب، بہار، جلوے

تحمید

اے عقلِ صد جمال ساقی! / تمثیل تری محال ساقی

پانچ آئینے یہ حواسِ خمسہ / منہ دیکھ رہے ہیں اپنا اپنا

ہر مرحلہ حواس گم ہے / منزل ہیں، رہِ قیاس گم ہے

ہے آئنہ بے حسی کی مورت / خود بھول گیا ہے اپنی صورت

اللہ اللہ ذات تیری / کرتے ہیں طلب صفات تیری

جلووں کا ترے پتا نہیں ہے / حسن راز آشنا نہیں ہے

دیکھے نہ تجھے جمال تیرا / ہے جلوہ فگن! کمال تیرا

معلوم ہوا، نہیں رسائی / خود اپنی نظر، نظر نہ آئی

تلاش

بے پردہ تجھے اگر نہ پائیں / پردے نے نگاہیں ڈھونڈ لائیں

رستے کا پتا ہے کہکشاں کیا / وادئ طلب ہے آسماں کیا

کہتی ہیں یہ جنتیں شفق کی / فردوس ہیں منزلیں افق کی

کرتے ہیں رہبری ستارے / سالک اگر ہمتیں نہ ہارے

تاروں میں بڑھا چلا ہی جائے / منزل نہ پتا، چلا ہی جائے

تا حشر رہیں یہی نظارے   دیتی رہیں حسرتیں سہارے

ڈھونڈے تجھے جنتوں میں جا کر   رحمت کی فضاؤں میں سما کر

مفہومِ کائنات

اے کاش کوئی بتا دے مجھ کو   اے کاش کوئی بتائے مجھ کو

مکتوبِ جہاں میں کیا لکھا ہے   اس نامۂ جاں میں کیا لکھا ہے

بیٹھا ہوں لئے کتابِ فطرت   روشن ہیں مظاہرِ حقیقت

موتی، پانی، حباب، شبنم   اشکالِ نمودِ بحرِ عالم

مینائے بہار لالہ و گل   صہبائے نگارِ ساغرِ دل

اس بزمِ جہاں کا ذرّہ ذرّہ   اس کون و مکاں کا ذرّہ ذرّہ

ایک ایک ورق ہے معرفت کا   ایک ایک سبق ہے معرفت کا

عرفاں کے لئے کھلا ہو سینہ   عالم ہے، بہرِ نظر سفینہ

عالمِ شوق

پیغام و سلام ہو رہے ہیں   عشاق کے کام ہو رہے ہیں

ہر سمت چمک رہی ہے بجلی   نظروں میں ہے عالمِ تجلی

بندہ کہ حضور میں فنا ہے   باقی ہی نہیں ہے کھو گیا ہے

سجدہ ہے یہی کہ یا الٰہی!   نظروں میں ہے تیری ہی خدائی

جاتے ہیں کہیں، رواں ہیں آنسو   امیدوں کا کارواں ہیں آنسو

تاروں سے ہیں شب کے اس کی باتیں   ہوتی ہیں یہ کب سے اس کی باتیں

پیغامِ وصال، ہر سحر ہے   اک جامِ جمال ہر سحر ہے

اللہ! کرم غریب دل پر   انسان کے اس عجیب دل پر

دیوانہ کہیں بھٹک نہ جائے   مستانہ کہیں بہک نہ جائے

دنیا کو نہ یہ سمجھ لے منزل   بہکے نہ کہیں سمجھ کے منزل

ہماری غفلت

مدہوش! تجھے خبر نہیں ہے   غافل ہے ادھر نظر نہیں ہے

صورت یہ ہوئی ہے مسخ تیری   فطرت یہ ہوئی ہے مسخ تیری

کرتی ہے جو غیر کی پرستش   کعبے اور دیر کی پرستش

اخلاق ہیں، گندگی غرض کی   عادات ہیں، بندگی غرض کی

انسان میں کہاں غرض پرستی   جوہر میں کہاں غرض پرستی

للہ انسان! آدمی بن   ظلمت کو چھوڑ، روشنی بن

فضیلتِ انسانیت

مسجودِ ملک ہے جو ذات تیری   انسان! بڑی ہے بات تیری

عالم ہے ترے لئے مسخّر   ماہ و خورشید و نجم و اختر

کہتے ہیں جسے نظامِ عالم   واللہ یہ انتظامِ عالم

سب تیرے لئے ہیں ابنِ آدم!   کس درجہ کرم ہیں اے مکرّم!

تو اس کے لئے ہے، سب ہے جس کا   عالم میں تو منتخب ہے جس کا

تو عبدِ خدا، خدائی تیری   عالم میں ہے بادشاہی تیری

انسانِ کامل

تو اپنے کمال پر نظر کر   بے مثل، مثال پر نظر کر

روشن ہے جس سے بزمِ دوراں   وہ جلوۂ بے نقابِ عرفاں

تصویرِ کمالِ آدمیّت   بے مثل، مثالِ آدمیّت

وہ شمعِ حریمِ راز و اسرار   وہ پیکرِ صد ضیا و انوار

تابندۂ محفلِ نبوت   زیبندۂ منزلِ نبوّت

رحمت ہے خدا کی نام جس کا   کوثر ہے فیضِ عام جس کا

رحمت سے بھری ہوئی نگاہیں   جنت کی دکھا رہی ہیں راہیں

جاں بخشِ جہاں اشارہ جس کا   سو زندگی، اک نظارہ جس کا

قرآن لئے ہوئے، تکلّم   عرفان لئے ہوئے، تبسّم

کیا بات لئے ہوئے خموشی   وہ ذات لئے ہوئے خموشی

ایمان کو کر دیا منوّر   اے جلوۂ سیرتِ مطہر!

اخلاق ہیں یا کرم سراپا　　اوصاف ہیں یا ارم سراپا
آئینہ، جمالِ مصطفےٰ کا　　واللہ، کمال ہے خدا کا
جس گل کی بہار انبیا ہوں　　پھر اس کے لئے قیاس کیا ہوں
اے دل! یہ مثالِ آدمیت　　ظاہر ہے کمالِ آدمیت
محبوبِ خدا ہے، کامل انساں　　مطلوبِ خدا ہے کامل انساں
مسرور ہے، انتہا ہماری　　پُر نور ہے، انتہا ہماری
لازم ہے ہمیں کریں ترقی　　عاقل کو ہے اک اشارہ کافی
منصب اپنا نہ چھوڑ بیٹھیں　　قسمت اپنی نہ پھوڑ بیٹھیں
ہر چند کہ ختم ہے نبوت　　مسدود نہیں درِ وراثت
منزل ہے نظر میں، دور کیا ہے　　ہمت ہو بلند، طور کیا ہے
فطرت ہی ہماری رہنما ہے　　مذہب ہی ہمارا اک خدا

اپنی طرف نظر

اب اپنی طرف بھی کچھ نظر ہو　　شرمندہ حیات خود نگر ہو
صد حیف کہ تو نہیں ہے انساں　　لاریب کہ تو نہیں ہے انساں
مقصود ترا، خدا پرستی　　تو پوج رہا ہے، اپنی ہستی
بندہ ہے وہی، جو پاک خو ہو　　سجدہ ہے وہی، جو باوضو ہو
آئینہ نہیں، جو ہو مکدر،　　وہ سینہ نہیں، جو ہو مکدر
وہ پھول نہیں، نہ جس میں بو ہو　　مقبول نہیں، جو زشت خو ہو
قطروں میں مثال مصطفےٰ ہے　　تو اپنے طرف تو دیکھ کیا ہے
تجھ میں بھی کوئی پاک خو ہے　　آئینہ وہ دیکھ روبرو ہے
اے شمع! نہ کر ہوا پرستی　　فطرت ہے، تیری خدا پرستی
اے شعلۂ عشقِ مشتعل! جا　　جا اپنی حقیقتوں سے مل جا
اے جان! تجھے ہے نور ہونا　　اک عکسِ جمالِ طور ہونا

محتاج زمانہ وہ صمد ہے　　کثرت کی زبان پر احد ہے
خلقت ہے نثار، ایک ہی پر　　لاکھوں کا مدار، ایک ہی پر
اے دل! تو اسیرِ غیر کیوں ہے　　اے کعبہ! خرابِ دیر کیوں ہے
اے نیست! فنائے ہست ہو جا　　باطل ہیں! حق پرست ہو جا
اے مستِ الست! مست ہو جا　　بالائے بلند و پست ہو جا
کرنا ہے تجھے تو کام کر جا　　اسلاف کا اپنے نام کر جا
ہونا ہے تجھے بلند فطرت　　کمیاب ہے ارجمند فطرت

اللہ تجھے کامیاب کر دے
گویا کی زبان میں اثر دے
گویا وہ کوئی غزل سنا دے　　دنیا کے غموں کو جو بھلا دے

غزل

اونچا ہے نظر کا آشیانہ　　کیا خوفِ حوادثِ زمانہ
میخانے میں آ کے گھر بنا لے　　معصوم حوادثِ زمانہ
ہر رنج و خوشی کا ایک حاصل　　ہر ساز میں ایک ہی ترانہ
اربابِ کمال کا مربی　　آغوشِ حوادثِ زمانہ
جتنا ہو بلند ذوقِ سجدہ　　اتنا ہے بلند آستانہ
ہر صوت و صدا کو ایک کر لے　　وحدت کا سنائے پھر ترانہ
رخصت اے عقل و ہوش! رخصت　　آتا ہے کسی کا آستانہ
ساقی کی طرف نظر ہے سب کی　　ہے دور میں ساغرِ زمانہ

سُن تنگ نظر کی کچھ نہ گویا
رحمت کا بڑا ہے شامیانہ

گویا جہاں آبادی

مخلص دوست

ایک دن صبح ہی صبح بوڑھے پن چوہے نے اپنے بل سے سر نکالا۔ اُس کی چمکدار آنکھیں موتیوں کی سی تھیں اور مونچھیں بھورے رنگ کی اور سخت سخت۔ اور دُم ایسی جیسے کالے ربڑ کا لمبا سا ٹکڑا ہو۔ بطخوں کے چھوٹے چھوٹے بچے جھیل میں ادھر اُدھر تیر رہے تھے اور دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جزائر کینیری کی گانے والی سنہری چڑیوں کا کوئی جھنڈ ہے۔ سفید سفید پَروں اور سرخ سرخ ٹانگوں والی ماں انہیں پانی میں سر کے بل کھڑے ہونے کی مشق کرا رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار سبق دیتی اور ساتھ ساتھ یہ فقرہ دہرائے جاتی "یاد رکھو، جب تک پانی میں سر کے بل کھڑے ہونا سیکھ نہ لوگے تمہارا شمار اعلیٰ طبقے میں کبھی نہیں ہو سکے گا"۔ لیکن بچے کوئی توجہ نہ دیتے۔ وہ بہت ہی چھوٹے تھے۔ کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ سوچتے کہ بھلا اعلے طبقے میں شمار ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بوڑھا پن چوہا گرج کر کہنے لگا "کیسے سرکش بچے ہیں! ڈبو دو انہیں! یہ اسی قابل ہیں!!"

بطخ سہم کر کہنے لگی۔ "ہائے! ایسا نہ کہو۔ شروع میں ہر ایک سے یہی ہوتا ہے۔ تم کیا جانو۔ ماں باپ کے صبر کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے"؟

پن چوہا بولا "آہ۔ بھلا میں ماں باپ کے احساسات کیا جانوں۔ میں گرہستی آدمی ہی نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو کبھی پہلے ہی میری شادی ہوئی ہے اور نہ اب ہی اس کا ارادہ ہے۔ محبت! . . . محبت کافی اچھی چیز ہے لیکن اپنی جگہ۔ پر دوستی! ؟ دوستی کا رتبہ بلند تر ہے! سچ کہتا ہوں کہ دنیا میں ایک مخلص دوست سے زیادہ کمیاب اور عجیب تر کوئی چیز نہیں"۔

ایک سبز چڑیا نے جو قریب ہی بید مجنوں پر بیٹھی تھی کہیں یہ باتیں سن لیں اور کہنے لگی "براہ مہربانی یہ تو بتایئے کہ دو مخلص دوستوں پر فرائض کیا کیا عاید ہوتے ہیں"؟

بطخ بول اٹھی "ہاں ہاں میں بھی یہ جاننا چاہتی تھی"۔ . . . اور پھر تیرتی ہوئی جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر اپنے بچوں کو مثال کے ذریعے اچھی طرح سمجھانے کے لئے خود پانی میں سر کے بل کھڑی ہو گئی۔

پن چوہا چلا کر کہنے لگا "کیسا فضول سوال کرتی ہو! . . . . . ." اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولا "بیشک مجھے اپنے مخلص دوست سے یہی توقع ہوگی کہ وہ میرا وفادار رہے اور کیا!؟"

ننھی چڑیا ایک نرم سی شاخ پر جھولا جھولتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے نازک پر پھڑپھڑا کر کہنے لگی "پر اس کے بدلے تم ! کیا کرو گے ؟ تم !!"

پن چوہا کہنے لگا "میں نے نہیں سمجھا!"

"اچھا تمہیں اس موضوع پر ایک افسانہ سناتی ہوں"۔

"کیا افسانہ میرے متعلق ہے؟ اگر ہے تو سن لوں گا کیونکہ مجھے افسانوں سے بہت دلچسپی ہے"۔

چڑیا کہنے لگی "ہاں یہ تمہیں پر صادق آئے گا" اور وہ درخت سے نیچے اڑ آئی اور کنارے پر بیٹھ کر اس نے مخلص دوست کی کہانی شروع کی۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دنیا میں ایک آدمی رہا کرتا تھا، نہایت ہی دیانتدار رفیق اور چھوٹا سا ہنس نامی"۔

پن چوہا بات کاٹ کر کہنے لگا "کیا اس کی ہر بات نرالی ہوتی تھی"؟

چڑیا کہنے لگی "نہیں وہ صرف اسی بات میں نرالا تھا کہ اس کے گول گول چہرے سے ظرافت ٹپکتی تھی اور وہ بڑا رحمدل اور ہنس مکھ تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بالکل تنہا رہا کرتا، اور ہر روز اپنے باغ میں کام کیا کرتا تھا اردگرد کی تمام بستیوں میں کوئی باغ اتنا خوش نما نہیں تھا جتنا کہ ننھے ہنس کا۔ اس کے باغ میں جا بجا دمشق کا گلاب کھلا تھا کہیں نرگس تھی کہیں یاسمیں اور کہیں گل داؤدی۔ گل صد برگ نے تمام باغ کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور گیندے کے زرد زرد پھولوں نے تو تمام زمین زرد ہی کر رکھی تھی۔ موتیا کے پودوں میں اس قدر پھول آرہے تھے کہ پتہ تو کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ سورج مکھی کے پھول کی سمت گردش آفتاب کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتی اور وہاں اس قسم کے ہزاروں پھول تھے۔ جب ایک قسم کے پھولوں کا موسم ختم ہو جاتا تو دوسرے پھولوں کی بہار آجاتی اور جوں جوں مہینے گذرتے باغ میں رنگ رنگ کے پھول آنے لگتے۔ غرضکہ وہاں ہر طرف آنکھ کے لئے حسن اور دماغ کے لئے بھینی بھینی خوشبوئیں موجود تھیں۔

یوں تو ننھے ہنس کے اور بھی کئی دوست تھے لیکن سب سے زیادہ مخلص دوست ایک چوڑا چکلا اور گرانڈیل پنہارا تھا۔ اس کا نام ہوگ تھا اور وہ بڑا امیر تھا اور ہنس کا اتنا عزیز دوست تھا کہ اس کے باغ کی دیوار پر سے جھک کر بڑا سا گلدستہ یا کوئی میٹھی بوٹی یا اگر پھل کا موسم ہوتا تو آلوچوں یا شاہدانوں سے اپنی جیبیں بھرے بغیر کبھی نہ جاتا۔

ہوگ کہا کرتا "مخلص دوستوں کی ہر چیز مشترک ہوا کرتی ہے" اور ننھا ہنس جواب میں سر ہلا کر مسکرا دیتا اور یہ سوچ کر دل ہی دل میں نازاں ہوتا کہ میں نے کیا ہی اچھا دوست بنایا ہے جس کے خیالات اس قدر شریفانہ ہیں۔

بعض اوقات پڑوسی یہ دیکھ کر ضرور حیران ہوا کرتے کہ امیر پسنھارا بدلے میں ہنس کو کیوں کوئی چیز نہیں دیتا، حالانکہ اس نے اپنی چکی کے کمرے میں آٹے کی سو بوریاں جمع کر رکھی ہیں اس کے علاوہ اس کے پاس چھ دودھیل گائیں اور اونی بھیڑوں کا ایک بڑا سا گلہ بھی ہے۔ لیکن ہنس نے کبھی ایسی فضول باتیں سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اسی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات تھی ہی کیا کہ وہ ان تمام عجیب غریب باتوں کو نہایت توجہ سے سنا کرے جو پسنھارا سچی اور بے غرض دوستی کے متعلق اُسے سنایا کرتا۔

ننھے ہنس نے اپنے باغ میں کام شروع کر دیا تھا۔ موسم گرما اور بہار و خزاں کا زمانہ تو خوشی خوشی گزر گیا، لیکن جب موسم سرما آگیا اور اس کے پاس منڈی کو لے جانے کے لئے نہ کوئی پھول رہا نہ پھل تو سردی اور بھوک دونوں نے مل کر اُسے بہت ستایا اکثر وہ شام کا کھانا کھائے بغیر ہی صرف دو تین سوکھی ہوئی انجیریں یا کوئی اور خشک میوہ کھا کر سو رہتا۔ یہ بات تو ایک طرف رہی سردیوں میں وہ بالکل تنہا بھی رہ جاتا کیونکہ پسنھارا پھر کبھی اس سے ملنے نہ آتا۔

وہ اپنی بیوی سے کہا کرتا" برفبار موسم میں ننھے ہنس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں جب کوئی تکلیف میں ہو تو اُسے سب کچھ اکیلے ہی چپ چاپ برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے روز روز مہمان بن کر جانا اور ناحق کسی کو تنگ کرنا! فائدہ کیا؟ دوستی کے متعلق کم از کم میرا نظریہ تو یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہے بھی بالکل درست۔ لہذا بہار سے پہلے تو میں وہاں کسی طرح جانے کے لئے تیار نہیں۔ بہار آ لینے دو۔ تب جاؤں گا۔ اس وقت وہ بیچارہ مجھے ایک بڑی سی بسنتی پھولوں کی ٹوکری دے کر ذرا خوش ہو جائے گا۔ میں تو اس کی خوشی چاہتا ہوں"۔

اس کی بیوی اپنی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے، صنوبر کی خشک شاخوں کی آگ تاپتے ہوئے جواب دیتی"۔ اُف! اتنی بے غرض محبت!؟ دوستی کے متعلق تم نے کیسے اچھے اصول بنا رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خود پادری بھی ایسی اچھی باتیں جیسی تمہاری ہیں کبھی نہ کر سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُسے تو رہنے کے لئے تین منزلوں کا مکان میسر ہے اور ہمیں نہیں۔ وہ چھنگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنتا ہے اور تمہاری کوئی بھی نہیں"۔

پسنھارے کا چھوٹا لڑکا کہنے لگا۔" آہا! ایک بہت اچھی بات سوچی ہے ۔ ۔ ۔ کیا ہم ننھے ہنس کو یہاں نہیں بلا سکتے اگر اس بیچارے کو مصیبتیں پڑی ہیں تو اُسے یہیں بلا لو۔ میں اپنی آدھی ربڑی اُسے دیدیا کروں گا اور اُسے اپنے سفید سفید خرگوش دکھایا کروں گا۔ اچھی اماں! تم بہت اچھی ہو! اُسے ضرور بلا لو میرا دل اس کے لئے بہت اداس ہو رہا ہے"۔

پسنھارا غصے سے گرج کر کہنے لگا۔" تو!! تُو تو ہے ہی بڑا نادان! معلوم نہیں تجھے سکول بھیج بھیج کر ہمیں کیا فائدہ ہوا تُو! اُنے وہاں سے کچھ نہ سیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرض کرو خدانخواستہ ننھے ہنس کو یہاں بلا بھی لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ

اگر ہمارا سب کچھ دیکھ لے گا۔ وہ ضرور دل میں سوچے گا۔ دیکھو یہ تو آگ بھی تاپ رہے ہیں کھانا بھی اچھا کھاتے ہیں۔ سرخ شراب کا بڑا سا مٹکا بھی موجود ہے۔ بہرحال وہ ہم سے حسد کرنے لگ جائیگا اور حسد! ؟ جانتے ہو کیسی چیز ہے؟ وہ چیز ہے جو فطرت کا ستیاناس کر ڈالے۔ میں کبھی ننھے منس کی فطرت خراب نہ ہونے دوں گا کیونکہ میں اس کا بہترین دوست ہوں میں ہمیشہ خیال رکھوں گا کہ کہیں وہ طمع اور حرص کے جال میں نہ پھنس جائے۔ بالفرض وہ یہاں آ بھی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ آٹا ادھار مانگے، اور ادھار کے تو میں پاس نہ پھٹکوں۔ دوست اور چیز ہے اور آٹا اور چیز انہیں خلط ملط نہیں ہونا لفظوں ہی کی مثال لے لو ہر لفظ کے علیحدہ علیحدہ معنی ہوتے ہیں بس اس مختصر سی مثال سے آگے ُرب اندازہ لگا لو اور یہ تو عام باتیں ہیں ہر کوئی انہیں جانتا ہے"۔

پنہارے کی بیوی جو کی شراب کا ایک بڑا سا گلاس غٹاغٹ چڑھاتے ہوئے بولی" بخدا کیسی اچھی باتیں کرتے ہو۔ لطف آجاتا ہے۔ میں تو سچ مچ اونگھ ہی گئی تھی۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گرجے میں بیٹھ کر وعظ سن رہی ہوں"۔

پنہارا کہنے لگا" بات دراصل یہ ہے کہ کام تو ہر ایک آدمی بُرا بھلا کر ہی سکتا ہے لیکن ایسے آدمی دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں جو گفتگو بھی اچھی جانیں ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں گفتگو بہت زیادہ مشکل چیز ہے" اور غالباً یہی ان الفاظ کے خاتمہ پر اس کی درخشت نگاہیں میز کی دوسری طرف اپنی چھوٹے بیٹے پر جم گئیں جس نے شرم کے مارے گردن جھکا لی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جب اُس سے کچھ اور بن نہ آیا تو وہ" چائے دو، چائے بھی دو" ہی پکارنے لگا۔ خیر اس کا کیا ہے وہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ اس پر کوئی گلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

جب کہانی یہاں تک پہنچی تو پن چوہا کہنے لگا" بس کہانی ختم؟"

سبز چڑیا کہنے لگی" نہیں ہرگز نہیں ابھی تو شروع ہی ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا" اچھا پھر سن لو کہ تم زمانے سے بہت پیچھے رہ گئی ہو۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ آج کل کا ہر اچھا افسانہ گو پہلے کہانی کا انجام بتاتا ہے۔ پھر آغاز کی طرف آتا ہے اور سب سے آخر اس کا درمیانی حصہ بیان کرتا ہے۔ یہ نیا فیشن ہے یہ سب باتیں کل میں نے ایک نقاد کی زبانی سنی تھیں جو جھیل کے گرد ایک نوجوان کے ساتھ چکر لگا رہا تھا وہ بہت دیر تک اسی موضوع پر بحث کرتا رہا اور مجھے اس کی باتیں بالکل درست معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس نے ایک نیلی عینک لگا رکھی تھی اور کثرت مطالعہ سے اس کے سر کے بال تک اڑ چکے تھے اور جب بھی نوجوان کوئی بات کہتا تو وہ پکار اٹھتا" اونہہ! لغو!"۔ . . . اچھا مہربانی کر کے تم اپنی کہانی شروع کرو۔ مجھے وہ پنہارا بہت ہی پسند ہے۔ خود مجھ میں بھی تمام لطیف حسیات موجود ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں میں گہری ہمدردی ہونا قدرتی بات ہے"۔

چڑیا پہلے ایک ٹانگ پر اور پھر دوسری پر پھدک کر کہنے لگی "اچھا سنو۔ جب جاڑا ختم ہوا اور زرد گلاب نے کھل کھل کر ستاروں کی شکل اختیار کرنی شروع کی تو ایک دن اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ " لو میں ننھے ہنس سے ملنے چلا ہوں"۔

بیوی کہنے لگی" ہیں؟ چلے ہو؟ بڑے رحمدل ہو! ہمیشہ اوروں کا ہی خیال رکھتے ہو۔ وہاں ساتھ پھولوں کے لئے بڑی ٹوکری لیتے جانا۔ بھولنا مت"۔

پس پنہارے نے لوہے کی ایک بڑی مضبوط زنجیر سے پن چکی کے بادبان اکٹھے کر کے باندھ دیئے اور اپنے بازو میں ٹوکری لٹکائے پہاڑ سے نیچے اترا اور ہنس کے پاس جا کر کہنے لگا" ہنس جی سلام! اچھے تو ہو؟" ہنس بیلچہ ہاتھ میں لئے سر جھکائے کسی کام میں مصروف تھا۔ اُسے دیکھتے ہی باغ باغ ہو گیا اور مسکرا کر کہنے لگا " آیئے! آیئے! آیئے!!!

" کہو ہنس جاڑے کا موسم کیسے گزرا"؟

" خوب گذرا۔ . . . تم بہت اچھے ہو جو میرا حال پوچھتے ہو۔ مجھ پر بڑا سخت وقت آیا تھا۔ خیر گذر گیا۔ اب تو بہار آگئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ میرے پھول بھی خوش ہیں"۔

پنہارا کہنے لگا" ہنس جی ہم موسم سرما میں اکثر تمہاری ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم حیران ہوا کرتے کہ معلوم نہیں تمہارا کیا حال ہو گا"۔

ہنس نے جواب دیا" تمہاری مہربانی۔ مجھے تو کچھ کچھ شک ہو چلا تھا کہ کہیں تم مجھے بھول تو نہیں گئے"۔

پنہارا کہنے لگا ہنس تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔" دوستی" اور" بھول" دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہی تو" دوستی" کی عجیب و غریب خاصیت ہے۔ شاید تم زندگی کی شاعرانہ باتوں سے واقف نہیں ہو اور ہاں بھئی ذرا سننا دیکھو تو تمہارے گلاب کے پھول کس قدر دلفریب نظر آرہے ہیں"!

ہنس کہنے لگا" ہاں واقعی بہت خوبصورت ہیں اور میرے لئے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات تو یہ ہے کہ ہیں بھی کافی۔ اب انہیں منڈی میں لے جا کر مجسٹریٹ کی لڑکی کے پاس فروخت کر دوں گا اور پھر اُن روپوں کی ایک پہیئے کی ہاتھ گاڑی پھر سے خرید لوں گا"۔

ہوگ کہنے لگا۔ پھر سے خرید لوں گا؟ کیا مطلب؟ کیا تم نے پہلی ہاتھ گاڑی کو بیچ ڈالا تھا؟ بڑی بیوقوفی کی"۔

نہیں بات دراصل یوں تھی کہ اسے بیچ ڈالنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ جانتے ہو نا کہ موسم سرما میرے لئے بڑا سخت وقت تھا یقین مانو میرے پاس روٹی خریدنے کے لئے بالکل کوئی پیسہ نہیں تھا۔ پہلے تو میں نے اتوار کو پہننے والے کوٹ

کے نقری بٹن اتار کر بیچ ڈالے پھر چاندی کی زنجیر پھر اپنا حقہ اور آخر کار ہاتھ گاڑی بھی بک گئی لیکن اب تو میں ان سب کو واپس خریدنے ہی والا ہوں"۔

پنہارا کہنے لگا" ہنس میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالوں گا۔ اس کی کچھ بہت زیادہ مرمت نہ ہوگی۔ ایک طرف تو یقیناً ناکارہ ہو چکی ہے اور پہیئے کے ارے کچھ ہی خراب ہیں۔ پھر بھی میں تمہیں وہ دے دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بڑی فیاضی سے کام لے رہا ہوں اور بہت سے لوگ مجھے بیوقوف بھی سمجھیں گے کہ میں نے کیوں یہ خواہ مخواہ تمہیں دے دی لیکن میں دنیا کے اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں۔ میرے خیال میں" فیاضی" ہی دوستی کی روح ہے۔ علاوہ ازیں میرے پاس ایک نئی ہاتھ گاڑی بھی موجود ہے۔ مطمئن رہو کہ میں تمہیں اپنی گاڑی دے دوں گا"۔

ہنس کا گول گول سرور چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور وہ کہنے لگا" اچھا؟ واقعی تم بہت فیاضی سے کام لے رہے ہو۔ میں بڑی آسانی سے اس کی مرمت کرا سکوں گا۔ گھر ہی میں لکڑی کا ایک تختہ پڑا ہے"۔

پنہارا کہنے لگا" لکڑی کا تختہ؟ مجھے اپنے مکان کی چھت کی مرمت کے لئے اسی کی ضرورت تھی۔ چھت میں بڑا سا سوراخ ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ابھی سے اسے بند نہ کر لیا تو تمام غلے کو نم آجائے گا۔ خوب موقع پر تم نے اس کا ذکر کر دیا! کیسی عجیب بات ہے کہ ایک اچھا کام کرنے سے دوسرا اچھا کام بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ہاتھ گاڑی دی اور اب تم مجھے اپنا لکڑی کا تختہ دے رہے ہو۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ گاڑی کی قیمت تختے کی قیمت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ خیر چلو اس ذکر کو جانے دو۔ سچے دوست ایسے حساب نہیں کیا کرتے۔ مہربانی کر کے تختہ ذرا جلد لے آؤ تاکہ آج ہی میں اپنا کام شروع کر دوں"۔

ہنس کہنے لگا" ضرور۔ ضرور"۔ اور دوڑ کر ایک تختہ گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔

پنہارا اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا" بڑا چھوٹا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ چھت کی مرمت کے بعد تمہاری گاڑی کے لئے کوئی لکڑی نہیں بچے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا اس میں ذرا کوئی قصور نہیں اور ہاں اب چونکہ میں نے تمہیں ہاتھ گاڑی دے دی ہے تم مجھے اس کے بدلے کچھ پھول دو۔ یہ لو ٹوکری۔ دیکھو اسے اوپر تک بھرنا"۔

ہنس نے ذرا افسوس سے پوچھا" بالکل اوپر تک"؟ کیونکہ یہ ٹوکری فی الحقیقت بہت ہی بڑی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے یہ پوری کی پوری بھر دی تو پھر منڈی کے لئے کوئی پھول نہیں بچے گا۔ اس کا بہت ہی جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے نقرئی بٹن واپس خریدے۔

پنہارا کہنے لگا" ہاں پوری ہی بھر دو۔ میں نے تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی ہے اب میں نہیں جانتا کہ تم سے کچھ پھول مانگنا کوئی بڑی بات ہے۔ ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو لیکن دوستی اور پھر سچی دوستی میں اس قسم کی خودغرضی کا دخل

نہیں ہونا چاہیئے۔"

ہنس نے چلا کر جواب دیا "میرے پیارے دوست! میرے بہترین دوست! تم میرے باغ کے تمام پھول لے لو۔ کوئی دن ایسا نہیں آئیگا جب مجھے تمہاری خوشنودی حاصل کرنے سے پہلے نقرئی بٹن درکار ہوں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد ہنس دوڑ کر چلا گیا۔ اپنے زرد گلاب کے تمام خوبصورت اور نفیس پھول توڑ کر پنہارے کی ٹوکری بھر لایا۔

"ننھے ہنس خدا حافظ" کہ کر پنہارے نے تختہ اپنے کاندھے پر رکھا اور پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لے کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔

ننھا ہنس بھی جواب میں "خدا حافظ" کہہ کر نلائی کرنے لگا۔ گاڑی ملنے کے خیال سے اُسے بہت مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنی ڈیوڑھی کی دیوار پر بیلیں چڑھانے کے لئے میخیں جڑ رہا تھا کہ اُسے سڑک پر سے پنہارے کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔۔ اس نے سیڑھی پر سے ایک چھلانگ لگائی اور دوڑ کر باغ کی دیوار پر سے نیچے جھانکنے لگا۔

پنہارا آٹے کی ایک بڑی سی بوری اپنی پیٹھ پر اٹھائے کھڑا تھا۔ کہنے لگا "پیارے ہنس اور ننھے ہنس! میری بجائے تم آٹے کی بوری منڈی کرلے جاؤ گے؟"

ہنس کہنے لگا "اے ہے افسوس سچ مانیو آج تو میں بڑا مصروف ہوں۔ مجھے آج اپنی تمام بیلیں چڑھانی ہیں۔ سب پھولوں کو پانی دینا ہے اور گھاس کے تختوں پر لوڑھی (ROLLER) پھیرنی ہے۔"

پنہارا کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہوگے پر ذرا سوچو تو سہی کہ میں تو تمہیں اپنی گاڑی دے دینے والا ہوں اور تم ہو کہ میری بات تک ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ ہوگی یہ بڑی بے مروتی۔ آگے تم جانو۔"

ہنس چلا کر کہنے لگا "ایسے الفاظ زبان پر نہ لاؤ۔ میں تمہارے ساتھ بے مروتی کیوں کروں گا۔ چاہے کوئی تمام دنیا ہی نہ میرے ہاتھ میں دے دے"۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر دوڑ کر ٹوپی لینے اندر چلا گیا اور بڑی سی بوجھل بوری کاندھوں پر اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔

اس دن سخت گرمی تھی اور سڑک پر غضب کی گرد بھی اُڑ رہی تھی۔ ابھی وہ میل کے چھٹے پتھر تک بھی نہ پہنچا تھا کہ اُسے اس قدر تکان محسوس ہونے لگی کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر دم لینے لگا۔ بہرحال اس نے بڑی مستعدی سے اپنا سفر جاری رکھا۔ آخرکار منڈی آگئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد بوری بہت اچھی قیمت پر بک گئی اور وہ فوراً اس خیال سے گھر لوٹ آیا۔ کہ کہیں زیادہ دیر ہوگئی تو راستے میں ڈاکو حملہ نہ کر دیں۔

جب رات کو ہنس سونے لگا۔ تو اُس نے کہا "آج کا دن بہت محنت و مشقت میں گزرا پر خیر اچھا ہؤا میں نے اس کی بات تو مان لی۔ دراصل ہے بھی وہی میرا عزیز ترین دوست اس کے علاوہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی بھی تو دینے والا ہے"۔

دوسرے دن ہوگ سویرے ہی سویرے اپنی بوری کی قیمت لینے آپہنچا لیکن ننھا سا ہنس کل کی طویل اور کٹھن مسافت سے اس قدر چور چور ہو چکا تھا کہ ابھی تک اس کی آنکھ نہ لگی تھی۔

پنہارا آکر زور سے کہنے لگا "مجھ سے پوچھتے ہو تو تم جیسا سست بھی کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سوچ لیتے کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں اور اس خیال سے تم زیادہ محنت کر سکتے تھے لیکن تم ہو کہ ابھی تک سو رہے ہو۔ سستی گناہ کبیرہ ہے اور کم از کم مجھ سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکتی کہ میرا کوئی دوست بھی کاہل ہو۔ برا نہ ماننا تمہیں بے تکلفی سے سب کچھ صاف صاف کہہ لیا ہے اگر میں تمہارا دوست نہ ہوتا تو یہ فقرے میرے خواب خیال میں بھی نہ آتے لیکن دوستی کا کیا فائدہ اگر کوئی کسی سے دل کی بات بھی نہ کہہ سکے۔ یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ان کی خوشامد کرے اور طرح طرح کے سبز باغ دکھائے لیکن سچا دوست ہمیشہ کڑوی ہی باتیں کہے گا۔ اُسے پرواہ نہیں ہوتی کہ میرے دوست کو یہ بات بُری معلوم ہوگی یا بھلی اور اگر وہ سچا دوست ہے تو یقیناً وہ کھری کھری کہہ سنانے کو ترجیح دے گا کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دوست کی بھلائی اسی میں ہے"۔

ننھا ہنس آنکھیں ملتا ہؤا بستر سے اُٹھ بیٹھا اور شب خوابی کی ٹوپی پرے پھینکتے ہوئے کہنے لگا "ہاں۔ ہاں اب مجھے بھی بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ میں بہت تھک گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر اور آرام کر لوں۔ پرندوں کے چہچہانے کی خوب آوازیں آرہی تھیں۔ تمہیں یہ پتا نہیں پرندوں کے گیت سننے کے بعد مجھ میں کام کرنے کی زیادہ طاقت آجاتی ہے"۔

پنہارا ننھے ہنس کی پیٹھ پر ایک تھپکی دے کر کہنے لگا "اچھا؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے جتنی جلدی ہو سکے اب کپڑے پہن لو میرے ساتھ پون چکی کو چلو چل کر چھت کی مرمت کرتے ہیں"۔

غریب ہنس باغ کا کام کرنے کیلئے پہلے ہی بڑا مضطرب تھا۔ کیونکہ دو دن سے اس کے پھولوں کو پانی نہیں ملا تھا لیکن وہ پنہارے کی بات ماننے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا بڑا ہی خیرخواہ اور مخلص دوست تھا۔

وہ نہایت ہی محجوب اور خائف سے لہجے میں ذرا ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا "اگر میں کہوں کہ میں سخت مصروف ہوں تو تم مجھے بے مروت تو نہیں سمجھو گے؟"

پنہارا کہنے لگا "یہ سوچ لو کہ میں اپنی ہاتھ گاڑی تمہیں دے رہا ہوں۔ اس کے بدلے اگر تم میرا یہ چھوٹا سا کام کر دو گے

تو پھر میں خود ہی کر لوں گا"۔

ہنس چلا کر کہنے لگا "نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا"۔ یہ کہہ کر وہ بستر پر سے زقند بھر کر اتر آیا اور کپڑے پہن کر پنہارے کے ساتھ چل دیا۔

وہ دن بھر وہاں کام کرتا رہا یہاں تک کہ سورج کے غروب ہونے کا وقت بھی آ پہنچا۔ اتنے میں پنہارا بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ کام کیسا ہو رہا ہے وہاں آن موجود ہوا اور نہایت خوش مزاجی سے کہنے لگا "ننھے ہنس اب تک چھت کی مرمت ہو گئی ہے یا نہیں؟"

ہنس نے سیڑھی پر سے اترتے ہوئے جواب دیا "ہاں بالکل ہو گئی"۔

پنہارا کہنے لگا عجیب بات ہے آدمی کو اپنے کام کی بہ نسبت دوسروں کا کام کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے"۔

ننھا ہنس نیچے بیٹھ گیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا "تمہاری گفتگو سننا ہی دنیا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے بہت ہی بڑی۔ مجھے افسوس ہے تو یہ ہے کہ معلوم نہیں ایسے روشن اور خوبصورت خیال جیسے تمہارے ہیں کبھی میرے بھی ہو سکیں گے"۔

پنہارا کہنے لگا "کچھ مضائقہ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤ گے لیکن تمہیں ذرا زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ ابھی تو تمہیں دوستی قائم رکھنے کی مشق ہی ہوئی ہے۔ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ اصول تمہاری عقل میں بھی آ جائے گا"۔

ہنس پکار اُٹھا "ہیں سچ مچ؟ تمہارا میری نسبت یہ خیال ہے!؟ ہائے کبھی میں بھی ایسا ہو جاؤں نا!"

پنہارا کہنے لگا "مجھے تو اس میں شک نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں چونکہ اس وقت چھت کی مرمت کر کے تم تھک گئے ہو بہتر یہی ہے کہ اب گھر چلے جاؤ اور آرام کرو۔ کل تمہیں پہاڑ پر میری بھیڑیں چرانی ہیں"۔

ننھے ہنس کو جواب میں چون و چرا کرتے ڈر لگتا تھا۔ ناچار چپ ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے ہی سویرے پنہارا اس کی جھونپڑی تک اپنی بھیڑیں ہانک لایا اور ہنس انہیں پہاڑ پر چرانے لے گیا۔ تمام دن بھیڑیں چراتے چراتے ضائع ہو گیا اور جب وہ واپس آیا تو تکان سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر گر کر اس طرح سویا کہ دوسرے دن سورج چڑھے ہی اس کی آنکھ کھلی۔

"آج باغ میں کام کے لئے کیسا سہانا وقت ہے"۔ کہہ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

لیکن کسی صورت بھی وہ اپنے پھولوں کی خبر نہ لے سکا کیونکہ اس کا دوست پنہارا ہمیشہ آ جاتا اور اُسے دُور دُور اپنے کاموں پر بھیج دیتا یا اُس سے پون چکی پر کام لیا کرتا۔

اکثر ننھا ہنس اپنے آپ کو بڑا ہی دکھی محسوس کرتا کیونکہ اس کے دل کو ایک یہ بھی غم تھا کہ کہیں اس کے پھول یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ میں نے انہیں بھلا دیا ہے اور ان کا دل ٹوٹ جائے لیکن پھر دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر بہلا لیا کرتا کہ آخر دنیا میں ایک مخلص تو ہے ہی نا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچتا کہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی دینے والا ہے یہ اس کی کچھ کم مخلصانہ فیاضی ہے۔

پس ننھا ہنس پنہارے کے کاموں میں لگا رہتا اور پنہارا اُسے دوستی کے متعلق طرح طرح کے سبز باغ دکھایا کرتا اور یہی باتیں ہنس اپنی نوٹ بک میں لکھ کر رات کو یاد کیا کرتا۔ کیونکہ اُسے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

اب یوں ہوا کہ ایک شام جب ہنس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا یکایک کسی نے دروازے کو مٹھیوں سے خوب پیٹا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات نہایت وحشتناک تھی اور آندھی کے تیز جھونکے جھپٹے چلے آتے تھے دراں سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے شیر غرا رہے ہوں۔ آندھی اس قدر غضبناک تھی کہ پہلے تو اس نے یہی جانا کہ طوفان ہی آگیا ہے لیکن جب دروازے کو پیٹنے کی آوازیں متواتر آنے لگیں تو ننھا ہنس یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا "شاید کوئی بیچارا مسافر ہے"۔

سامنے پنہارا اپنے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ایک چھڑی لئے کھڑا تھا۔

کہنے لگا "ننھے اور پیارے ہنس مجھ پر سخت مصیبت آن پڑی۔ میرا چھوٹا لڑکا سیڑھی پر سے گر پڑا ہے اور اُسے بہت چوٹ آئی ہے۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں عجیب مصیبت ہے وہ بہت ہی دور رہتا ہے اور رات بھی سخت اندھیری ہے۔ یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ میری بجائے تم بھی تو جا سکتے ہو۔ یہ بہتر رہے گا تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں مناسب یہی ہے کہ تم بھی اس کے بدلے میرے لئے کچھ کام کرو"۔

ہنس چلا کر کہنے لگا "یقیناً یقیناً تمہارا یہاں آنا میرے لئے باعث فخر ہے میں فوراً چل دیتا ہوں لیکن تم ذرا اپنی لالٹین مجھے دے دو۔ دیکھئے ہو رات کس قدر تیرہ و تار ہو رہی ہے کہیں میں کسی کھڈ میں نہ گر جاؤں"۔

پنہارا کہنے لگا "افسوس افسوس یہ تو میری بالکل نئی لالٹین ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا ہو تو میرا بڑا نقصان ہو گا"۔

ننھا ہنس کہنے لگا "اچھا جانے دو میں اس کے بغیر ہی چلا جاؤں گا"۔ چنانچہ اس نے اپنا کھال کا بڑا کوٹ کاندھے پر سنبھالا اور اپنی سرخ رنگ کی گرم ٹوپی اور گلے پر مفلر لپیٹ کر چل دیا۔

اُف کس قدر ڈراؤنا اور بھیانک طوفان تھا اور رات اس قدر اندھیری کہ ننھے ہنس کو بہ مشکل ہی راستہ نظر آتا۔ آندھی فراٹے بھر بھر کر چل رہی تھی اور ننھے ہنس کے قدم اپنی جگہ سے اکھڑ اکھڑ جاتے تھے لیکن وہ بڑا باہمت تھا تین گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ آخر ڈاکٹر کے مکان پر آپہنچا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ڈاکٹر نے شب خوابی کے کمرے کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا "کون ہے اس وقت"۔
"ڈاکٹر! میں ہوں — ننھا ہنس —"
پنہارے کا لڑکا سیڑھیوں پر سے گر گیا ہے اور اُسے بہت چوٹ آئی ہے پنہارے نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈاکٹر کو جلدی بلا لاؤ"۔

ڈاکٹر کہنے لگا "بہت اچھا!" اور پھر اس نے اپنے نوکروں سے اپنا فل بوٹ گھوڑا اور لال ٹین لانے کے لئے کہا اور نیچے اتر کر پنہارے کے مکان کی طرف چل دیا اور ننھا اس کے پیچھے لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔

طوفان بڑھتا ہی گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اتنے طوفان میں وہ گھوڑے کے ساتھ بھی نہ رہ سکا۔ اب اسے کچھ سوجھ نہ پڑتا کہ وہ کدھر جائے آخر وہ راستے سے بھٹک گیا اور اندھا دھند پھرتا پھراتا کہیں دلدلوں کی طرف جا نکلا۔ یہ ایک نہایت خطرناک جگہ تھی۔ جہاں جابجا عمیق کھڈ تھے۔ بیچارا ننھا ہنس یہیں ڈوب گیا۔ دوسرے دن اس کی لاش گڈریوں نے ایک بڑے سے تالاب میں تیرتی ہوئی دیکھی وہ اُسے اُٹھا کر اس کی جھونپڑی کو لے گئے۔

سب آدمی ننھے ہنس کے جنازے میں شریک تھے کیونکہ وہ بڑا ہی ہر دلعزیز تھا۔ ان سب میں پنہارا سب سے بڑا سوگی بنا بیٹھا تھا۔

وہ کہنے لگا "چونکہ میں اس کا عزیز ترین دوست تھا اس لئے جلوس میں سب سے آگے مجھے جگہ ملنی چاہیئے۔ پس وہ ایک لمبا سا کالا چغہ پہن کر ماتمی جلوس کے آگے آگے چلنے لگا اور بار بار اپنی آنکھیں ایک بڑے سے رومال سے پونچھتا۔

جب تجہیز و تکفین کی رسم ہو چکی تو لوہار کہنے لگا۔ "ننھے ہنس کی موت سے یقیناً ہم سب کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور پھر وہ سب سرائے میں آرام سے بیٹھ کر مصالحہ دار شراب اور میٹھے کیک کھانے لگے۔

پنہارے نے جواب دیا۔ "کچھ بھی ہو اصل نقصان تو مجھے پہنچا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے اُسے اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی تھی اور اب فی الواقع میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا کروں میرے لئے اس کا وجود مصیبت ہو چلا ہے اور مرمت اس کی اس قدر ہوگی کہ اگر میں اسے بیچنا چاہوں تو مجھے کوئی اس کا ایک آنہ بھی نہ دے۔ میں ضرور اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ کبھی کوئی چیز کسی کو نہ دوں۔ سخی ہونا بھی ایک عذاب ٹھیرا۔

ایک لمبے توقف کے بعد پن چوہا کہنے لگا "اچھا تو پھر ہوا کیا؟"
چڑیا کہنے لگی۔ "بس یہاں کہانی ختم ہوتی ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا "لیکن بیچارے کا کیا ہوا؟"
چڑیا نے جواب دیا "میں کیا جانوں کیا ہوا نہ کچھ مجھے اس کی پروا ہے"
پن چوہا کہنے لگا "تو ظاہر ہے کہ تمہاری فطرت میں کوئی ہمدردی موجود نہیں"۔
چڑیا کہنے لگی "شاید تم کہانی کے نتیجے پر غور کر نہیں کر رہے"؟
پن چوہا کہنے لگا "کس! پر غور نہیں کر رہا"؟
"نتیجے پر"۔
"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اس کہانی سے کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے"۔
"یقیناً"۔

پن چوہا نہایت غصے سے کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات تمہیں مجھے کہانی شروع کرنے سے پیشتر ہی بتا دینی چاہیے تھی" اگر تم ایسا کرتیں تو میں ہرگز تمہاری کہانی نہ سنتا اور اس نقاد کی طرح "اونہہ! لغو!" کہہ دیتا۔ تو اب بھی یہ کہہ کر اس نے اتنی اونچی آواز سے جتنی اس سے ممکن تھی گلا پھاڑ کر کہا "اونہہ!! لغو!!!" اور اپنی دم کو جھٹکا دے کر اپنے بل میں واپس چلا گیا۔

اور بطخ کچھ دیر بعد تیرتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "پن چوہے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس میں کئی خوبیاں ہیں اور میری کیا پوچھتے ہو۔ میرے احساسات تو ایک ماں کے سے ہیں اور جب میں کسی ایسے فرد کو دیکھتی ہوں جسے ہمیشہ ناکتخدا ہی رہنا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

چڑیا کہنے لگی "کہانی سنا کر شاید میں نے اسے خواہ مخواہ دق ہی کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اسے ایک ایسی کہانی سنا بیٹھی جس کا کوئی نتیجہ بھی نکلتا تھا۔

بطخ کہنے لگی "آہ ایسی باتیں کرنا ہمیشہ بڑی خطرناک غلطی ہوتی ہے"۔

اور مجھے بھی اس سے بالکل اتفاق ہے

(آسکر وائیلڈ)

مہدی علی خاں کرم آباد

غزل

رہے صدیوں سے تیرا میخانہ ساقی
خدارا، اک مجھے پیمانہ ساقی

وہ اٹھی ہے گھٹا، مہکیں وہ کلیاں
اٹھا لے جھوم کر پیمانہ ساقی

ہوائیں عود کی ہے آج خوشبو
ہر اک ذرہ ہے اک میخانہ ساقی

نشہ سا ہے زمیں سے آسماں تک
دو عالم بن گئے مے خانہ ساقی

عبادت میں ہے شامل آج کی شب
گناہ و لغزشِ رندانہ ساقی

فضائیں ہیں جوانی کی امنگیں
شفق میں سرخیٔ پیمانہ ساقی

چھلکتے جام ہم سے کہہ رہے ہیں
حدیثِ عشوۂ جانانہ ساقی

وہ ہلکا سا ترنم ہے ہوائیں،
ہوا جاتا ہے دل دیوانہ ساقی

کہاں کی خُلد، کیسی نارِ دوزخ
کہ ہے فرسودہ یہ افسانہ ساقی

وہی آزاد ہے دنیا میں جو ہو
اسیرِ تلخیٔ پیمانہ ساقی

اُبلتی ہے پیالوں سے مئے سُرخ
خدارا! نعرۂ مستانہ ساقی

جلال اِک رند ہے، درویش صورت
جھجکتا کیا ہے اک پیمانہ ساقی

جلال ملیح آبادی

افسانہ کی کہانی

خود اُسی کی زبانی

مکرمی حامد صاحب کا تقاضا ہے کہ افسانے کے متعلق کچھ لکھوں۔ لیکن مضمون ایسا دلچسپ ہو کہ بجائے خود ایک افسانہ بن جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کوئی ٹھوس علمی مضمون اتنا دلچسپ کیسے ہو سکتا ہے۔ موضوع سمجھ میں آ گیا۔ اُسے لکھنے بیٹھا لیکن ایک صفحہ لکھنے کے بعد پڑھا تو شروع سے آخر تک میری طرح خشک۔ کاٹ دیا۔ اور سوچا کہ اب آخر کیا علاج کیا جائے۔ اُسی دن رات کو کچھ احباب بیٹھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کا ذکر ہونے لگا۔ اُن کا مضمون مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ اُن کی کچھ میری زبانی۔ ذہن میں آیا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ افسانہ کی کہانی خود اُسی کی زبانی بیان کروں۔ میری زبان میں اتنا رس نہیں لیکن افسانہ بذاتِ خود ایک ایسی دلچسپ چیز ہے جس سے بچے اور بوڑھے کو برابر کی محبت ہے۔ اس لئے اُس کی زبان سے اُس کا افسانہ زیادہ شیریں معلوم ہو گا۔ خیالات اور اُن کی ترتیب میری ہے اور زبان "افسانہ" کی۔ اگر ناظرین محظوظ نہ ہوں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر کم ہے۔ اور اگر مضمون صرف دلچسپ ہے اور خشک فلسفیوں کے لئے اُس میں ٹھوس علمی معلومات کا ذخیرہ نہیں تو اس کے ذمہ دار حامد صاحب ہیں اس لئے کہ میں نے یہ طریقہ کم و بیش انہیں کی ترغیب سے اختیار کیا ہے۔

وقار

لوگوں کو میرے نام سے دلچسپی ہے ——— ہر شخص میرے نام پر جان فدا کرتا ہے۔ لیکن یہ کسی کو خبر نہیں کہ میں کہاں پیدا ہوا۔ کس ماں کا دودھ پیا اور کن گودوں پر پروان چڑھ کر آج اتنا بڑا ہوا کہ چھوٹا اور بڑا ہر کوئی میرے نام کا دم بھرتا ہے۔ چونکہ مجھے معلوم ہے کہ جن لوگوں کو مجھ سے دلچسپی ہے وہ میری رام کہانی کو بھی مزے لے لے کر سنیں گے اس لئے حرف بہ حرف آپ بیتی کہے دیتا ہوں۔ سنئے۔ آپ کا جی چاہے اُس سے عبرت حاصل کیجئے۔ چاہے اُسے ہنس کر ٹال دیجئے۔

دنیا کے سارے علموں اور فنوں کی طرح میری پیدائش بھی یونان میں ہوئی۔ میرے ظاہری حُسن کو دیکھ بڑے بڑے فلسفی ریجھے اور مجھے محبت اور شفقت کے ہاتھوں نے پالا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اُن کی طبیعتیں رنگینی سے بیگانہ تھیں۔ خشک فلسفہ اُن کی طبیعتوں پر چھایا ہوا تھا۔ تھوڑے دن تک تو خوب لاڈ چوچلے رہے مگر پھر دودھ کی مکھی کی طرح مجھے

یوں نکال کر پھینکا کہ قوم نے میرا نام تک بھلا دیا۔ میں اس آوارگی میں ہر طرف پھرا۔ پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں تھی مگر دل میں بچپن کی زنگیں تھیں۔ پاؤں تھکے۔ دل نہیں تھکا۔ خدا خدا کر کے ایک ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے لوگ حُسن کے دیوانے اور رنگینیوں کے متوالے تھے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ پر اُن کی جان جاتی تھی خدا اِن مصریوں کا بھلا کرے۔ انہوں نے مجھے بھی دیکھا اور قدر دانی کی مسند پر جگہ دی۔ ایمان کی بات ہے کہ میں نے اپنی طفلی کا ابتدائی زمانہ جس مزے سے یہاں کاٹا پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ قدر دانوں کے دلوں میں محبت کی مسند پر میری جگہ تھی۔ دلچسپی اور لطف میری پرورش کے لئے مقرر ہوئیں میں نے بھی خوب آرام سے ان کی گودوں میں پرورش پائی۔ رخساروں کی سرخی دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئی۔ اندرونی حُسن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب کیا تھا ہر کس وناکس کی نظریں پڑنے لگیں۔ فرانس والے ہمیشہ سے ایسی چیزوں پر جان دیا کئے ہیں۔ اُن کی نظریں پڑنے لگیں۔ میرا جی بھی ایک جگہ رہتے رہتے ایسا گھبرا گیا تھا کہ مصر کو چھوڑ کر فرانس پہنچا۔ فرانس والوں نے میرے وہ بناؤ کئے کہ دولھا بنا دیا۔ مجھے خود بھی اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ شباب کا زمانہ شروع ہو گیا شباب نے میری رنگیوں میں اور اضافہ کیا۔ انگلستان۔ جرمنی اور روس سے قدر دان آئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی طرف کھینچا۔ کچھ اس محبت سے بلایا کہ میں بھی ریجھ گیا۔ ایک ہی قدم میں انگلستان۔ جرمنی اور روس کی سیر کرنی شروع کی ہر جگہ نیا جامہ پہنا۔ ہر جگہ نیا سنگار کیا اور ہر جگہ ایک نئی پھبن اختیار کی۔ اب میری یہ حالت تھی کہ دن رات بھیس بدلنے سے کام۔ کبھی فرانسیسی جامہ اور کبھی انگلیسی کبھی جرمنی اور کبھی روسی۔ میری زندگی بڑے مزے سے کٹ رہی تھی۔

یہی زمانہ تھا کہ امریکہ والے دنیا کے گوشہ گوشہ کو چھانتے پھر رہے تھے۔ ہر شخص کے گلے میں ایک تھیلی کبھی یورپ کی سیر کی کبھی ہندوستان گئے۔ کبھی ایران کے آتش خانوں کی آگ سے دل روشن کئے اور کبھی چینیوں کی تصویروں کو دل پر نقش کیا۔ جہاں گئے وہاں سے آبدار سے آبدار موتی چُنے اور اپنی تھیلیوں کو بھرا۔ اپنے خزانوں کو اتنا مالا مال کیا کہ دنیا کی ہر قوم اُن کے سامنے ماند نظر آنے لگی۔ یہی زمانہ تھا کہ ان سیاحوں کی نظر مجھ پر پڑی۔ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر واہ ری قوم مجھے لے جا کر ایسی اونچی جگہ بٹھایا کہ میں زندگی بھر کی قدر دانیاں بھول گیا۔ فرانس اور روس کی محفلوں کی سرگرمیاں سرد نظر آنے لگیں۔ بچے اور بوڑھے ہر شخص نے مجھے آنکھوں پر بٹھایا۔ دل میں جگہ دی۔ مجھے بھی اس سرزمین سے ایسی محبت ہوئی کہ میں یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یورپ والوں نے میری اس شکل کی تصویریں کھینچیں اور انہیں اپنے ادبی نگار خانوں کی زینت بنایا۔ دنیا کے ہر حصہ میں میرا ڈنکا بجنے لگا۔ اب سنئے کہ اس شہرت کا کیا نتیجہ ہوا۔ اُن قوموں کے دلوں میں بھی میری محبت پیدا ہوئی جنہیں اب تک میری لطافتوں کا احساس تک نہیں

تھا۔ ایرانیوں نے ترکوں نے۔ ہندوستانیوں نے جھانک جھانک کر میرے جلوے دیکھنے شروع کئے۔ مگر میری بارگاہ تک آنے کی ہمت کسی کو نہ ہوتی۔ مجھے ان کے خلوص کا احساس ہُوا۔ میرا دل خود ان کی طرف کھنچنے لگا۔ مغرب کی محبت مشرق کی الفت سے بدل گئی۔ ایران۔ ترکستان اور ہندوستان کی سیریں شروع ہوگئیں مغرب کی داستان کچھ اتنی زیادہ دلچسپ نہیں۔ اس لئے میں نے اُس کی تفصیلوں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن میری مشرق کی داستان اس قدر دلکش ہے کہ اُس کا لفظ لفظ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے خصوصاً ہندوستان کا قصہ کچھ ایسا ہے کہ اُس میں اُلجھ کر پھر کہیں اور جانا مشکل ہے۔ دلچسپی بھی اس میں اتنی ہے کہ اُسے چھوڑنا داستان کو بدمزہ بنانا ہے اب ذرا کان لگا کر سنئے۔

جب میں نے ہندوستان میں پہلے پہل قدم رکھا تو یہاں اُردو زبان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مغرب کی جو چیز آتی تھی وہ اُس میں سمائی چلی جاتی تھی۔ شاعری اور اس کی روح پر مغرب کا اثر پڑ چکا تھا۔ تاریخ اور تنقید نے مغربی جامہ پہن لیا۔ ڈرامہ اور ناول پر مغربیت چھائی چلی جا رہی تھی۔ میں بھی جب پہلے پہل داخل ہُوا تو وہی مغربی کپڑے پہنے ہوئے۔ اُردو والے تو اس وقت مغرب کے فدائی بن ہی رہے تھے۔ میرا خیر مقدم نہایت خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ لیکن اب اسے میری بدنصیبی کہئے یا خوش قسمتی سمجھئے کہ جس زمانہ میں اُردو ادب پر مغرب اور مغربیت اپنا گہرا اثر کر رہی تھی۔ قوم نے مغرب کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اسلاف کے کارنامے۔ اُن کی صداقت۔ جوانمردی اور بہادری کے مرقع دھندلے ہونے چلے جا رہے تھے اور ہندوستانی ہر قدم پر۔ ہر بات میں۔ ہر کام میں۔ کھانے میں۔ پینے میں۔ چلنے میں۔ اُٹھنے میں اور بیٹھنے میں مغرب کی تقلید پر آمادہ تھے۔ اپنی تہذیب کی اچھائیوں کو بالکل بھلا دیا تھا۔ سچی بات ہے کہ ادب پر مغرب کا جو اثر پڑ رہا تھا وہ تو ہر حیثیت سے مفید تھا لیکن سوسائٹی کے دلوں پر اُس کا اتنا گہرا قبضہ نہ دیکھنے والوں کو اچھا لگ سکتا تھا اور نہ خود سوسائٹی کے لئے مفید ہو سکتا تھا اس لئے ملک کے ہر گوشہ سے اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ادیبوں نے شاعروں نے ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں نے جو کچھ لکھا وہ اسی مقصد سے کہ قوم کی اصلاح کریں۔ چونکہ یہ زمانہ ایسا تھا کہ میں نے دلوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میری ہر ادا لوگوں کو بھاتی تھی۔ میری صورت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ گدڑی میں بھی لوگ اُسے پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ افسانہ نگاروں نے مجھے بھی یہی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ میرے نازک اور قیمتی کپڑے میرے تن پر سے اتار کر پھینکے جانے لگے۔ ریشم اور سرج کے نازک اور خوش وضع کپڑوں کو بھاری اور بدقطع کپڑوں سے بدل دیا گیا۔ میرا بدن نزاکتوں کا عادی تھا۔ اُس سے بھلا یہ مصیبتیں کیسے اُٹھائی جاتیں۔ میرا جی

گھبرانے لگا۔ قدم قدم پہ مغرب کی لطافتیں اور اُن کی یاد دل کو ستاتی تھی۔ مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ مدتوں اس مصیبت کو بھرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ رنگ نہ روپ نہ وہ حسن نہ وہ لطافت۔ جسم اور روح میں تازگی اور شگفتگی کا نام نہیں۔ کسی نے مجھے پردہ اور اس کے مقاصد کے بیان کرنے کا آلہ بنایا۔ کسی نے میری زبان سے تعلیم کے فائدے بتائے۔ کسی نے فیشن کو برا بھلا کہا تو میری زبان سے مغربی وضع قطع اور اُس کے ظاہری حسن کو طعنے دیئے تو میرے لفظوں میں۔ میں سب کا بُرا، نہ خود مجھے اپنی زندگی پسند۔ نہ لوگوں کو میری صورت سے دلچسپی۔ انہیں مجھ سے نفرت اور مجھے اُن سے۔ غرض میری زندگی کا یہ زمانہ بُرا بُرا گذرا۔ اگر اس زمانہ کی میری ظاہری اور باطنی تصویریں دیکھنی ہوں تو سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ لو۔ جب مجھے وہ بھلی نہیں لگتیں تو کوئی دوسرا انہیں کیا پسند کرے گا۔ یہ تصویریں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا صرف ایسی ہیں جن میں مجھے ایسے کپڑوں میں ملبوس کیا گیا ہے۔ جن سے مغرب اور اس کی تہذیب کے بُرے خط و خال جھلکتے نظر آئیں۔

جب ذرا زمانے نے اور ترقی کی تو اس اصلاحی مقصد کی تصویروں پہ بھی اور رنگ و روغن چڑھایا جانے لگا۔ اور روح میں ذرا تازگی کے آثار پیدا ہوئے۔ آپ پوچھیں گے کہ آخر وہ کون سی تصویریں تھیں۔ خدا بھلا کرے پریم چند کا کہ انھوں نے اصلاحی مقصد کو اپنے سامنے رکھا لیکن اس اصلاحی مقصد میں صرف مغرب کے لئے دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ اُن کا صحیح جذبہ خود اُن کی قومی محبت تھی۔ اسی قومی محبت کے اثر سے متاثر ہو کر انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی اپنے بزرگوں کی عظمتوں کو بالکل بُھلا بیٹھے ہیں۔ اسی کمی کو دور کرنے کے لئے بھی انھوں نے میری مدد لی۔ مجھے اصلاحی مقصد کا جامہ پہنایا لیکن اس جامہ کی تراش۔ کانٹ چھانٹ ہر چیز میں سلیقہ سے کام لیا۔ لباس کو ہر طرح خوبصورت بنانے کی کوشش کی اور اُسے اس طرح میرے بدن پر پہنایا کہ وہ بدن پر چست ہو۔ بدن کا حسن بھی نمایاں رہے اور جامہ کی زیبائش کا بھی اثر دل پر پڑے۔ ان جاموں کو قدیم یادگاروں اور عظمتوں کے رنگوں سے رنگا اور اس طرح رنگا کہ بالکل اجنبیت باقی نہ رہے۔ پریم چند کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اس کے ہاتھوں میں آکر میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں رہ کر بھی کچھ آرام مل سکتا ہے۔

ہاں! چونکہ اس وقت پریم چند کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لئے ایک بات اور بتانی ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جہاں پریم چند نے اس اصلاحی مقصد میں ادبی لطافتوں کا حسن شامل کر کے ان جاموں کو میرے بدن کے لئے موزوں سے موزوں بنایا وہاں ایک دوسری بات انھوں نے ایسی کی جو تعریف سے باہر ہے۔

مگر اس بات کے سننے سے پہلے میں اپنی ایک بات کہہ لوں۔ اور وہ یہ ہے کہ جب میں نے پہلے پہل امریکہ چھوڑا تو سب سے خوش آیند چیز میرے سامنے یہ تھی کہ اب دوسرے ملکوں کی سیر کر کے وہاں کی مقامی خصوصیتوں سے لطف اُٹھاؤں گا روح اور دل کو فرحت نصیب ہوگی۔ یہاں آ کر یہ آرزو خاک میں مل گئی۔ نہ امریکہ کی باتیں باقی رہیں اور ہندوستان کی باتوں کا لطف آیا۔ میرا دل مُردہ ہوگیا تھا کہ اب یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ مگر میری خوش نصیبی کہ پریم چندر نے میری بےکسی پر ترس کھایا۔ مجھے ایسی ایسی جگہوں کی سیر کرائی کہ میں اُس کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ دیہات کی زندگی۔ وہاں کے مرقعے لہلہاتے ہوئے سبزے کی بہاریں۔ بہتے ہوئے دریاؤں کی روانی۔ معصوم کسانوں کی زندگی۔ اُن کی زبان۔ اُن کے جذبات اُن کی سادگیاں۔ اُن کی مصیبتیں۔ میں نے ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا۔ کتنی بڑی بات ہے کہ اب میں اگر ہندوستان سے کسی دوسرے ملک میں جاؤں تو آسانی سے لوگ ہندوستان کی خصوصیتوں کا پتا مجھے دیکھ کر چلالیں گے۔ مجھ میں وہ سب باتیں ہیں جو ایک سیاح اور مؤرخ کسی دوسرے ملک میں جا کر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں اسے اپنے لئے حُسن مجسم سمجھتا ہوں اس نے میری رعنائیوں میں دوبارہ تازگی پیدا کر دی۔ مجھ میں پھر وُہی حُسن پیدا ہوگیا جسے میں کبھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ لیکن جو لوگ اصطلاحوں کی دھن میں دیوانے ہیں۔ ہر چیز کے لئے ایک خاص نام کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اسے "مقامی رنگ" کہتے ہیں۔ داستان کا یہ حصہ ذرا دلچسپ ہے میرا دل نہیں چاہتا کہ اسے ادھورا چھوڑ دوں۔ ذرا غور سے سنئے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی لطف آئے گا۔ پریم چندر نے میری اصطلاح میں جس حُسن کی تصویریں کھینچیں یعنی دوسروں کے نزدیک جس مقامی رنگ کو سراہا۔ اُس کی نقالی بعض اور افسانہ نگاروں نے بھی کی۔ ان میں خاص طور پر سُدرشن۔ اعظم کریوی اور علی عباس حسینی سے مجھے اس خاص حیثیت سے زیادہ لگاؤ ہے انہوں نے اس خاص طرز میں پریم چند کے رنگ کو نہایت کامیابی کے ساتھ نبایا ان کے یہاں بھی دیکھئے تو میں دیہاتی زندگی کے چوبے میں ڈوبا ہوا دکھائی دوں گا۔ خیر یہ بات تو کچھ ایسی نہیں اب ذرا ایک اور دلچسپ بات سنئے۔ میرے بعض دوسرے شیدائیوں نے جو یہ دیکھا کہ مقامی رنگ کا یہ جوڑا مجھے بہت پسند ہے۔ اُس نے میری پُرانی رعنائیوں میں اضافہ کر دیا ہے تو یہ محبت کے دیوانے اسی چیز کی دوسری شکلیں ڈھونڈنے لگے اور اس میں شک نہیں ہے کہ اُن کی یہ کوششیں ایسی پھلیں پھولیں کہ دیکھنے والوں کے لئے سرمایہ سرور بن گئیں۔

راشد الخیری اور سدرشن نے اسی حیثیت سے یہ بات کی کہ مجھے لے کر ہندوستان کے گھر گھر میں پھرے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ میں نے اُن کی زینتیں دیکھیں۔ اُن میں رہنے والوں کی باتیں سنیں۔ اُن کے مذاق۔ اُن کی لڑائیوں۔ اُن کی شادیوں اور اُن کے غموں میں حصہ لیا اور اب مجھے معلوم ہُوا کہ ہندوستان کے گھروں کی کیا حالت ہے۔ بڑی ہٹ دھرمی ہے اگر اس حیثیت سے ان کا احسان نہ مانوں۔ اس لئے کہ مقامی رنگ کی یہ جھلک پریم چندر کے مقامی

رنگ سے کچھ کم دلچسپ نہیں۔

خیر۔ اسے تو یہیں چھوڑیئے۔ اب ذرا دیکھئے کہ اس کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں نے اسی حیثیت سے میرے حسن میں اور کونسا اضافہ کیا۔

ایسی تصویروں کے دو اور مصور جن کی میری نظروں میں بہت قدر ہے نیاز اور مجنوں ہیں۔ انہوں نے مقامی رنگ کی تصویروں میں ایک اور دلچسپ رنگ آمیزی کی۔ بجائے کسی مخصوص سوسائٹی یا گھر کی باتوں کا ذکر کرنے کے ہندوستان کی پوری سوسائٹی۔ اس کی عادتوں۔ اس کے طریقوں اور اس کے ماحول کے مرقعے میرے دامن سے وابستہ کر دیئے۔ اور اب میری روح اور دل دونوں پر ہندوستان اور یہاں کے مقامی رنگ کی بے حد مکمل تصویریں نقش ہوگئیں۔ مجھ میں دیہات کی زندگی کی سادگیاں بھی ہیں مجھ میں ہندوستانی گھروں کی دلچسپی سے بھری باتیں بھی ہیں اور میرے دل پر ہندوستان کی عام فطرت کے گہرے نقش بھی۔

اب تک میں نے جو کچھ بیان کیا اس سے سننے والوں کو اس لئے لطف آرہا ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ میرے بھلے کیلئے ہوا مگر میرا ہی دل جانتا ہے کہ جہاں ہندوستان کی مخصوص فضاؤں کی سیر نے میرے دل اور روح کے لئے سامان مسرت جمع کیا وہاں میرے حق میں کیا کیا کانٹے بوئے۔

یہ میں کہنا بھول گیا تھا کہ مجھ میں اور تقلید میں اور خاص طور پر اندھی تقلید میں جنم کا بیر ہے۔ جس دن سے میں پیدا ہوا اس نے میرے لئے ایسے ایسے کانٹے بوئے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس پر اس کا داؤں چلا ہو۔ یونان میں مصر میں۔ چین میں۔ جاپان۔ فرانس اور انگلستان جہاں جہاں میں گیا اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ ہر جگہ طرح طرح سے میری صورت بگاڑنے کی کوشش کی ہندوستان میں بھی اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں کے فسانہ نگار بھی اس کا شکار ہوئے میں آپ کو کس طرح سناؤں کہ ان غریب افسانہ نگاروں پر اس ظالم تقلید نے کیا کیا سحر طرازیاں کیں۔ افسانہ لکھا اس میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے نزدیک بڑی مہمان نوازی کی اور یہاں میری حالت یہ کہ روز بروز صورت مسخ ہوتی چلی جارہی ہے اب اگر بہت دن تک یہی حالت رہی اور ایسے کرمفرماؤں کی تعداد بڑھتی گئی تو میرا خدا حافظ ہے۔ ہندوستان کو باحسرت و یاس خیرباد کہنا پڑے گا۔ آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا ہوگا کہ آخر یہ ہیں کون بزرگ؟ مگر میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا ایک نہیں پچاسوں ہیں جو میری محبت کا دم بھرتے ہیں اور مجھے اُلٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔

خیر اسے یہیں چھوڑیئے اس مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل میں آبلے پڑتے ہیں۔ آنکھوں میں خون اترتا

ہے۔اس لئے اس مجرے سے ذکر کو یہیں چھوڑ دیئے۔اب ذرا میرے تھوڑے سے محسنوں کے نام اور سُن لیجئے۔

پریم چندر کا ذکر تو میں نے کئی دفعہ کیا۔ اُن کے میرے اوپر جہاں اور احسان ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ میری رگ رگ میں اُس لطیف احساس کی لہریں دوڑا دیں جسے لوگ عرف عام میں نفسیات کہتے ہیں۔ باتیں سب کرتے ہیں۔ قصے سب لکھتے ہیں۔ اُن میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش بھی سب کرتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف دلچسپی ہی کوئی چیز نہیں۔ دلچسپی میں اُس وقت تک کوئی کیف نہیں جب تک وہ فطرت سے دست بدست ہو کر نہ چلے۔ فطرت کا مطالعہ اور اُسے افسانوں میں شامل کرنے کا دوسرا نام نفسیات ہے۔ پریم چندر نے اور باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا اور اپنے ہر قصہ کو نفسیات میں ڈبو کر ایک دلکش رنگ میں رنگا۔ پریم چند کے علاوہ حامد اللہ افسر بھی میرے ایسے پرستار ہیں جنہوں نے مجھ میں اور نفسیات میں محبت کے تعلقات قائم کئے۔ ہمارے رشتوں کو اتنا مضبوط بنایا کہ وہ جہاں میرے ساتھ چلتے رہیں۔ نفسیات کا ہاتھ میرے گلے میں ہوتا ہے۔ مجھ میں اور میری اس نئی مونس میں اتنی محبت ہے کہ ایک منٹ کو بھی ساتھ نہیں چھوٹتا۔ یوں تو نیّس رامپوری کا نام بھی اس سلسلہ میں لینا ضروری ہے۔ مگر پریم چندر اور افسر نے مجھے اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا کہ کسی دوسرے کا نام لینے کو جی نہیں چاہتا۔ اور سچ پوچھئے کہ نام گنوانے پر آجاؤں تو اس سلسلے میں میرے ایسے نادان دوست بہت سے نظر آئیں گے جو نفسیات کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں اور لطف یہ کہ مجھے اور اُسے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان سے ان کے لئے کیا بتاؤں کہ کیا نکلتا ہے۔ بس خدا انہیں اس بات کی توفیق دے کہ میری نزاکتوں کا احساس کرنے لگیں۔

اب تک جو داستان آپ نے سنی وہ شاید کسی کے لئے دلچسپ نہ ہو۔ مگر میری داستان کا یہ ٹکڑا اتنا دلکش ہے کہ میں خود بھی اس پر فریفتہ ہوں۔

یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ محبت کی حکومت دُنیا کے ہر ذرہ پر ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جو اس لطیف کیفیت سے بیگانہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی پر اس نشہ کا کم اثر ہے کسی پر زیادہ۔ کوئی اسے ایک نظر سے دیکھتا ہے کوئی دوسری سے۔ اُردو میں بھی یہی حالت ہے۔ اُس کے سارے ادب کی طرح شروع کے افسانوں میں بھی وہی اثر تھا۔ عشق و محبت کی داستانیں تو ضرور تھیں مگر ان میں اکثر کا تعلق بوالہوسی سے تھا۔ محبت کے لوگوں نے صرف ایک معنی سمجھے تھے اور وہ یہ کہ مرد اور عورت میں محبت ہو اور آگے چل کر شادی ہونے کے بعد اس جذبہ کی تکمیل ہو جائے۔ جب شروع شروع میں مجھے ہندوستانی کی اس محبت کا سامنا کرنا پڑا تو ایمان کی بات ہے مجھے امریکہ بہت یاد آیا۔ جہاں محبت نے اتنی مختلف شکلیں اختیار کر رکھی تھیں کہ وہاں سے آنے کے بعد بہت دن تک میرے دل پر ان کی یاد تازہ رہی۔ شروع کے دس برسوں تک مجھے

محبت کے اُسی دام میں گرفتار رہنا پڑا جو مشرق کے لئے مخصوص ہے مگر اب کوئی ۵-۶ برس سے محبت نے مختلف شکلیں اختیار کرلی ہیں۔ علی عباس حسینی اور مجنوں گورکھپوری نے محبت کو فلسفیانہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اُن کے خیال کے مطابق اس کی حکومت کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ علی عباس حسینی محبت کو دنیا کے ہر رشتے کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی کو بھائی اور بہن سے۔ دوست کو دوست سے۔ ماں کو بیٹے سے۔ آقا کو خادم اور خادم کو آقا سے جس جس قسم کی مختلف محبت ہوتی ہے اُس کا احساس اُن کے افسانے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔

مجنوں کی محبت کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اُن کی محبت پر قدیم محبت کا اثر ہے لیکن اس میں انہوں نے بہت وسعت پیدا کردی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ محبت کے مشتعل جذبات اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ آگ کس طرف لگ رہی ہے۔ شباب کا جوش اور اُس کی نیرنگیاں رشتوں کی قید میں رہ کر اپنا جلوہ نہیں دکھاتیں۔ اُس پر صرف ایک لفظ کی حکومت ہے جس کا نام محبت ہے۔ وہ کسی بارگاہ میں ہو کسی دل پر ہو اُس کے اثر یکساں ہیں۔

یہی محبت ہے کہ جس نے عورت کی فطرت کو میرے ساتھ اس اس طرح وابستہ کیا ہے کہ اُن کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ میرے دل پر عورتوں کی جتنی مختلف تصویریں میرے شیدائیوں نے نقش کر رکھی ہیں اُن کے خاکے ملاحظہ کیجئے۔ افسانہ نگاروں کا ایک گروہ عورت کی اصل فطرت کو اُس کا حُسن سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ اُس کے ظاہری خط و خال پر فریفتہ ہے تیسرا گروہ اُس کی روحانی لطافتوں کا شیدائی ہے۔ بعض افسانہ نگار عورت کو صرف بُرائیوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ غرض خدا جانے کیا کیا ہے۔ عورت ایک ہے اور اُس کی شکلیں اتنی مختلف اور لطف یہ کہ ایک سے زیادہ ایک دلکش۔

اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب عورت اور اُس کی فطرت کے حُسن لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیتے ہیں تو یہ اثر شاعرانہ لطافتوں کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ عورت کی فطرت نے افسانہ نگاروں کے دلوں کو شاعرانہ خیالات کا مرکز بنایا تو انہوں نے میرے بدن کے ہر حصے کو ان نزاکتوں کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ کبھی میرا تن لیا اور اُس میں روح کسی شاعرانہ خیال کی پھونکی کبھی ڈھانچا کسی شاعرانہ خیال کا لیا اور اُس میں روح میری فطرت کی داخل کی۔ بات بات میں شاعرانہ تخیل کا اثر۔ مجھے بھی اس رنگ میں بہت لطف آیا اور میں نے اپنے ایسے پرستاروں کے دلوں پر گہرا قبضہ جمالیا۔ اس وقت قصیدہ خوانی کا تو موقعہ نہیں کہ میں ہر شخص کا نام الگ لے کر اُس کی مخصوص شاعرانہ نزاکتوں کا ذکر کروں۔ البتہ اپنے چند محسنوں کا نام لکھے دیتا ہوں سنئے۔ اس طرز خاص کے موجد تو میرے سرتاج پریم چند ہی ہیں۔ پریم چند کے رنگ میں نئی لطافتیں پیدا کر کے اُس میں نئے رنگ بھرنے کا سہرا نیاز۔ مجنوں۔ اور امتیاز علی تاج کے سر ہے جی میں آتا ہے ایسے لوگوں کے بھی نام لے ڈالوں جنہوں نے شاعرانہ نزاکتوں سے ناتا جوڑا اور میرے سر پر ان کا بوجھ اس طرح لادا کہ یہ نزاکتیں تو دور خود میری

لطافتیں بھی غائب ہوگئیں۔ لیکن بس یہی خیال ہے کہ نکتہ چینیوں سے لوگ میری فطرت کی شگفتگی اور لطافت پر نہ شبہ کرنے لگیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کے لئے دعائے خیر کیجئے اور آگے بڑھئے۔ اب میرا دل بھی گھبرانے لگا۔ جی چاہتا ہے کہ اس افسانے کو یہیں چھوڑ دوں مگر جو کچھ اب میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کا تعلق میری گذشتہ زندگی سے ہے۔ دل میں درد ہے اور آنکھوں میں آنسو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہندوستان کی زندگی سے عاجز ہوں۔ اس لئے اپنے پُرانے قصوں کو یاد کرکے دل بھر آیا۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ ہر شخص کی گذشتہ زندگی میں کچھ نہ کچھ باتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جن کی یاد آئندہ زمانہ میں دل کو تڑپا دیتی ہے۔

یہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ جب میں پہلے پہل ہندوستان آیا تو میری طبیعت بہت گھبرائی۔ ہر وقت پرانی باتوں کی یاد دل کو ستاتی رہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہندوستان کی محبت ایسی بڑھی کہ میں اپنے پرانے عیش و آرام بھول گیا لیکن اب کوئی چھ سات برس سے میرے شیدائیوں نے ایک نئی روش اختیار کی۔ اب تک مغرب کا صرف ظاہری اثر تھا۔ اب مغرب کی روح بھی افسانوں میں داخل ہوگئی۔ یہ چھوت اور اسی طرح کے دوسرے علمبرداروں نے ہندوستانیوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنی فطرتوں کو بھول گئے۔ میری وہ تصویریں جو انہوں نے اپنے خیال کے مطابق کھینچی تھیں۔ ایک ایک کرکے لانی شروع کیں اور اپنے نگارخانوں کو اُن سے سجایا۔ صرف نورا رنگ آمیزی کردی باقی سارے کا سارا وہی میں اسے بھی محبت کا تقاضا سمجھتا ہوں لیکن اصطلاحوں کے دیوانے اس اثر کو ترجمے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غرض ان ترجموں کا یہ اثر ہوا کہ مغربی افسانوں کی لطافتیں اُردو کے قالب میں اس طرح آگئیں کہ اور تو اور مجھے بھی پہچاننا دشوار ہوگیا۔ روس۔ فرانس۔ انگلستان اور امریکہ کے علاوہ ایران اور ترکی کے حسین سے حسین مرقعے اُردو کے نگارخانوں میں داخل ہوگئے۔ آپ سب سے پہلے ان مصوروں کے نام پوچھیں گے۔ لیجئے میں آپ کو ناموں کے ساتھ اُن کے پتے بھی بتائے دیتا ہوں۔ سنئے اگر آپ کو ان مغربی مرقعوں کی تلاش ہے تو امتیاز علی تاج۔ عبدالمجید سالک۔ جلیل قدوائی۔ منصور احمد۔ اور خواجہ منظور کے کھینچے ہوئے مرقعے دیکھئے تصویریں سب مغربی ہیں۔ جو کھٹے انہوں نے اپنے چڑھائے ہیں۔ اب میرے دل کی یہ حالت ہے کہ کبھی مغرب کے رنگ میں سرشار ہوں اور کبھی مشرق کی سادگی اور شاعرانہ لطافتوں پر۔ کبھی بادۂ مغربی کے جوش میں سرشار اور کبھی مینائے مشرق کا فریفتہ کبھی شاہد فرنگ کی شوخیوں کا متوالا اور کبھی محبوبۂ مشرق کی سادگیوں کا دیوانہ میری فطرت بالکل بدل گئی ہے۔ نہ مشرقی جامہ۔ نہ مغربی۔ نہ مشرقی حسن نہ مغربی شوخی۔ اور لطف یہ کہ پھر کچھ نہیں بھی ہے اور سب کچھ ہے بھی غرض عجیب لطف کی زندگی ہے۔ ایران اور ترکستان کی سیر بھی میں نے اکثر سجاد حیدر کے ساتھ بڑے مزے میں کی ہے۔ اسی یکایک تبدیلی کا اثر ہے کہ میری فطرت میں یکسانیت باقی نہیں رہی۔ کبھی انتہائی مسرور ہوں اور کبھی انتہائی مغموم کبھی مسرت و شادمانی چھائی ہوتی ہے اور کبھی حُزن و یاس چھایا ہوا ہے۔ اور اسما

کی بات ہے کہ مجھے اپنی شکل اسی وقت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب مجھ پر حزن و یاس چھایا ہوا ہو اور اسی لئے مجھ پر جان دینے والے عموماً مجھے اب ماتمی یا سوگ کا لباس پہنا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں جنہیں فن کا خیال ہے جنہیں اثر کی کی تلاش ہے۔ جنہیں لطافتیں پیدا کرنے کی خواہش ہے۔ انہوں نے سوگ سے ناتا جوڑا ہے۔ اور میرے خیال میں لوگ بھی اسی کے عادی ہوگئے۔ اُن کے دلوں پر وہی تصویریں عرصہ تک نقش رہتی ہیں جن میں میں ماتمی لباس پہنے ہوئے ہوں .....

اُف مجھ میں اب طاقت نہیں کہ اس قصہ کو آگے بیان کرسکوں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی چاہتا ہوں کہ اس قصہ کو ختم کردوں مگر طاقت نہیں۔ مجھے ابھی اپنی زندگی کا وہ حصہ بیان کرنا ہے جو آج کے بعد آنے والا ہے۔ لیکن اس کے لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے۔ اور یہاں دل قابو میں نہیں۔ ہاں دلوں کی خلش مٹانے کے لئے صرف اتنا اشارہ بتائے دیتا ہوں کہ اُردو کے ہاتھوں میرا انجام بہت اچھا ہونے والا ہے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کئے۔ میری زندگی کو بے حد خوش گوار بنایا اور اُس کے لئے میرے بدن کا تار تار اُن کے لئے دستِ بدعا ہے .... اچھا رخصت

یار زندہ صحبت باقی

سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے

کشش

(سی۔ آر۔ داس)

جس طرح شعر کہنے میں محو شاعر اپنے اشعار بار بار اٹھاتا ہے۔ ان کو پڑھتا ہے اور پھر رکھ دیتا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اے میرے محبوب! میں تیرے حسنِ بے مثال کو بار بار دیکھتا ہوں ——— اور چلا جاتا ہوں۔ اور پھر واپس آکر سے تیرے سامنے تیرے عشق کے گیت گاتا ہوں ———

شاعری شاعر کی روح ہے ——— اسی میں شاعر کے لئے کشش ہے ——— وہی اس کو اپنی طرف مائل کرسکتی ہے۔ مگر تو مجھے کس کشش سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ اے محبوب! کس کو معلوم ہے ——— کون جانتا ہے کہ تو بھی کسی زبردست کشش کا مالک ہے۔

مترجمہ
ایم۔ حبیب احمد بنگالی

پودے کا روگ

پردیس میں پا بگل ہوں تنہا — بتلاؤں کسے میں اپنی بپتا

دن رات وہیں پہ ہوں جہاں میں — پھیلا نہ بڑھا، پھلا نہ پھولا

بس ایک ہی رت ہی مجھ پہ طاری — اترا نہ جو رخت میں نے اوڑھا

اس دھوپ کے زنگِ برگ سے ہوں — بیمار، نزار، زرد، روکھا

لہرائے کہیں جو اس فضا پر — تو لاگ سے سوکھ جائے جھالا

پتوں کو مرے پتہ نہیں کچھ — کیسا ہے خنک ہوا کا پنکھا

اک بوند بھی کی طلب جو میں نے — تو آنچ سے باغباں نے سینچا!

نس نس میں اک آگ سی بھری ہے — ہر پور پہ ہے اسی کا لاسا

نورس ہیں ہر اک چمن کے ریشے — ناسور ہے میرے دل سے رستا

اوروں کے مسامِ شل بھی شاداب — کونپل بھی مری بغل میں کانٹا

رسیائی ہوئی ہیں ان کی کلیاں — مرجھائی ہوئی ہے میری کایا

بیلوں میں وہاں لہک ہے جیسے — اے کاش! یونہی میں لہلہاتا

مہکی ہیں فضائیں جیسے اُن کی — یہ کُنج بھی اُس طرح مہکتا

دُور، آڑ میں، اُس لکیر کے پار — سُنتا ہوں کہیں اُدھر ہے برکھا

ایسا نہ ہُوا کہ اس طرف بھی — لے آئے صبا اُڑ کے چھینٹا

افسوس! کہ میری ڈالیوں پر — چہکا نہ کبھی کوئی پپیہا

پھلنے کو ترس گئیں یہ شاخیں — بھُولے سے نہ آئی کوئی شاما

اس پر یہ ستم کہ خستگی میں — حسرت کا سماں ہے جبکہ چھایا

خواہاں ہے یہ خوشہ چیں کہ از خود — ہو جاؤں ہرا بھرا میں پیاسا!

یوں اپنے تئیں شگفتہ کرلوں — انبار ہوں برگ و بر کے پیدا

ٹپکاؤں میں جھولیوں میں اُس کی — جگ بھر کے پھل اور پھول اکیلا!

پودے ہیں کئی طرح کے یُوں تو — بھاری ہے کوئی تو کوئی ہلکا

قلمی ہے کوئی تو کوئی بے رُت — کڑوا ہے کوئی، کوئی رسیلا

گُلدان سے ہے کسی کو گر لاگ — تو راس نہیں کسی کو گملا

لنجا ہے کوئی، تو کوئی گنجان — روگی ہے کوئی، کوئی توانا

ہاں! یہ تو کہو کہ مجھ سے پہلے — ایسا بھی سُنا ہے کوئی پودا؟

حسن لطیفی

افسردہ خاطر

صبح صادق کے وقت ایک نوجوان مرد اور ایک جواں سال دوشیزہ واشنگٹن پارک کے مغربی کونے پر آکر رُکے۔ وہ چلتے چلتے رُک گئے کیونکہ لڑکی فضا میں بہار کے آثار محسوس کرکے یکایک حیرت سے اُچھل پڑی۔ اُفقِ مشرق پر مکانوں اور دریا سے پرے۔ ایک ہلکا سنہری رنگ چمک رہا تھا۔ اُن کے آگے پیچھے اور اوپر رات کی تاریکی مدھم پڑ رہی تھی لیکن زمین آسمان سے زیادہ تاریک معلوم ہو رہی تھی۔ درختوں کے درمیان لیمپ ابھی تک جل رہے تھے۔ اور ان کے غیر متناسب سائے زمین پر اِدھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ اردگرد کے مکانات کی دیواریں بھی ہنوز سوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

پارک کے وسط میں جہاں فوارہ کا پانی کھیل رہا تھا۔ کوئلے کی بھٹیوں کی ایک قطار تھی۔ جن میں سے ہلکے سیاہ رنگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اور بل کھاتا ہوا دھواں حلقوں کی شکل میں اوپر کو اُٹھ رہا تھا۔ آگ کے سامنے مزدوروں کے چہرے سیاہ معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی ایک کامل گہرے سکوت میں غرق تھی۔ اگرچہ دو چار سحر خیز پرندے راگ الاپنے لگے تھے اور مشرق و مغرب میں ایک ہلکی۔ دھیمی سی گونج شہر کی بیداری کی خبر دے رہی تھی۔

آج سحر میں اک شان تھی۔ اِک سنہری کیف۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارے کا سارا شہر بیدار ہونے کو ہے کہ تازہ نکلتے ہوئے سورج کو خوش آمدید کا گیت سنانے کے لئے مکانوں کی چھتوں پر جمع ہو جائے!

"ٹم۔ کیا تم خوش نہیں ہوئے ہم نے کوئی تانگا کرایہ پر نہیں لیا؟" وِک نے ایک کا نپتی۔ رقصاں نرم نغمہ ساز آواز میں پوچھا اور فضا کے سکوت میں حرکت پیدا ہو گئی۔

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ ہم اُس پر سے یہ سہانا منظر کبھی نہ دیکھ سکتے تھے۔"

"اچھا!" اُس نے ایک جماہی کو روکتے ہوئے کہا۔ لیکن لڑکی نے بےچینی سے چیخ کر کہا:۔

"اُدھر دیکھو۔ کس طرح یکے بعد دیگرے۔ شاخوں میں روشنی کے نکتے غائب ہو رہے ہیں اور فضا میں ایک عجیب خلا سا چھوڑ رہے ہیں۔ شاید روشنی جلانے والا روشنی بند کر رہا ہے"! ٹم نے کچھ جواب نہ دیا اور دونوں خاموش کھڑے رہے لیکن جلد ہی لڑکی نے سلسلۂ کلام کو دوبارہ چھیڑتے ہوئے کہا:۔

"یہ سب کچھ اس قدر تازہ اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا دُنیا آج صبح ہی پیدا کی گئی ہے"! دفعتہً رِٹم نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت ایک خوبصورت ساحرہ معلوم ہوتی تھی۔ عُریاں سر پر رات کی طرح سیاہ بال، سیاہ آنکھیں جن میں سے چمکدار نُورانی کرنیں نکل رہی تھیں۔ اونچی پیشانی نیم عریاں ہونٹ سُرخ قدرتی رنگ کے۔ سفید مرمریں چہرہ۔ کُھلے ہوئے ہونٹ غیر معمولی طور پر خوبصورت۔ چمکتے ہوئے اور تیز کاٹنے والے دانتوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ اور آنکھوں کے تیر نشتر جیسے تیز تھے اور اُس کے ڈھلوان کندھوں پر چیتے جیسے داغوں والا ایک خوبصورت کوٹ پڑا ہوا تھا! ــــــ الغرض وہ پرستش کی حد تک محبت کئے جانے کے لئے بنی تھی اور اب جب کہ وہ خوابِ خیال کی دنیا میں محو وہاں کھڑی تھی۔ اس کی کوئی حرکت اُس کے اعضا کی کوئی معمولی سی جنبش بھی اندازِ حُسن سے خالی نہ تھی۔ بلکہ اپنے اندر خاص معنویت اور شعریت رکھتی تھی!

چنانچہ رِٹم بالکل بھول گیا کہ وہ تھکا ہوا بھی تھا!

"تمہاری کیا عمر ہے رِک؟" اُس نے پوچھا

"گویا تمہیں خود معلوم ہی نہیں! واہ!"

"نہیں۔ پھر بھی ایک دفعہ اور بتا دو۔ ضرور، رِک"

"۲۲ برس"

اُس نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور بے ربط طور سے کہنے لگا۔

"مَیں نے کبھی اس سے بڑھ کر خوبصورت سحر نہیں دیکھی!

"اور نہ میں نے!" رِک نے مشرق کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی تاریک رات۔ جس کے عین نیچے" سورج طلوع ہو رہے ہیں"!

"دو سورج؟" اُس نے حیرانی سے مُڑ کر پوچھا۔

"ہاں دو سورج!" اُس نے کامل سنجیدگی سے کہا۔

"تم سمجھتے ہو گے کہ تم بہت چالاک ہو؟"

"مَیں سمجھتا ہوں کہ تم سحر ساز ہو!"

"اگر تم نے اور چھیڑ چھاڑ کی ــــــ"

"تو؟"

"ہم گھر چلے جائیں گے"!

"بس ٹھیک ہے! آؤ چلیں رات بھر گرم روشنی میں دیوانوں کی طرح ناچتے رہنے کے بعد اب ہمارے لئے گھر جانا ہی بہتر ہے!"

"آہ! نہیں ٹم ——— اُس نے ایک نرم و شفاف قہقہہ لگا کر کہا ——— آؤ یہاں بیٹھ کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھیں۔ سچ جانو میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ دیکھو فضا کیسی خوشگوار ہے۔ شفاف آسمان! اور ناچ کے بعد یہ کامل سکوت! ٹم۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ!"

کچھ بڑبڑانے کے بعد آخر وہ بیٹھنے پر رضامند ہو گیا۔ دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور خاموشی سے بے حس و حرکت بیٹھے رہے! ——— غیر مرئی و غیر محسوس طور پر ہوا لطیف ہونے لگی۔ ایک تازہ حرکت اُن کے ارد گرد تھرتھرائی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اور اُفق مشرق پر گلابی رنگ جھلکنے لگا۔ یکایک اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ ہوا کی معطر خوشبوئیں اُس لطیف خوشبو سے مل کر جسے وِک استعمال کرتی تھی۔ اُس کے حواس پر چھا گئیں۔ اُس نے پھر اُس کی طرف غور سے دیکھا تو اُس کا چہرہ ملول و افسردہ تھا۔ اور اس کی آنکھیں رُکے ہوئے آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھیں!

"کیوں وِک یہ کس لئے؟"

"آہ! ٹم میں بہت افسردہ خاطر ہوں!" اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"پیارا۔ ننھا نازک ہاتھ!" اُس نے آہستگی سے اسے چومتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا!

"آخر بات کیا ہے؟ کیا کوئی مالی معاملہ ہے؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگرچہ میرے پاس دولت کی کمی بھی ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ میں نے اس ہفتہ میں تین دن کام کیا اور اب جب کہ تصویر ختم ہو چکی ہے ہفتہ دو ہفتہ تک شائد اور کوئی ممکن نہ ہو سکے۔ آہ! یہ متحرک تصاویر!"

"تم گھر پر تو بہت خوش و خرم ہو گی۔ میری ننھی منھی بُلبل!"

"خوش و خرم! ہرگز نہیں والدہ کہا کرتی رہتی ہوں شہر کی ملکہ حُسن مشہور اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بیتاب و بیقرار اور خوبصورت بننے اور حسین دکھائی دینے کا جنون ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔"

"ہیں۔ تو کیا تم کبھی خوبصورت اور حسین بھی تھیں؟"

"لوگوں کا تو یہی خیال تھا!"

"کم مذاق۔ کور ذوق۔ ظاہر بیں لوگ! لیکن یہاں ایک ظالم اور بڑے شہر میں گم شدہ حقیر۔ بیکس اور تنہا!؟"

"یہ شہر تو میرا اپنا شہر ہے۔ مجھے یہاں کے ایک ایک پتھر سے اور اس کے تمام لوگوں سے محبت ہے!" اُس نے فخریہ انداز سے کہا۔

"تب تو میرے لئے بھی کچھ اُمید باقی ہے۔ میں بھی انہیں میں سے ایک شخص ہوں!"

"تم؟ تم حیوان ہو حیوانوں میں سے ایک حیوان۔ اور تم مغرور ہو ——— اور حسین!"

وہ واقعی حسین تھا۔ اس کی نیلی مسرور آنکھیں تھیں۔ گلابی رخسار اور سیاہ بال تھے۔

"لیکن میں اپنے شہر میں ملکۂ حُسن بننے کی بجائے ——— لڑکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ——— یہاں ایک مفلس ایکٹرس بننا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ اگر میں وہاں ہوتی تو ایک قلاش آرٹسٹ کے ساتھ واشنگٹن پارک میں طلوعِ سحر کا منظر ہرگز نہ دیکھ سکتی!"

"اور اگر تم اپنے شہر میں ہوتیں تو میں خوابِ راحت میں سویا پڑا ہوتا۔ اور ایک رذیل شب آوارہ کی طرح نہ پھرتا!"

"اُس نے بھڑک کر کہا" کیا پروا ہے بھلا تمہیں! تم تو اُس بھورے بالوں والی لڑکی کو ہی حسین سمجھتے ہو!"

"کون بھورے بالوں والی لڑکی؟" اُس نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"کون بھورے بالوں والی لڑکی! تو تم اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"مجھ میں اتنی طاقت کہاں!"

"لیکن اُس کے پاس تو کافی روپیہ ہے!"

"اچھا!"

"اگر مرد میں مجھے کوئی بُری بات لگتی ہے تو یہ اس کا غرور ہے!"

"تو کیا میں مغرور ہوں۔ خوبصورت پھول؟"

"بیشک۔ لیکن میں اسی غرور کو پسند بھی کرتی ہوں ——— تمہارے اندر!" اُس نے پُر از مسرت قہقہہ لگا کر اور اس کے ہاتھ کو دبا کر کہا۔

"کتنا اچھا طریقہ ہے میرے علاج کا!" اُس نے زیرِ لب کہا ———

"وہ کس بات کے منتظر ہیں؟ لڑکی نے پوچھا۔

"کون؟"

"لوگ جو سورج کو راہ دکھاتے ہیں تو وہ طلوع ہوتا ہے۔ یہ مست ترین طلوعِ خورشید ہے۔ جو آج تک میں نے دیکھا ہو!"

"جس کیتلی کو ہم نگاہ میں رکھیں وہ نہیں اُبلتی"!

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سر نیچے جھکا کر غمگین آواز میں کہا:۔

"آہ! ٹم میں بہت افسردہ خاطر ہوں۔ میں عمر بھر کبھی اتنی پژمردہ نہیں ہوئی"!!

"بیشک۔ مگر بے معنی نہیں! وِک دیکھو۔ ضرور تم کو مجھے بتانا ہوگا؟ کیا تم مجھے ہر ایک بات نہیں بتاتی ہو؟

"ہاں ہر ایک بات! دنیا میں کوئی اور ذی روح نہیں جس سے میں اپنا دلی راز کہتی ہوں۔ لیکن میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم جو مجھ پر ہنستے ہو۔ میرا مذاق اڑاتے ہو مجھ میں عیب نکالتے ہو اور مجھے اُن پر ملامت کرتے ہو۔ تم! وحشی۔ جاؤ نہیں بتاتی!"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اور اس کے قریب سرک گیا ــــــ

"لیکن وِک۔ بہر حال یہ ذراسی بات تو بتاؤ۔ بس یہی ایک!"

وہ اُس کی طرف دیکھ کر جواباً مسکرانے لگی ــــــــــ

"اچھا! اپنا ہاتھ دکھاؤ مجھے"! اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فی الفور اُس کی شہادت کی انگلی کو دانتوں میں لیکر اس زور سے کاٹا کہ وہ تلملا اٹھا۔ دانت واقعی کاٹنے میں خوب تھے!۔

"یا اللہ! او میری ننھی سی چڑیل!" اُس نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھا۔ اب تو اخلاق سے پیش آؤ گے نہ؟"

"اوہو۔ اب میں سمجھا تم مجھے ٹم کیوں کہتی ہو"۔ اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ"

"وِک۔ ٹم! (بمعنی صید شکار)

وہ مبہوت اور حیرت زدہ تھی۔ اور اس کے ہونٹ کھُلے ہوئے تھے! ــــــــــ

"لیکن کیا تم نے یہ ابھی ابھی حل کیا ہے؟"

"ابھی ابھی! مگر کیا تم نے "کسی خاص مقصد سے ایسا کیا ہے؟" اُس نے حیرت سے تکتے ہوئے کہا۔ اس پر لڑکی انتہائی ہنسی سے کانپنے لگی ــــــــ"

واہ خوب! کیا خوب! اور میں تمہیں اپنے سے چالاک و ہشیار سمجھتی رہی ہوں! خوب۔ بہت خوب۔ تو کیا میں یونہی مغالطے میں رہی؟ اتنے کُند ذہن کہ پورے ایک مہینے میں یہ بات معلوم ہوئی! یا اللہ! افسوس بیچارے کند ذہن قلاش آرٹسٹ پر رحم کر! توبہ! توبہ! مجھے کس قدر مغالطہ ہوا! آہ! اس پر رحم کر!"

اس کا سر ندامت اور احساسِ شکست سے نیچے جھک گیا۔ اور کچھ عرصے بعد اُس نے تحت آواز میں کہا: "اب غرور فضول ہے کیونکہ غبارے میں سوراخ تو ہو ہی چکا!"

اُس کے چہرے پر پھر حزن و ملال کا رنگ چھا گیا۔ وہ تفکر میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف دیکھنے لگی اور ایک آہ بھر کر کہنے لگی:۔

"رُتھ آہ! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!"

"لیکن مجھے اس کی وجہ بتاؤ؟"

"اچھا لو سنو۔ یہ مسٹر ——— اِدکلے کی بابت ہے!" اُس نے شرم کے انداز میں ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیا؟" ——— اس کی آنکھوں میں آنسو پھر جمع ہو گئے ———

"رُتھ! کیا تمہارے خیال میں ———"

"میرے خیال میں کیا؟"

"مجھے مسٹر اِدکلے سے شادی نہ کرنا چاہیئے!؟"

"اس سے تمہارا مطلب؟ شادی اور اُس بوڑھے کے ساتھ! ؟" اُس نے حیرت اور غصے سے کہا۔

"لیکن وہ کچھ اتنا بوڑھا تو نہیں ہے۔" اُس نے باصرار کہا۔

"وہ ۴۴ سال کا بوڑھا! تم بائیس سال کی دوشیزہ! تم سے دوگنا! اتنا بوڑھا کہ اس پر تمہارا باپ ہونے کا شبہ ہو! تاہم تمہارا اصلی مطلب کیا ہے؟

"میں چاہتی ہوں کہ مرد بوڑھے ہوں!"

"تاکہ تمام عمر تم بچہ بنی رہو۔ تمہاری نگرانی ہوتی رہے۔ اور بچوں کی طرح تمہیں تھپکیاں دے دے کر لگاڑا جائے! کیا تم کبھی معمر نہ ہو گی؟ مسٹر اِدکلے! توبہ! تو کیا وہ بوڑھا تمہیں پھر تنگ کرتا رہا ہے؟"

"تنگ؟ اس سے تمہارا مطلب؟

تمہارے ساتھ باتیں کرنا۔ گھٹنوں کے بل تمہارے سامنے جھکنا اور ایک احمق کا پارٹ ادا کرتا رہا ہے! مجھے یقین ہے اس ناچ میں ضرور کچھ ہوا ہو گا۔ آہ! میں بُری سے بُری بات بھی سننے کو تیار ہوں!"

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ تم مجھے ملامت کرو گے!" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"بتاؤ خدارا جلد بتاؤ۔ اُس نے تم سے کیا کچھ کہا؟"

"بخدا۔ ٹم! میں بیوقوف ہوں۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ وہ ــــ بیچارا رونے لگا تھا!"

"بیچارا احمق! نہیں وہ اکیلا نہیں! شاید تم دونوں ہی! کیا تمہیں تو رونا نہ آیا تھا؟"

"یونہی تھوڑا سا!" اُس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا خوب! تم دونوں محفلِ رقص میں بیٹھے رویا کئے! بچوں کی طرح! خداوندا! مجھے حیرت ہے کہ تم دونوں میں سے بڑا احمق کون ہے!" ــــ اس نے کامل سنجیدگی سے اُس کے قریب ہو کر کہا ــــ لیکن سچ بتاؤ۔ تم نے اسے کوئی وعدہ بھی کیا تھا؟"

وہ کوئی خاص پختہ وعدہ تو نہ تھا! میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یوں ہونا چاہیئے تو ہونا چاہیئے!"

وہ کوئی خاص پختہ وعدہ تو نہ تھا۔ یوں ہونا چاہیئے تو ہونا چاہیئے"۔ ــــــ وہ سراسیمہ و مضطرب تھا۔

میرے خیال میں اگر تم دونوں کو شادی کا لائسنس مل جائے اور اگر پادری تمہیں میاں بیوی لکھ کر پکارے تو تم محسوس کروگے کہ تم پورے طور پر میاں بیوی نہیں ہو! اچھا تو تمہاری نسبت ہنری اوکلے سے ہو چکی ہے؟

اُس کے گلابی رُخساروں کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اُس نے پھولی ہوئی سانس میں کہا "نہیں!"

"ضرور ہو چکی ہے! کیا اُس نے تمہارے نازک لبوں پر پیار نہیں کیا؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حواس قائم نہیں ــــــ "نہیں تو! اُس نے میرے لبوں کو نہیں چوما! اُس کی اتنی جرأت نہ تھی!"

وہ ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگا۔ پھر اپنا سر اٹھا کر بلند مسرور قہقہوں سے ہنسنے لگا۔

"اُس کی اتنی جرأت نہ تھی! کتنی عجیب بات ہے! توبہ! توبہ! تو کیا یہ بغیر بوسوں کے ہونے والی شادی ہے؟"

"اُس نے تیزی سے جواب دیا ــــــ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی قابلِ مذاق بات تو نہیں! اس میں ہنسنے کی کونسی ضرورت ہے؟"

قابلِ مذاق تو ہے ہی! بلکہ نہایت ہی دلچسپ! شادی اور بغیر بوسوں کے! تم نہیں جانتی کہ تم کیا کر رہی ہو! اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کر رہی ہو جس کی بیوی مر چکی ہے۔ اور اس کا ایک بچہ ہے! اور میرا خیال ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کے بچے کی نگہداشت کے قابل بھی سمجھتی ہو!؟"

وہ اب سچ مچ بہت عاجز اور بیکس معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے افسردگی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے اندوہگیں آواز میں کہا ــــــ "ٹم! میں جانتی تھی کہ تم مجھے ملامت کروگے!"

"تو پھر تم ایسی باتیں ہی کیوں کرتی ہو؟ اُس نے درشت لہجہ میں پوچھا۔

اس کا ہاتھ تھام کر اور اس کی طرف ملتجیانہ انداز سے دیکھ کر ——— "خدا کے لئے اٹھو! کیا تم سمجھنے کی کوشش نہ کروگے؟
——— آنسوؤں کی کثرت سے وہ دیکھ نہ سکتی تھی ——— اس کا برتاؤ میرے ساتھ کتنا اچھا رہا ہے! اس نے میرے ساتھ اس شہر کے سب لوگوں سے بڑھکر عمدہ سلوک کیا ہے"!

"اور کوئی تمہارے ساتھ لطف سے پیش آیا؟"

"مسٹر اوکلے کی طرح کوئی نہیں! تم خود جانتے ہو کہ تم بھی نہیں! اور سچ پوچھو تو تم نے میرے ساتھ کبھی عمدہ سلوک کیا ہی نہیں! تم مجھے ملامت کرتے ہو۔ مجھ پر ہنستے ہو۔ میرا مذاق اڑاتے ہو۔ مجھے طرح طرح کے ناموں سے بلاتے ہو" ———

"اور یہ بیچارا بوڑھا؟"

"اس کی آواز میں لرزش تھی ——— "اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت عمدہ رہا ہے۔ وہ مجھے کہیں باہر بھی لے گیا تو تنہا چھوڑ دیا۔ اور میرے لئے چیزیں خرید کر لایا۔ اور جب میں غصہ کی حالت میں ہوں یا بیمار تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے! وہ مجھے کبھی ناراض نہیں کرتا ———"

"کیا تم مرنے کے بغیر اس کے ساتھ صرف آدھ گھنٹہ بھی بات چیت کر سکتی ہو؟"

"بالکل نہیں! ابھی تو میں اسے تھیئٹر جانے پر رضامند کر لیتی ہوں تا کہ اس کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہ ملے"! اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"اور پھر تمہارا اس کے ساتھ شادی کا خیال"؟

"میں اس کے ساتھ محض گفتگو کے لئے شادی نہیں کر رہی"!

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم اس سے اس لئے شادی کر رہی ہو کہ وہ تمہاری دیکھ بھال کر سکے! وہ تمہیں تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ واہ وا! کتنا اچھا آدمی ہے تمہارے لئے! آدھا وقت تو وہ تمہارے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتا ہے اور آدھے وقت میں اس طرح کہ گویا تم ملکۂ حسن ہو! اور تم اسے پسند بھی کرتی ہو! لیکن وہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہیں کرتا۔ جو عورتوں کے لائق ہے!

"کیا تمہیں اپنے انتخاب پر شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

"اس نے مانتے ہوئے کہا ——— "ہاں تھوڑی سی! لیکن تمہیں اس کے متعلق اس قدر رذیل رویہ اختیار نہ کرنا چاہیئے اور نہ میں اتنی بری ہوں۔ جتنا تمہارا خیال ہے"!

"نہیں بلکہ بدترین تمہارا دل ریشم کی طرح نرم ہے مگر میرے لئے نہیں! میرا خیال ہے کہ اگر میں بھی ایک کمزور۔ کا بننا۔

لرزتا ہوا بوڑھا ہوتا۔ اتنا بوڑھا کہ گوشت کھانے سے بھی لاچار ہوتا۔ تو تم مجھ پر بھی رحم کھالیتیں اور میرے ساتھ محض میری التجائے سوال کی بنا پر شادی کر لیتیں!"

"نہیں۔ تمہارے ساتھ تو کبھی نہیں! کیونکہ میں تمہیں بخوبی جانتی ہوں! اور نیز ۴۴ برس کا انسان کچھ اتنا کانپتا ہوا بوڑھا بھی نہیں ہو سکتا!"

"اُس کی حالت پر اس قدر رحم دلی کا اظہار مت کرو!"

"اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری تھے ——— "آہ! کروں کیوں نہیں؟ بیچارہ! تم کیا جانو کہ وہ کس قدر تنہا ہے! اور اُداس! کیونکہ کوئی اُس سے محبت کرنے والا نہیں! اور اُس کے "بچے" کا محافظ! جب وہ یہ ذکر کرتا ہے تو میرا دل بھر آتا ہے۔

"تمہاری شادی کے بعد تو اس کا بچہ اتنا بھولا بسرا نہ رہے گا! بخدا! میں اب بھی تمہیں بچے کی نگہداشت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں!"

"تو ہم ایک ملازمہ رکھ سکتے ہیں!" اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"او ہو! ہم! مگر تم جانتی نہیں ہو کہ وہ خود غرض شخص ہے!"

"خود غرض! نہیں ہرگز نہیں! میں بخوبی جانتی ہوں!"

"وہ ہے! وہ چاہتا ہے کہ کوئی اُس سے محبت کرے۔ وہ ایک دوشیزہ کی حیات کو تباہ کرنا چاہتا ہے! تا کہ وہ آرام اور چین دیکھ سکے! لیکن تمہیں اس شادی سے کیا حاصل ہوگا؟"

اُس نے عاجزانہ انداز سے کہا ——— "میں پہلے ہی جانتی تھی"

"تم کیا جانتی تھیں؟"

"کہ تم مجھے ملامت کرو گے!"

وہ بے بس اور لاچار ہو کر پیچھے کو جُھک گیا۔ اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"وِک! سُنو۔ ——— اُس نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا ——— اب سچ مچ تم سے میں ایک بات پوچھوں گا اور پھر تمہیں کبھی تنگ نہ کروں گا!"

"تنگ نہ کرو گے؟ تو اور تم کیا کرو گے؟" اُس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"گھر جا کر آرام کروں گا؟"

"اور تم مجھ سے آیندہ کبھی نہ ملو گے؟"

"کیا تم خود نہیں جانتیں کہ یہ ناممکن ہے!"

"نہیں میرے خیال میں ناممکن نہیں!"

"لیکن پھر تو تم اپنے دلی راز اُسے بھی بتا سکو گی!"

"نہیں! میں ضرور نہیں ہی بتاؤں گی!"

"اپنی شادی کے بعد بھی؟"

"تو اور کیا نہیں!" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ———!

"وک! تم ——— تم ہو ——— بتا دُوں کیا ہو تم؟ یا اللہ!"!"

"تم! تمہارا یہ مطلب ہرگز نہیں! تمہیں اس طرح گفتگو نہ کرنی چاہیئے! میں اسے برداشت نہیں کر سکتی! اگر مجھے یقین ہو گیا تو تمہیں آیندہ کبھی نہ دیکھوں گی!"

"اچھا تو ہم یہ ذکر نہ کریں گے! مگر خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ کیا تمہیں اُس سے محبت ہے یا نہیں؟"

"نہیں مجھے اُس سے محبت نہیں!"

"اور پھر بھی تم اُس سے شادی کر لو گی؟"

"لیکن تم! تمہیں معلوم ہے کہ میری فطرت بھی تم جیسی ہی ہے! میں محبت کر ہی نہیں سکتی! اس نے نہایت عمدگی سے جواب دیا!"

"وہ کیوں"

"ہم آرٹسٹ اصل میں محبت کر ہی نہیں سکتے! ہم محض تخیل کی مدد سے خوبصورت چیزیں پیدا کرتے ہیں اور اُن سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اُن چیزوں میں بقا اور اصلیت نہیں ہوتی!"

"کیا سچ مچ"

"کیونکہ ہم صرف اپنی ذات سے محبت کر سکتے ہیں!"

"ہاں! اس میں کچھ اصلیت ہے! ہم نرگس کی طرح ہیں!"

"وہ کون تھا؟"

"وہ ایک یونانی جوان تھا جس نے ندی کے پانی میں اپنا عکس دیکھا اور اس سے محبت کرنے لگا۔ اور بالآخر ندی ہی میں

گر پڑا۔ اس میں سے ایک پھول اُگا اور وہ پھول آرٹ تھا! ——— اچھا تو تم کبھی محبت کر ہی نہیں سکتیں"؟

"کتنی اچھی کہانی ہے! نہایت خوبصورت! پیارے نرگس!"

"نہایت! محبوبہ نرگس!"

"کتنے کمینے ہو تم!" اُس نے نرم شیریں قہقہہ لگا کر کہا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ———

"تو تمہارے خیال میں میں محبت نہیں کر سکتا؟" اس کی آواز میں لہریں نغمہ ریز تھیں۔

ہاں تم محبت کرنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ تم اپنے کام سے محبت رکھتے ہو اور بس ——— وہ معنی خیز انداز سے شرارت کے طور پر ہنسنے لگی ——— لیکن تم مجھے اپنا مقابل پاؤ گے۔ میں بعینہٖ وہی ہوں جو تم ہو!"

"شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات اس قدر خوشگوار ہیں"!

"خوشگوار! ہم پانچ منٹ بھی گفتگو کریں تو ناممکن کہ آپس میں لڑ جھگڑ نہ لیں!"

"وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی روشنی چمک رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک چھیڑنے کا انداز رقصاں تھا!

"بخدا! تم سحر کار حسینہ ہو۔ خوبصورت جادوگرنی!" اس نے حیرت سے ملی ہوئی آہستہ آواز میں کہا وہ چونک پڑی اور قدرے سراسیمہ ہو گئی ——— "تم! کیا کل رات میں حسین معلوم نہ ہوتی تھی؟"

دفعتہً اُس نے اُس کی طرف مڑ کر دیکھا ——— "حسین؟ اور تم؟ اس قدر غیر دلچسپ اور بے کیف چہرے کے ساتھ؟"

"اونہہ۔ سچ مچ بناؤ نا!"

"تم معلوم ہوتی ہو ——— کریہہ صورت!"

"اُس نے بسورتے ہوئے غمگین آواز میں پوچھا ——— "کیا مطلب ہے تمہارا اس سے؟"

"مطلب؟ یہی کہ اگر تم حسین ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھتا! مرد کسی حسین عورت سے خوش اخلاقی نہیں برت سکتا۔ وہ ہر وقت مغرور رہتی ہے اُس پر حکومت کرتی ہے اور اُسے غلام بنا لیتی ہے۔ لیکن معمولی شکل و صورت کی عورت ———"

"وہ کیا کرتی ہے"؟

اُسے اگر کسی مرد کا خیال ہو تو وہ اُس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے عمدہ سلوک روا رکھتی ہے۔ اور وہ اُس سے گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ جس طرح میں اب تمہارے ساتھ گفتگو کر رہا ہوں۔ بس اسی طرح وک"!

کیا میں سچ مچ اتنی بدشکل صورت ہوں؟ بیشک میں اتنی خوبصورت نہیں ——"

"اور وہ عورت ہو بھی کیسے سکتی ہے جس کی ناک گولائی لئے ہوئے ابھری ہوئی ہو۔"

"گولائی لئے ابھری ہوئی؟" اس نے ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے غمزدہ آواز میں کہا۔

"تو اور کیا؟ اس کا سرا عین چینی کی شکل میں پھیلا ہوا ہو!"

اُس نے جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے کہا —— "میں ہمیشہ سمجھتی رہی ہوں کہ میری ناک ٹھیک نہیں ہے لیکن اب تم نے یہ جتلا کر مجھے کامل طور پر افسردہ خاطر اور اندوہگین بنا دیا ہے! میرا دل بے طرح رونے کو چاہتا ہے! وحشی! درندے! —— اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو اکٹھے ہو رہے تھے!

"لیکن تم اپنے آپ کو وہی کیوں نہیں سمجھتی ہو جو تم حقیقت میں ہو؟ تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ تم ایک ایسی چیز بن جاؤ جو تم دراصل نہیں ہو؟"

"لیکن متحرک تصاویر میں اور اپنے شہر میں ——"

"بیہودہ! تم ان لوگوں پر یقین رکھتی ہوا کور ذوق - بد مذاق اور بس!"

"تم!" وہ خاموش تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی - وہ اپنے ظالمانہ تبسم کو چھپانے کے لئے دوسری طرف دیکھنے لگا —— "بہر حال" —— اُس نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا۔

"کیا؟"

"بہرحال مسٹر اوکلے تو مجھے خوبصورت خیال کرتا ہے!" اُس نے ایک سسکی کو روکتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اوکلے! وہ لڑکھڑاتا ہوا بوڑھا!" اور قہقہوں پر قہقہے لگانے لگا۔

"وہ اتنا لڑکھڑاتا تو نہیں!"

"وہ پژمردہ ہے مرجھایا ہوا!"

"نہیں وہ ایسا نہیں! تاہم وہ تمہاری طرح کسی کی توہین تو نہیں کرتا!"

"آہ! کیا میں نے تمہارے ننھے منھے دل کو تکلیف پہنچائی ہے؟" —— اس نے ماں کے بچے کو چمکارنے اور پیار کرنے کے انداز میں کہا اور اس کے ہاتھ ننھے سے نازک ہاتھ پر پیار کرنے لگا ——"

"کیا میں اتنا شریر تھا! کیا میں نے اس چھوٹی سی گڑیا کو بُری باتیں کہہ دیں! اور آہ! کیا اس کا نازک شیشہ دل ٹوٹ گیا!"

"بیشک ٹوٹ گیا؟" اُس نے اداس لہجہ میں کہا۔

"کتنا بُرا شخص ہوں میں! آہ! چھوٹا سا، ننھا سا ٹوٹا ہوا دل! اور مسٹر اوکلے! وہ کتنا اچھا ہے! ننھی سی لڑکی کو کوئی بُری بات نہیں کہتا! اچھا مسٹر اوکلے!"

وک نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کاش اگر ـــــــ"

"کیا ہوتا؟"

"اس وقت کوئی شیشہ ہوتا تو میں دیکھتی کہ تم سچ کہتے ہو یا جھوٹ!"

"تو کیا تم بدصورت نہیں ہو؟"

"نہیں میں اپنے آپ کو ایسا بدصورت نہیں سمجھتی؟"

"نہایں بلکہ بہت بدصورت!"

"اب میں جانتی ہوں!"

"کیا جانتی ہو؟"

"کہ تمہارے خیال میں وہ بھورے بالوں والی لڑکی حسین ہے!"

"بیشک وہ حسین ہے! ہر کوئی دیکھ سکتا ہے! اس کا سفید بلورین جسم اور اس میں ہلکی ہلکی سرخی جھلکتی ہوئی ـــــــ"

"یہ صنوعی رنگوں کی سرخی! یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے!"

"قدرتی ہلکا سرخ رنگ! وہ گہری نیلی آنکھیں! صفائی اور نفاست سے چپاں! شیشے کی طرح چمکدار! اور وہ خوبصورت سنہری بال ـــــــ"

"سنہری! سنہری؟ تم انہیں سنہری کہتے ہو؟ اور تم اپنے آپ کو آرٹسٹ سمجھتے ہو! حالانکہ وہ نہایت بدنما زرد رنگ کے ہیں!"

"پکی ہوئی فصل کی طرح سنہری"

"تب تو تم نے عمر بھر پکی ہوئی فصل ہی نہیں دیکھی!"

"لیکن میں نے اس کے بال دیکھے ہیں!"

"اچھا! اگر تمہارا یہی مذاق ہے تو مبارک ہو! حالانکہ میں ہمیشہ تمہیں اعلیٰ مذاق کا آدمی خیال کرتی رہی ہوں اور تمہیں ایک حقیقی آرٹسٹ!"

"اور میں ہمیشہ تمہیں اعلیٰ مذاق کی عورت خیال کرتا اور حقیقی معنوں میں عورت سمجھتا رہا ہوں!"

"ہاں! بدصورت عورت!"

"نہیں میں اب سنجیدہ بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک حقیقی عورت سمجھتا رہا ہوں! اور وہ نہیں جو تم ظاہر کرنا چاہتی ہو!"

تمہیں کیا ظاہر کرنا چاہتی ہوں"۔

"احمق!"

"اس لفظ کو واپس لے لو!"

"جب تم اپنی حماقت کو واپس لے لوگی!"

"نہیں نہیں۔ تمہیں اس لفظ کو ضرور واپس لینا ہوگا!"

"ڈِک۔ لو سنو! اگر تم مسٹر او کلے سے شادی کرلو تو یہ اس لئے ہوگا کہ وہ تمہاری دیکھ بھال کر سکے! وہ صرف تمہاری ایک کمزوری کیلئے دلچسپی کا سامان مہیا کرے گا! یعنی تمہاری نفیس اور عمدہ چیزوں کی محبت کیلئے! آرام۔ لذیذ کھانے تعیش اور تھیٹر کی مسرور زندگی کے لئے!"

تو پھر کیا ہوا؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں اچھی ایکٹرس ہرگز نہ بن سکوں گی! میں تو صرف اس شہر میں رہنے کیلئے ایسا کر رہی ہوں کیونکہ میں گھر جانا نہیں چاہتی! میرے لئے کوئی مفید راہ عمل نہیں! اور یہ بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں محبت کر رہی نہیں سکتی! کیونکہ دو دفعہ میری منگنی ہوئی اور دونوں دفعہ ٹوٹی بھی ضرور! اور اب میں مسٹر او کلے کو پسند کرتی ہوں ـــ بس اس معاملے میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں!"

"اچھا اگر یہ بات ہے تو جاؤ اس سے شادی کرلو! میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بخدا! اب یہ کس لئے؟"

"آہ! ڈِک! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!"

"اور وہ کس لئے؟"

"میں جانتی تھی تم مجھے ملامت کروگے!"

"اور ملامت کیوں نہ کروں؟"

"اس نے سر جھکا کر کہا ـــــــ "لیکن تمہیں بھی تو مجھے بدصورت نہ کہنا چاہیئے تھا اور نہ ـــــــ

"کیا؟"

اُس بھورے بالوں والی لڑکی کو خوبصورت! اور نیز ———

"اور نیز کیا؟"

"آہ! کچھ بھی نہیں! آہ! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!" اور وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ وہ پیچھے کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اور بغور اسکی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ آہستہ ہنسی نے گونج کی شکل اختیار کر لی! وہ پھر اک گرج معلوم ہونے لگی ——— وہ آنسوؤں کی چلمن میں سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی۔

"آخر اس میں مذاق کا کونسا پہلو ہے؟ بس تو میں جاتی ہوں! مجھے جانے دو۔ اُس سے شادی کرنے دو۔ اور خبردار پھر میرا خیال مت کرنا!"

"تو کیا تم وہی احمق لڑکی ہو جسے محبت کرنا نہیں آتا؟"

"کیا کہا؟"

"احمق! بیوقوف! نادان! لڑکی!"

"ہُم!"

"اب کیسے ہے احمق لڑکی؟ کیا تم نہیں جانتی؟" اُس نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا نہیں جانتی؟"

"کہ تمہارا رُواں رُواں محبت کے گیت گا رہا ہے!"

"مسٹر اوکلے کی محبت کے؟"

"نہیں میری محبت کے ہُم کی محبت کے!" ——— وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ متغیر تھا۔

"لیکن میرا خیال تھا کہ ہم محبت کر ہی نہیں سکتے! کیونکہ ہم آرٹسٹ ہیں! تم نے خود بھی یہی کہا تھا!"

"تو تب ہم آرٹسٹ نہیں ہیں!"

"مگر نہیں میں تو تمہارے ساتھ محبت نہیں کروں گی!" ——— اُس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکامیاب کوشش کی ——— دوسری بیوقوف عورتیں ایسا کرتی ہیں تو تم اُن پر ہنستے ہو!"

"ہاں اُن پر ہی لیکن مسٹر اوکلے پر نہیں ہنسوں گا۔ میں اُسے راستے میں پکڑ لوں گا۔ اُسے زمین پر پٹخ دوں گا۔ میں اسے قتل کر دوں گا!"

"آہ! ہُم!" ——— وہ نزدیک سرک گیا اور دونوں کی نگاہیں ایک ہو گئیں ———

"آہ وِک!"

آہستہ آہستہ اس کے رخساروں میں ہلکی سرخی جھلکنے لگی۔ اسکی آنکھیں وفورِ مسرت سے روشن ہوکر چمکنے لگیں۔ اور اس کی رُوح کی سر بند کلی اس کے حسین چہرے پر گلاب کے خوشگفتہ پھول کی مانند کھل کر بہار دکھانے لگی!

"آہ! ہم بھی کتنے احمق ہیں!" لڑکی نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

اور پھر دونوں کے لب باہم پیوست ہوگئے!!!

سحر نغمہ ریز تھی! درختوں پر پرندے جمع ہو رہے تھے۔ روشنی ان کے اردگرد کھیل رہی تھی! در سچ مچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے کا سارا شہر بیدار ہوکر مکانوں کی چھتوں پر آگیا ہے۔ کہ تازہ نکلتے ہوئے سورج کو خوش آمدید کا گیت سنا سکے۔

لڑکی نے دنیا کی طرف خوشی سے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور مسکرانے لگی!

"ہم یہاں طلوعِ خورشید دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے اور دیکھو۔ دیکھو سورج آسمان پر کافی بلند ہوچکا ہے!"

اس نے اُسے اپنے پہلو میں کھینچ لیا!

"میں نے اگرچہ طلوعِ خورشید کو بھی دیکھا ہے لیکن میں تو تمہارے چہرے کو دیکھنے میں مصروف تھا!"

اُس نے محبت بھری نغمہ ساز آواز میں کہا۔

اک جلد گذر جانے والا سایہ اک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ پر سے گذرتا ہوا معلوم ہوا۔

"ایک بدصورت چہرہ ٹم!" اس نے خاموشی میں کہا۔

"نہیں ہیلن کے چہرے جیسا حسین!"

سایہ فی الفور گذر گیا۔ اُس کی روح کے گوشہ گوشہ میں بہار نغمہ زن تھی۔ اور لطیف تاثرات نے اس کے رخساروں کو رنگین بنا دیا۔ سورج اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ اور اس کے بھلے بڑے کو منور کر رہا تھا۔ اس نے ایک قابلِ محبت لطیف اشارہ سے اپنی دو انگلیاں اپنے مُنہ تک اٹھائیں۔ اور اپنا سر تھوڑا سا جھکا کر اُسے پیار کا پیغام دیا!

"اب اس کے بعد ——— اس کے بعد لگاتے ہوئے) میں نہیں کُوری کہا کروں گی!"

"وہ کیوں بھولی لڑکی؟"

کیونکہ یہ وک (Vic) کے بعد ٹم (tim) سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے! یعنی (Victim) بمعنی فتح۔

ترجمہ (محمد نواز خاں)

*

محفلِ اَدب

خودکشی کرنے والے شاعر کی وصیّت

ٹامس چٹیرٹن ۱۷۵۲ء میں انگلستان کے شہر برسٹل میں پیدا ہُوا۔ وہ فطری شاعر تھا اور کم سنی ہی میں علوم وفن کے ساتھ شاعری میں کامل ہو گیا۔ علم و ادب کی خدمت کا زبردست جذبہ رکھتا تھا۔ اسی غرض سے لندن پہنچا۔ مگر ابنائے زمانہ نے قدر نہ کی اور فاقے کرنے لگا۔ آخر تنگ آ کر ۱۷۷۰ء میں زہر کھا کر جان دیدی۔ مگر مرنے سے پہلے ایک نظم لکھ گیا جو نہایت مشہور ہوئی۔ کیونکہ بہترین ہجو نامہ ہے۔ اُس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمہید

میں شہر برسٹل کا ٹامس چٹیرٹن ہوں یہ میری آخری وصیّت ہے جسے اس حال میں لکھ رہا ہوں کہ میرا جسم تندرست اور عقل درست ہے۔ میرے جسم کی تندرستی اُس ڈاکٹر کی غلطی کا نتیجہ ہے جس نے آخری بیماری میں میرا علاج کیا تھا۔ رہ گئی میری عقل تو اُس کا معاملہ میں عدالت کے سپرد کرتا ہوں مگر اتنا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ برسٹل کے تمام بزرگانِ دین اور اکابر مجھے "باکمال مجنوں" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر میرے اس آخری عمل (خودکشی) کو بھی جنون قرار دے دیا گیا تو بزرگوں کے بخشے ہوئے خطاب کے عین مطابق ہو گا۔

(۱)

کل رات آٹھ بجے سے پہلے میں مر چکا ہوں گا۔ اگر عدالت کا فیصلہ یہ ٹھہرے کہ میں نے حالتِ جنون میں جان دی ہے تو برسٹل کے پادری صاحب کے نام میری وصیت یہ ہے کہ اپنے خرچ سے میری لاش برسٹل لیجائیں اور میرے خاندانی مقبرے میں مجھے دفن کریں میری قبر پکی بنائیں اور تعویذ پر یہ کتبہ لگائیں۔

"اے وہ جو اس قبر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ذرا ٹھہر اور چٹیرٹن کے لئے دعا کرتا جا۔

اے لوگو چٹیرٹن کی روح کیلئے دعا مانگو اور مناجات کرو۔ خدا آسمان پر اُس سے وہ برتاؤ نہ کرے جو خدا کے بندوں نے زمین پر اس سے کیا!

"یہاں وہ سو رہا ہے جس کے باپ نے شہر کا کلیسا بنایا تھا اور جس کے بزرگ ۱۱۴۲ء سے سنٹ میری کے کلیسا میں دفن ہوتے آئے ہیں!

"او قبر کو دیکھنے والے اپنے فیصلہ میں جلدی نہ کر۔ اللہ کا فیصلہ تیرے فیصلے سے زیادہ منصفانہ ہے۔ قبر میں سونے والا اللہ کے سامنے حاضر ہے اور تیرے فیصلے سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

لیکن اگر میری توقع کے بموجب برسٹل کے پادری صاحب اپنے آپ کو خسیس ثابت کریں اور میری لاش لے جانے سے انکار کردیں تو کارِ خیر انجام دینے والی کوئی انجمن مجھے مذکورہ بالا قبرستان میں دفن کرکے کسی طرح کی قبر بنا دے اور اسی طرح کا کتبہ لگا دے۔

لیکن اگر میری توقع کے خلاف پادری صاحب میری وصیت پر عمل کریں تو میرے دوسرے درجہ کے اشعار کا دیوان مرتب کرکے انہیں ہدیہ کردیا جائے اور دیوان کی جلد پر عبارت لکھی جائے "برسٹل کے محترم پادری صاحب کے حضور شاعر کا حقیر ہدیہ بکمال خشوع خضوع کے ساتھ!"

(۲)

میں اپنی جوانی کی تمام قوت و حرارت برسٹل کے نقدس مآب لاٹ پادری صاحب کیلئے چھوڑتا ہوں کہ انہیں جوانی کی اس قوت و حرارت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

(۳)

اپنا تقویٰ، طہارت، نیکی نقدس مآب نائب لاٹ پادری صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں اور اپنی شرم و حیا کا آدھا حصہ اپنی کتابوں کے پبلشر مسٹر بروڈم کے لئے اور باقی نصف ہر اس خاتون کے لئے چھوڑتا ہوں جسے خدا نے اس نعمت سے محروم پیدا کیا ہے۔

(۴)

اپنے ایثار و قربانی کا وارث میں اپنے محبوب وطن شہر برسٹل کو قرار دیتا ہوں جس کے بازاروں میں ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ جنس گراں کبھی پہنچی ہی نہیں!

(۵)

میں اپنی ایمانداری کلیسا کے خزانچی صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اور اُنکے خدمتگار کو یہ حق بخشتا ہوں کہ جب جب وہ آنکھیں اُن کی مقدس کھوپری پر زور سے چپت رسید کرکے انہیں بیدار کردیا کرے۔

(۶)

میں اپنی قوتِ گویائی کلیسا کے واعظ صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ جنت و دوزخ کے افسانے سنانے کے بجائے مومنوں کو مفید باتیں سنایا کریں!

(۷)

اور اپنی عقل و دانش کلیسا کے امام کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ کتابِ مقدس کی جب تفسیر کریں تو سمجھ سے کام لیا کریں اور کھوکھلی باتیں بکنے سے بچ جائیں! اسے کاش اس بے مغز پادری کو معلوم ہو جائے کہ مجھے اُس سے کتنی نفرت ہے۔

(۸)

میں اپنی انصاف پسندی ملک کے حاکموں کیلئے چھوڑتا ہوں۔ اپنی سیر چشمی و بردباری شہر برسٹل کے کوتوال کیلئے اور اپنی قناعت و شرافت پولیس افسروں کے لئے کہ ان سب معزز حضرات کو ان تمام چیزوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

(۹)

شہر برسٹل کی تمام حسینوں کیلئے اپنے جملہ عشقیہ مضامین اور خطوط چھوڑے جاتا ہوں۔ وہ یقین کریں کہ ان مضامین اور خطوط